مغل دربار کی گروہ بندیاں

اور

اُن کی سیاست

مغل دربار کی گروہ بندیاں
اور
اُن کی سیاست

(1707 - 1740)

مصنّفہ

ڈاکٹر ستیش چندر

مترجم

محمد قاسم صدیقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک-1، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

Mughal Darbar Ke Grohbandiyan
Aur Unki Siyasat

By :Dr. Satish Chander

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1987

دوسرا اڈیشن : 2001 تعداد 1100

قیمت : =/72

سلسلہ مطبوعات : 549

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہوگئے۔ جو کچھ نہ لکھا جاسکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہن انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین

1	تعارف	9
2	قرون وسطیٰ میں ہندوستانی سماج کے بااثر طبقات	11
3	(۲الف) زمیندار	
4	حاشیہ تعارف	19
5	باب اوّل	20
6	دربار میں جماعتی کشمکش کا آغاز	
7	دربار میں سیاسی جماعتیں	
8	خانہ جنگی	27
9	حاشیہ باب اوّل	30
10	باب دوم : مفاہمت یا جبر	38
11	بہادر شاہ	
12	راجپوتوں کا مسئلہ	44
13	دکن کا مسئلہ	45
14	سکھوں کی بغاوت	60
15	منعم خاں کی وفات اور وزارت کے لیے کشمکش کا آغاز	63
16	طرز حکومت اور انتظام سلطنت	65
17	باب سوم	70
18	عہدۂ وزارت کے لیے ذوالفقار خاں کی جدوجہد	
19	وزارت کا مسئلہ	
20	ذوالفقار خاں اور تینوں شاہزادوں کا وفاق	73
21	ذوالفقار خاں بطور وزیر اعظم، اس کے اختیارات اور اس کا پیغام	76

22	ذوالفقار خاں کا طرز سیاست اور انتظام	79
23	جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں کی شکست اور ان کا زوال	87
24	حاشیہ باب سوم	91
25	**باب چہارم**	100
26	سید برادران کی نئی وزارت کے لیے جدوجہد	
27	سید برادران کے اختیارات اور ان کی عام پالیسی	104
28	**باب پنجم**	115
29	نئی وزارت کے لیے کشمکش	
30	فرخ سیر کی تخت سے برطرفی	119
31	سید و مرہٹا معاہدہ	125
32	**باب ششم**	133
33	سید برادران اور نئی وزارت	
34	سید برادران کے خلاف بغاوتوں کا آغاز	135
35	سید برادران کے سیاسی مسائل	137
36	نظام الملک کی بغاوت اور سید برادران کا زوال	143
37	**باب ہفتم**	154
38	نظام الملک اور وزارت کی کشمکش کا خاتمہ	
39	نظام الملک کی آمد اور اس کی ابتدائی دشواریاں	155
40	نظام الملک کا اصلاحات کا منصوبہ اور دکن کے لیے اس کی روانگی	159
41	جاٹوں اور راجپوتوں کے معاملات	163
42	حاشیہ باب ہفتم	171
43	**باب ہشتم**	175
44	مرہٹوں کی شمالی ہند کی طرف پیش قدمی	
45	نظام الملک اور مرہٹے	183
46	مالوہ اور گجرات پر مرہٹوں کی پیش قدمی	186

47	شمالی ہندوستان کا ردعمل	199
48	باب نہم	204
49	مالوہ اور بندیل کھنڈ کی فتح	
50	دربار میں امن پسند اور جنگ پسند گروہ	208
51	1736ء میں قیام امن کے لیے بات چیت	211
52	دوآب پر مرہٹوں کے حملے	214
53	بھوپال کی جنگ	216
54	مالوہ اور بندیل کھنڈ کی مکمل سپردگی	221
55	ضمیمہ الف	223
56	ضمیمہ ب	225
57	ضمیمہ ج	226
58	باب نہم حاشیے	228
59	باب دھم	237
60	مغل سیاست اور نادر شاہ	
61	1228-1237 کے درمیان سیاست اور گروہ بندیاں	239
62	مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب	243
63	اختتامیہ تصریحات	251

تعارف

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغل سلطنت جس نے ڈیڑھ سو برس تک ملک کو ایک مستحکم نظام دیا، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کے وسائل بہم پہنچائے وہ خود زوال پذیر اور اندرونی خلفشار سے دوچار تھی۔ ملک پر تسلط حاصل کرنے کی مرہٹوں کی کوشش ناکام ہو چکی تھی اور برطانیہ کے تاجر اس برصغیر میں ایک نئی قسم کی حکومت کی بنیادیں استوار کر رہے تھے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس تبدیلی کے پیچھے جو سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل ہندوستان، ایشیا اور مغربی دنیا میں کارفرما تھے ان کا تفصیلی تجزیہ اور مطالعہ اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ جب تک کہ ان عوامل اور اس صورت حال کا باقاعدہ اور سنجیدہ مطالعہ نہ کیا جائے صحیح طور پر اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ سلطنت مغلیہ کا انتشار، مرہٹوں کی ایک منظم حکومت قایم کرنے میں ناکامی اور ایک نئے سماج کی تشکیل کے اسباب و عوامل کیا تھے؟

شاہان مغلیہ نے امرائے حکومت کی جو تنظیم قایم کی تھی وہ بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ امور انتظامیہ کی صحیح طور پر انجام دہی، سماجی اقتدار کی استواری، حکومت کی فوجی اور سیاسی ذمہ داریوں کا سرانجام اور حقیقت میں خود حکومت کے استحکام اور تنظیم کا انحصار امرا کی تنظیم کی کارفرمائی پر منحصر تھا۔ قرون وسطیٰ کے مورخ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اس دور میں سلطنت مغلیہ کے اقتدار، استحکام، اندرونی تنظیم اور امرا کی تنظیم کی امور سلطنت پر گرفت کا گہرا اور سنجیدہ مطالعہ کرے) زیر مطالعہ کتاب میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ اورنگ زیب کی وفات اور نادر شاہ کے حملہ کے درمیانی وقفہ میں امرا کا امور سلطنت کے سلسلہ میں کیا طرز عمل رہا۔ اور اس تنظیم میں علاقائی اور مذہبی بنیادوں پر جو فرقہ بندی ہوئی اس کا دربار کی پالیسی پر کیا اثر ہوا اور

اس تنظیم کے مختلف فرقے سلطنت کے اندرونی معاملات میں منسلک اور جاٹوں اور مرہٹوں کی بعض پالیسی پر کس طرح اثرانداز ہوا اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

نادر شاہ کے حملہ کے بعد حکومت پر امرا کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تھی اور چھوٹے چھوٹے علاقوں کے آزاد حکمراں اور مرہٹہ سرداروں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ نادر شاہ کے حملہ اور پانی پت کی تیسری لڑائی 1761ء کے درمیانی وقفہ میں نئے سیاسی مسائل سامنے نہیں آئے۔ سلطنت مغلیہ کے قلب کی طرف مرہٹوں کی پیش رفت، شمالی دمغرب، میں افغانوں کی فوج کشی دوبار میں طاقت ور امرا، کا مرکزی حکومت پر مکمل تسلّط یہ سب، واقعات حقیقت میں قدیم زمانہ کے مسائل کا اعادہ ہیں۔ مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر اور ضخیم ماخذ ضروری اور اہم امور کی فراہمی اس زمانہ کے پیچیدہ مسائل کا تجزیہ ایک کتاب میں مجتمع کرنے کی دشواری کے پیش نظر اس مقالہ کو نادر شاہ کے حملہ (1739) پر ختم کر دیا گیا ہے۔

مغل امرا کی تنظیم ایک ایسے طویل تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے جو اسلام کے زیر سایہ مغربی ایشیا میں سیاسی اور اقتصادی ترقی کی شکل میں رونما ہوا۔ ہندوستان کے مخصوص سماجی اور اقتصادی حالات جن کے لیے ایک طاقت ور سیاسی حکومت کی ضرورت تھی، ہندوستان میں ترکی سلاطین کے تجربات ترک اور منگول روایات جو مغل حکمراں اپنے ساتھ لائے اور اکبر کی سیاسی بصیرت اور اس کے دورِ حکومت کے مخصوص حالات اس مقالہ میں یہ ممکن نہیں کہ اس تاریخی ارتقا کو مجمل طور پر بھی بیان کیا جا سکے۔ سولہویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے آغاز میں امرا کی تنظیم نے مغل سلطنت کے قیام، توسیع اور استحکام کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس تنظیم کی کامیاب کارکردگی کی راہ میں بہت سی اقتصادی اور انتظامی رکاوٹیں رونما ہوئیں۔ بظاہر ان مسائل کا کوئی حل برآمد نہ ہو سکا اور سترہویں صدی کے آخر تک جاگیروں کے فقدان نے ایک سخت بحران پیدا کر دیا۔ بنیادی طور پر اس بحران کا سبب یہ تھا کہ زرعی اور صنعتی پیداوار اس قدر کم تھی کہ وہ حکمراں طبقہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کو خصوصیت کے ساتھ اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت صورتِ حال کافی بگڑ چکی تھی اور دکن کی لڑائیوں اور جاٹوں، مرہٹوں، راجپوتوں اور سکھوں سے معرکہ آرائیوں نے یہ صورتِ حال اور خراب کر دی اگرچہ اورنگ زیب نے سیاسی اور فوجی مسائل کو حل کرنے کے لیے بہت سی تدابیر اختیار کیں

لیکن اس کو پائندار کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور بالآخر وہ اپنے جانشینوں کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ چھوڑ گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد حکومت کے سامنے جو مسائل تھے ان کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر حکمراں طبقہ کے کردار، شاہ وقت سے ان کے تعلقات، ملک کے سماجی اور سیاسی افراد کے ساتھ ان کا رویہ، خود ان کا سماجی اور مذہبی نظریہ اور ان کے اندرونی اختلافات اور مسائل کا تجزیہ کیا جائے۔

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی سماج کے باثر طبقات

(الف) زمیندار

قرنِ وسطیٰ میں ہندوستانی سماج میں اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے جو فرقے اہمیت کے حامل تھے ان کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک راجہ، سردار اور موروثی زمیندار جن کو قدیم مورخوں نے رئیس اور ٹھاکر کہا ہے اور بعد کی فارسی تصنیفات میں ان کے لیے زمیندار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور دوسرا وہ طبقہ جس کو مال گزاری کی آمدنی دی گئی ان کو تھنہ دار یا جاگیردار کہا جاتا تھا۔ ان دونوں طبقات میں قدر مشترک یہ تھی کہ ان کا ذریعہ آمدنی کاشتکار کی پیداوار کی بچت تھی اگرچہ اس بچت کو حاصل کرنے کے ذرایع مختلف تھے۔

عملی طور پر زمینداروں کی حیثیت موروثی تھی اور ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو اپنی زمینداریوں پر ہندوستان میں ترکوں کے آنے سے قبل ہی سے متصرف تھے۔ ترک حکمرانوں نے اپنے اقتدار کے فوری استحکام کے لیے ان میں اکثر کو ان کی زمینداری پر بحال رکھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ یہ زمیندار ترک حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کرلیں اور اپنی زمینداریوں کا لگان کسی نہ کسی صورت میں ادا کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ ان کا یہ فرض بھی تھا کہ حکومت کی مختلف قسم کی خدمات مثلاً فوج کے لیے سپاہی وغیرہ مہیا کرنا۔ اور مقامی حکام کی ضرورت کے وقت مدد کرنا۔

باوجود اس کے کہ ترک اور مغل حکمرانوں کی یہ خواہش رہی کہ وہ زمینداروں سے مفاہمت کا رویہ اختیار کریں لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ کبھی بہ حسن و خوبی حل نہ ہوسکا۔ زمیندار ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ نئے حکمرانوں کی اندرونی اور بیرونی مشکلات یا مقامی اور مرکزی حکومت

کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر مال گزاری کی ادائیگی بند کردیں اور دوسروں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کرلیں[1]۔ ان میں سے بیشتر اپنی زمینداری کے کاشتکاروں پر ظلم کرکے زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ کاشتکار بنیادی طور پر زمیندار کے قبضہ میں تھے اور ان کو اس کے علاوہ موجودہ حصہ پیداوار کے بہت کچھ اور بھی دینا ہوتا تھا۔ زمینداروں کے علاقہ سے جو سوداگر گزرتے تھے ان کو بھی ٹیکس دینا پڑتا تھا اور اس طرح ان کے مال کی قیمت بڑھ جاتی تھی[2]۔

ترک اور مغل حکمرانوں نے خود اپنے مفاد کے پیش نظر ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ان کی سلطنت میں جان و مال محفوظ رہے۔ رائج الوقت سکہ کی قیمت مقرر کی جائے قیمتوں کو نہ بڑھنے دیا جائے اور ناپ تول کے پیمانے مقرر کیے جائیں۔ اس کے علاوہ فوجی اقدامات کے ذریعہ زمینداروں کی خودسری کی بھی روک تھام کی۔ ان عوامل سے ان کو جتنی کامیابی ہوئی اس کا فائدہ کسانوں اور سوداگروں کو پہنچا۔ سیاسی اور انتظامی امور کے استحکام کے سلسلہ میں جو اقدامات کیے گیے اس سے زمینداروں کی قوت اور اختیارات میں بہت کچھ کمی واقع ہوئی اگرچہ بعض صورتوں میں انھیں بلاواسطہ فائدہ بھی پہنچا۔

اکثر زمینداروں نے ان تمام اقدامات کو ناپسند کیا جو ان کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کے خلاف تھے مثلاً زمین کی پیداوار کا صحیح اندازہ تمام غیرقانونی ٹیکسوں کو وصول کرنے کی ممانعت اندسکہ ڈھالنے پر پابندی بااثر اور طاقتور زمیندار اس پر بھی ناراض رہتے تھے کہ ان کو اس ت کی ممانعت کی جاتی تھی کہ وہ پڑوسیوں کی املاک پر قبضہ کریں، نتیجہ یہ تھا کہ یہ زمیندار لف طریقوں سے اس کی کوشش کرتے تھے کہ وہ تمام اقدامات اگر بالکل ناکام نہ ہو سکیں م ازکم سست ضرور پڑ جائیں جو سلطنت کے استحکام کے لیے کیے جائیں۔ زمینداروں اور زی حکومت کی یہ کشمکش، کبھی اعلانیہ اور کبھی خفیہ، قرن وسطیٰ میں ہندوستانی سماج کی خصوصیت ، ہے۔ اور ملک کی مختلف فرقوں پر اس کا گہرا اثر رہا ہے۔ راجپوتانہ اور بندیلکھنڈ کے علاقوں میں بیلوں کو کافی اقتدار حاصل تھا۔ اس علاقہ کے زمیندار یا راجہ اپنے قبیلہ کے سردار ہوتے تھے ر ان کے اقتدار اور اختیارات پر ہلکی سی ضرب بھی قبائیلیوں کی مخالفت کے لیے کافی ہوتی تھی سرے علاقوں میں بھی اکثر زمیندار قبیلہ کا سردار ہوتا تھا اور اس کے روایتی اختیارات پر کسی قسم ملہ پورے قبیلہ پر حملہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح راجپوتوں کے علاوہ جاٹ، گوجر، افغان وغیرہ

بھی اپنی قبائلی روایات کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔

زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کرنے کی کشمکش حقیقت میں قرن وسطیٰ کی سوسائٹی کا اصل مسئلہ تھی اور اس کی وجہ سے مختلف سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل پیدا ہوئے تھے۔ ترک اور مغل حکمرانوں نے زمینداروں کے اختیارات کو مختلف طریقوں سے کم کرنے کی کوشش کی۔ بڑی بڑی زمینداریوں کو، ان علاقوں میں جہاں ایک فرقہ کے لوگ آباد اور قابض تھے مختلف فرقوں کے لوگوں میں تقسیم کردیا گیا اور ان زمینداروں سے جو تخت کے وفادار نہیں تھے زمینیں لے کر وفادار زمینداروں کی دی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ زمینوں کے انتظام کے لیے ہر صوبہ، سرکار اور پرگنہ میں ایک محکمہ قایم کی گئی۔ اکبر کے زمانے میں بڑے سے بڑا اشرف لیاقت کے اعتبار سے دیا جاتا تھا اور بہت سے زمینداروں کو جو اس کے اہل تھے منصب دار مقرر کیا گیا اور اس طرح زمینداروں کے جاہ طلبی کے جذبہ کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے باوجود زمینداروں کا طبقہ انتظامیہ کے لیے درد سر بنا رہا۔ وسطی ہندوستان، راجپوتانہ، پہاڑی علاقہ اور پورے دکنی علاقے میں زمینداروں کو بڑی قوت حاصل تھی اور ان کے بہت سے طاقتور گروہ تھے۔ جب حکومت وسیع ہو کر ان علاقوں پر قابض ہوئی تو ان زمینداروں کے پیدا کردہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی یہ مسائل حل ہوئے یا حل نہ ہو سکے ہر حال میں ان عوامل کا سلطنت کی پالیسی پر اثر ہوا۔

اس کشمکش میں علاقائی اور لسانی جذبات بھی کبھی کبھی اثر انداز ہوئے ہیں 1317 میں امیر خسروؒ نے علاقائی زبانوں کی مقبولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اس زمانہ میں ہر صوبہ کی اپنی ایک زبان ہے جو کسی دوسری علاقائی زبان سے مشتق نہیں ہے۔ سندھی، لاہوری، کشمیری، کباری (جموں کے علاقہ کی ڈوگری) دھرسنداری (میسور کی کناری) تلنگی (تیلنگو) گوجر (گجراتی) تاماری (تامل) گوری (شمالی بنگال) بنگال، اودھ دہلی اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ۔ یہ زبانیں قدیم زمانہ ہی سے زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔"

اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں مغلوں کی نہ صرف جاٹوں سکھوں اور پٹھانوں کے ساتھ دشمنی ہوئی بلکہ راجپوتوں اور مراٹھوں کے ساتھ بھی لمبے عرصے تک کشمکش رہی یہ سب مغل شہنشاہیت کے بڑھتے ہوئے خطرات کی نشانیاں ہیں ان کشمکشوں کی بنیادی وجوہات کے بارے میں ناموں میں اختلاف رائے ہے اہم سوال یہ ہے کیا اس تمام کشمکش کا ضروری پس منظر اورنگ زیب کی مذہبی بندی کی پالیسی تھی یا ہر کشمکش کا پس منظر الگ الگ تھا۔ دوسرے الفاظ میں کیا یہ سب کشمکش اورنگ زیب کی نئی مذہبی پالیسی کا نتیجہ تھی یا ان کے پس منظر میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی وجوہات تھیں۔ ان

سوالات کا جواب دینے کے لیے ہمیں ان سبھی کشمکشوں کا مختصر تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

اورنگ زیب کا جاٹوں کے ساتھ ٹکراؤ 1669 میں متھرا کے پاس کے علاقے میں شروع ہوا۔ بغاوت تیزی سے پھیلی اور اس کی انتہا تک پہنچنے کے وقت، 20 ہزار جاٹ، جنہوں نے مغل فوج کا سامنا کیا باغی عام طور سے جاٹ کے ساتھ تھے۔ حالانکہ ان کی قیادت تلپٹ کے زمیندار گوکلا جاٹ نے کی جاٹوں نے ڈٹ کر مغل فوج کا مقابلہ کیا اور کئی بار مغل فوج کے دستوں کے خلاف فتح بھی حاصل کی۔ آخر میں ایک بڑی فوج لے کر اورنگ زیب نے بذات خود ان کا سامنا کیا جاٹوں نے شکست کھائی لیکن تقریباً آٹھ ہزار مغل سپاہی بھی مارے گئے۔ معمولی کسانوں کا مغل بادشاہ کے خلاف اتنی مضبوطی سے مقابلہ کرنا شمالی ہندوستان میں ایک نیا واقعہ تھا لیکن جاٹوں اور مغل حکومت کے درمیان گاہے بگاہے کشمکش پہلے ہی سے شروع ہو گئی تھی شاہ جہاں کے زمانے میں بھی آگرہ اور متھرا کے آس پاس جاٹوں کا مغلوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا جاٹ ہمیشہ لوٹ مار کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے مغلوں کے مطابق جاٹوں کا علاقہ زور طلب تھا یعنی وہاں کے لوگ زور زبردستی اور لڑائی بھڑائی کے بغیر آسانی سے مالگذاری نہیں دیتے تھے اس پس منظر میں مقامی حاکموں کو خوفزدہ کرنے کی پالیسی اپنانے کا آسان بہانہ مل گیا تھا جہاں تک فرقہ واریت کا سوال ہے۔ 62-1661ء میں اورنگ زیب کے حکم کے مطابق آگرے میں ایک مندر توڑا گیا۔ لیکن بندیلہ راجہ بیر سنگھ دیو کے ذریعہ بنوایا ہوا متھرا کا مشہور وشنو ناتھ کا مندر جاٹوں کی بغاوت سے قبل نہیں منہدم کیا گیا۔[17] اس لیے جاٹوں کی بغاوت کا سیدھا تعلق اورنگ زیب کی فرقہ واریت نہیں جوڑا جا سکتا۔

جاٹ کشمکش کی قیادت ابتدا سے ہی زمینداروں کے ہاتھوں میں رہی 1686ء جمنا کے علاقے کے جاٹوں نے دوبارہ بغاوت کی اس بغاوت کا سردار سنسی کا زمیندار راجہ رام تھا اور اس نے جگہ جگہ خونخوار جنگل میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے، جن کا محاصرہ کرنا آسان نہیں تھا جاٹوں کی بغاوت کو دبانے کی ذمہ داری آمیر کے راجہ بشن سنگھ کچھواہہ کے سپرد کی گئی۔ بشن سنگھ کو متھرا کا فوجدار مقرر کیا گیا اور جاٹوں کے علاقے کی زمینداری اسے دی گئی اس طرح جاٹوں کی کشمکش صرف شہنشاہ کے خلاف نہیں رہی کچھواہہ راجہ جاٹ علاقے پر اپنا زمیندارانہ قبضہ قایم کرنا چاہتے تھے جاٹ کسان زمیندار راجپوتوں کو اپنا آقا ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے اس کشمکش کی شکل بدل گئی۔ مغل فوج کے تعاون سے کچھواہہ نے راجہ رام اور اس کے وارث چوڑامن کو 1691 میں سر جھکانے پر مجبور کیا تو یہ جاٹوں کے خلاف مہم جاری رہی۔[18] اس زمانے میں جاٹوں نے اپنی طاقت و اہلیت کا بھرپور مظاہرہ کیا اٹھارہویں صدی

میں آزاد جاٹ ریاست کے قیام کا یہی پس منظر تھا۔

مغل اور سکھوں کی کشمکش بھی اورنگ زیب سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی جہانگیر اور شاہجہاں کے دورِ حکومت میں گُردوں کے ساتھ جھڑپیں ہوتی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی جانب سے مغل بادشاہ پوری طرح مطمئن نہیں تھے اس کی کئی وجوہات بتائی جاتی ہیں جیسے سکھ گردوں کو مذہب اور دنیا دونوں کا محافظ سمجھا جانا (گرو کو حقیقی بادشاہ کہا جاتا تھا) گروؤں کی مادہ پرستی کا بڑھنا اور گرو اور ان کے چیلوں کا ہتھیار بند ہونا، بھائی چارے اور اخوت کے جذبے پر زور دینا جن کی وجہ سے سکھ مذہب پنجاب میں نچلے طبقے، جاٹ، کسانوں، کاریگروں وغیرہ میں مقبول ہوتا جا رہا تھا اورنگ زیب اور سکھوں کی کشمکش کا یہی سماجی پس منظر تھا تو بھی اس میں شک نہیں کہ 1675ء میں اورنگ زیب کے ذریعہ گُرو تیغ بہادر کا قتل صرف ناانصافی ہی نہیں بلکہ اس کی تنگ نظری اور متعصبانہ پالیسی کا نمونہ تھا کچھ ہم عصر مصنفین کا کہنا ہے کہ گُرو تیغ بہادر نے ایک افغان حافظ آدم کے ساتھ ملکر پنجاب میں فسادات کیئے تھے جن کی وجہ سے اس کا قتل کیا گیا گرو کے خاندان کے کچھ لوگوں کی گُرو کے خلاف سازش کا بھی ذکر کیا جاتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر کے صوبے دار شیر افگن کی ظالمانہ پالیسی کے خلاف گرو نے آواز بلند کی تھی اس نے کچھ مسلمانوں کو سکھ ہونے کی ترغیب دی تھی لیکن ایک اہم فرقے کے سربراہ کا اسطرح ظالمانہ قتل کرانا نہ تو منصفانہ ہی تھا اور نہ ہی دانشمندانہ۔

گرو تیغ بہادر کا قتل سکھوں کو منظم کرنے اور ایک نئی تشکیل دینے کی سب سے بڑی وجہ کہی جاتی ہے لیکن 1701 میں سکھوں اور مغلوں کے ٹکراؤ کی صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی ناانصافی اور ظلم کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے گرو گوبند سنگھ نے 1699 میں خالصہ کی بنیاد رکھی اور آنند پور کو سکھوں کا مرکز بنایا تھا 1702 تک سکھوں اور مغلوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ نہ ہی مغلوں نے سکھوں کی کارروائی میں مداخلت کی اس سے پہلے ہندو پہاڑی راجاؤں کی مغلوں کے خلاف بغاوت میں گُرو نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ گرو گوبند سنگھ کی مغلوں کے ساتھ کشمکش سیاسی وجوہات سے ہوئی سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور سیاسی خواہش مندی کی وجہ سے بلاس پور کے راجہ اور دوسرے مقامی ہندو راجاؤں کے ساتھ سکھوں کی کشمکش کی ابتدا ہوئی ان راجاؤں کی درخواست پر مقامی مغل حاکم گوبند سنگھ کو کچلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ سکھ بڑی بہادری سے لڑے لیکن 1705 کے آخر تک ان کی بغاوت کچل دی گئی۔ سکھ ریاست کے قیام کے لیے اٹھارہویں صدی سے جدوجہد جاری رہی۔ اس کا قیام حقیقی شکل میں اٹھارہویں صدی کے نصف کے بعد ہوا جب مغل حکومت کافی کمزور ہو چکی تھی حالانکہ اسی نئی ریاست

کے پس منظر میں یہ جذبہ کار فرما تھا کہ وہ بھائی چارے اور انصاف کے اوپر مبنی ہوگی حاکمانہ طاقت اس کے سردار یعنی زمینداروں کے ہاتھ میں رہی اس طرح اس جدوجہد کی شکل بدلتی رہی اور اس میں اقتصادی، سماجی سیاسی اور مذہبی عناصر کی شمولیت رہی۔ گرو کے دو بیٹوں کے قتل کا الزام اورنگ زیب پر نہیں بلکہ مقامی حاکموں کے سر پر ہے[21] 1705ء میں اورنگ زیب نے گرو کو معاف کر دیا اور اسے اپنے پاس دکن میں بلایا۔ ایسا خیال ہے کہ گرو یہ چاہتا تھا کہ اورنگ زیب اسے آنند پور واپس دلا دے لیکن گرو کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی اورنگ زیب کی وفات ہو چکی تھی۔

جاٹ یا سکھوں کی جدوجہد کو ہم صرف فرقہ وارانہ کشمکش نہیں کہہ سکتے اس کشمکش کا اقتصادی پہلو تھا کسانوں کی مغل شہنشاہیت کی طرف سے بے اطمینانی لیکن اسے واضح طور سے کسانوں کی جدوجہد بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جاٹوں اور راجپوتوں کے درمیان کشمکش حکومت اور زمیندارانہ اختیارات دونوں کے سلسلے میں تھی گرو گوبند سنگھ نے بھی ایک آزاد سکھ ریاست کی بنیاد رکھی حالانکہ ان کی مقصد برآری میں کافی وقت لگا۔

جاٹوں اور سکھوں کی کشمکش کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ اورنگ زیب کو پٹھانوں کے آزاد حکومت کے قیام کے جذبے سے بھی دوچار ہونا پڑا یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کابل اور دریائے سندھ کے درمیانی کوہستانی علاقے میں رہنے والے آزادی پسند بہادروں سے اکبر اور جہانگیر کو بھی لوہا لینا پڑا تھا لیکن اورنگ زیب کے دور میں پٹھان جدوجہد میں ایک نیا عنصر دکھائی دیتا ہے اور وہ ہے پٹھانوں کو منظم کر کے ایک آزاد ریاست کے قیام کی کوشش 1667ء میں یوسف زئی قبیلوں کے سردار بھاگو نے محمد شاہ نامی آدمی کو جو پرانے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا بادشاہ بنایا اور اس کے وزیر کی حیثیت سے اپنے نام کا اعلان کیا رفتہ رفتہ بہت سے قبائیلی بھاگو کے پرچم تلے جمع ہو گئے اور انھوں نے ہزارا، پشاور اور اٹک وغیرہ علاقوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ دس ہزار چنیدہ سپاہیوں کے ساتھ محمد امین خان نے راجہ مان سنگھ بھدوریہ وغیرہ کے ہمراہ بھاگو پر حملہ کیا کئی گھماسان جنگوں کے بعد مغل فتح یاب ہوئے لیکن 1672 میں پٹھانوں کی بغاوت پھر شروع ہو گئی۔ آفریدی سردار اکمل خان نے اپنے آپ کو بادشاہ کی حیثیت سے اعلان کیا اور سکہ و خطبہ اپنے نام سے جاری کیا دوبارہ محمد امین خان کو ان کے خلاف بھیجا گیا۔ لیکن پٹھانوں نے درہ خیبر میں مغل افواج کو گھیر لیا محمد امین خان کسی طرح جان بچا کر پشاور لوٹ گیا لیکن اس کے سارے سپاہی مارے گئے اور تمام سامان لوٹ لیا گیا اسی پسپائی کی وجہ سے تمام قبائیلی علاقے میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی 1674ء میں ایک دوسرے مغل منصب دار شجاعت خاں کو درہ خیبر

میں بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا پٹھانوں کی قیادت اس وقت خوش حال خاں خٹک کے ہاتھوں میں آگئی تھی وہ اورنگ زیب کا پرانا دشمن تھا اور کچھ مدت تک قید میں بھی رہ چکا تھا۔

پٹھانوں کو دبانے اور کابل کا راستہ صاف کرنے کے لیے اورنگ زیب کو بذات خود پشاور جانا پڑا پٹھان قبائیلیوں میں پھوٹ ڈال کر مہاراجہ جسونت سنگھ کی قیادت میں راجپوتوں کو خیبر کے علاقے میں تعینات کر کے اور کابل کے صوبے دار امیر خاں کی خوش انتظامی کی وجہ سے 1678 تک رفتہ رفتہ اورنگ زیب پٹھان بغاوت پر قابو حاصل کر سکا۔[22]

جاٹوں اور سکھوں کی طرح پٹھانوں کی جدوجہد بھی ایک عوامی جدوجہد تھی اور اس کے پیچھے بھی آزاد ریاست کے قیام کا جذبہ کارفرما تھا۔ پٹھانوں کی جدوجہد سے مغلوں کو ہمیشہ کابل کی حفاظت کا فکر رہنے لگا کیونکہ کابل کو مغلیہ ہندوستان کا بیرونی دروازہ سمجھا جاتا تھا اکبر کے زمانے میں ازبیک اور اورنگ زیب کے زمانے میں ایرانی بادشاہ کے ذریعے کابل پر حملہ ہونے کے سلسلے میں مغل کافی پریشان رہے جنگی واقتصادی دونوں نظریوں سے مغلوں کے لیے پٹھان قبائل کے علاقے میں آمد و رفت کا نہ رکنا نہایت اہم تھا۔ سکھ و جاٹ بغاوت کے علاقے بھی جنگی اور آمد و رفت کے نقطۂ نظر سے اہم تھے اس لیے ان سب تحریکوں کی جانب اورنگ زیب کا نظریہ سخت ہی نہیں بے رحمانہ بھی تھا۔ یہ تمام تحریکیں تبھی کامیاب ہو سکیں جب مرکز میں کمزوری آگئی لیکن انھوں نے مراٹھا تحریک کو پنپنے اور مرکزی قوت کے مسائل کو اور زیادہ الجھانے کا کام ضرور کیا۔

راجپوتوں اور مراٹھوں کی جدوجہد کا پس منظر جاٹوں سکھوں اور پٹھانوں کی جدوجہد سے بہت مختلف تھا راجپوتوں کے ساتھ مغلوں کے تعلقات بڑے دیرینہ تھے اور مغل حکومت کی ترقی اور استحکام دونوں میں راجپوتوں کا کافی ہاتھ تھا راٹھور اور سسودیہ راجپوتوں کے ساتھ اورنگ زیب کی کشمکش ایک نئی پالیسی کا نتیجہ ہے یا راجپوتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی پالیسی کے تحت کچھ ذاتی یا اس دور کی وجوہات سے ہے یہ سوال قابل غور ہے۔ سر یند رناتھ سرکار کی رائے میں کشمکش کی بنیادی وجہ اورنگ زیب کی یہ پالیسی تھی کہ وہ پرانی ہندو ریاستوں پر اپنا قبضہ جما کر ہندوستان میں ایک سی اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں ہندوؤں کو تبدیلیٔ مذہب کے لیے مجبور کیا جا سکے لیکن قدیم تحقیق اس رائے کی تائید نہیں کرتی[23] تخت نشینی کے وقت اورنگ زیب کے راجپوت راجاؤں سے تعلقات دوستانہ تھے آمیر کا راجہ مرزا راجہ جے سنگھ اورنگ زیب کا معتمد خاص تھا اس نے ہر مصیبت میں اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا اسی وجہ سے

مارواڑ کے راجہ مہاراجہ جسونت سنگھ نے کھجوا جنگ سے قبل داراشکوہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اورنگ زیب نے رانا راج سنگھ کو بھی شاہ جہاں کے دور میں ضبط کیے گئے پرگنے پُر، منڈل، منڈل گڑھ اور بڈنور واپس دے کر اپنی طرف ملالیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اورنگ زیب کی نظر میں راجپوتوں کی اہمیت کم ہوتی گئی اسکی وجوہات کسی حد تک ذاتی تھیں مرزا راجہ جے سنگھ کی 1667 میں موت کے بعد اس جیسا کوئی لائق اور قابل اعتماد راجپوت راجہ اورنگ زیب کو نہیں ملا جسونت سنگھ اور رام سنگھ کچھوا دونوں کی جانب سے اورنگ زیب کا دل صاف نہیں تھا اسی زمانے میں اورنگ زیب کی مذہبی تنگ نظری بھی بڑھی اس نے دربار میں موسیقی بند کرادی، سونے چاندی کے ظروف کو غیر شرعی ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا اور بہت سی پرانی ہندو رسموں کو ممنوع قرار دیا[25] 1679ء میں مہاراجہ جسونت سنگھ کی جمرود میں وفات ہوگئی آنجہانی راجہ کا کوئی بیٹا زندہ نہیں تھا ایسی حالت میں مارواڑ کی گدی کے دو خاص دعوے دار تھے ایک جسونت سنگھ کے بڑے بھائی امر سنگھ کا پوتا اندر سنگھ جو ناگور کا جاگیردار تھا اور دوسرا امر سنگھ کا نواسہ انوپ سنگھ وراثت کے اس مسئلے کے حل ہونے تک پرانی مغلیہ روایات کے مطابق مارواڑ کو اورنگ زیب نے خالصہ کر لیا جسونت سنگھ کی رانیوں اور خدمت گاروں کے اخراجات کے لیے سوجت اور جے تاران کے پرگنے انھیں دے دیئے گئے[26] جودھ پور پر شاہی تسلط جمانے کے بعد جسونت سنگھ کا سامان ضبط کر لیا گیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ کے اوپر تقریباً پچاس لاکھ روپئے جو انھیں خرچ کے لیے دیئے گئے تھے۔ بقایا تھے[27] کچھ روز بعد مہاراجہ کی دو رانیوں کے بطن سے دو بیٹے اجیت اور دلتھمبن پیدا ہوئے۔ گدی کا سوال طے کرنے کے لیے ان کو بھی اورنگ زیب کے دربار میں بلایا گیا۔

حاشیہ

تعارف

1 :- برنی کی رائے (سرسید ایڈیشن) 180 صوبہ داروں کو ہدایات آئین اکبر (N.K) 1893) سرکار مغل انتظام سلطنت 60-57 '1272' اجنا پرتا کے مصنف (سترہویں صدی کی ایک دستاویز) نے لکھا ہے۔ زمیندار اس پر قناعت نہیں کرتے جو ان کے قبضہ میں ہے اور نہ ہمیشہ شاہ وقت سے وفاداری کا ثبوت دیتے تھے اور ہمیشہ وہ اپنے مقبوضات کو تھوڑا تھوڑا بڑھاتے رہتے تھے تاکہ ان کی قوت میں اضافہ ہو اور طاقت حاصل کرنے کے بعد دوسروں کے مقبوضات پر جبریہ قبضہ کرتے اور اس طرح مخالفتوں کا طوفان کھڑا کر دیتے (I.H.C.Pro 405 1)

2 :- محمد تغلق نے غیر شرعی ٹیکسوں کو اور باہر سے آنے والے مال پر جو ٹیکس لگایا جاتا تھا اس کو معاف کر دیا تھا (ابن بطوطہ 288) فیروز شاہ نے 52 غیر قانونی ٹیکس معاف کئے (فتوحات) شیر شاہ، اکبر، اورنگ زیب وغیرہ نے غیر قانونی ٹیکس خصوصاً راہداری وصول کرنے کی ممانعت کے احکامات جاری کئے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غیر قانونی ٹیکس باوجود اس قدر ممانعتوں کے برابر وصول کئے جاتے تھے۔ (مورلینڈ 50-46، سرکار iii 85)

باب اوّل

دربار میں جماعتی کشمکش کا آغاز

دربار میں سیاسی جماعتیں

اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے آخر اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں مغل دربار میں امراء کی دو جماعتوں نے ممتاز حیثیت اختیار کی۔ ان جماعتوں نے آئندہ چالیس برس تک مغل دربار میں ایک اہم کردار ادا کیا اس لیے ان جماعتوں کے کردار ان کی تشکیل ان کا پس منظر، نقطۂ نظر اور سیاسی گٹھ جوڑ کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پہلی جماعت کے رہنما وزیر الممالک اسد خاں اور اس کا بیٹا ذوالفقار خاں تھے۔ ذوالفقار خاں 1702ء میں بخشی الممالک بھی ہو گیا تھا۔ اسد خاں ایران کے ایک مشہور خاندان سے متعلق تھا اور اس کا دادا ذوالفقار خاں، شاہ عباس اول کے عہد میں شراوان کا بیگلر بیگی تھا 1600-1601 میں کسی شبہ کی بنا پر ذوالفقار خاں کو شاہ عباس کے حکم سے مار ڈالا گیا۔ جس کی بنا پر اس کے خاندان کو شدید مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور اسد خاں کے باپ خاں لار۔ کو (المخاطب بہ ذوالفقار خاں قرامان لو) جہانگیر کے دورِ حکومت کے آخر میں ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔ شاہ جہاں نے اس کے ساتھ بہت مہر و محبت کا سلوک کیا یامین الدولہ آصف خاں کے برادر نسبتی صادق خاں کی لڑکی سے اس کی شادی کرائی اور بالآخر تین ہزاری منصب پر فائز کرایا۔ شاہ جہاں کے دورِ حکومت کے آخر میں فالج کی بنا پر وہ عملی زندگی سے دست کش ہو کر پٹنہ میں جاگزیں ہو گیا۔

محمد ابراہیم المخاطب بہ اسد خاں صادق خان کی بیٹی کے بطن سے ذوالفقار خاں قرامان لو کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور جو 1055 ہجری مطابق 26-1625ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ شاہ جہاں کے بہت قریب تھا۔ اور آصف خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ 1654ء میں اسے اسد خاں کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور آختہ بیگی گھوڑوں کا سردار اور فوراً بعد بخشی دوم کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ اسد خاں کی زندگی کے باقی حالات کا جائزہ لینا ہمارے موجودہ مقصد کے لیے ضروری نہیں۔ اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ اورنگ زیب کا بھی خاص آدمی تھا اور بطور بخشی دوم اس کے تحت کام کرتا رہا 1661ء میں اس کا عہدہ بڑھا کر چار ہزاری

دو ہزاری منصب پر فائز کیا گیا۔ 1669ء میں جب جعفر خاں وزیر مملکت کا انتقال ہو گیا تو اس کی جگہ پر کسی کا بھی تقرر نہیں کیا گیا بلکہ اس جگہ پر بھی اسد خاں ہی کو بطور نائب وزیر کے منتخب کیا گیا۔ اگلے برس وہ میر بخشی کے عہدہ پر لشکر خاں متوفی کی جگہ پر منتخب ہوا۔ اور 1673ء تک نائب وزیر رہتے ہوئے اس عہدہ پر بھی کام کرتا رہا۔ 1676ء میں اسے ترقی دے کر عہدہ وزارت پر سرفراز کیا گیا اور پورے رسم و رواج کے ساتھ باقاعدہ قلمدان وزارت اس کے سپرد کیا گیا اس کے بعد اسے ایک زبردست لشکر کا سپہ سالار بنا کر دکن بھیجا گیا اور راجپوتوں کے فتنہ کو فرو کرنے میں بھی اس نے بڑی مستعدی سے حصہ لیا۔ بیجاپور کے محاصرہ میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا جس کے لیے اسے سند وزارت سے سرفراز کیا گیا۔ اگلے سال گولکنڈہ کی فتح کے نتیجہ میں اسے 7000 ہزاری/7000 ہزاری سواروں سے فائز کیا گیا اس طرح 1676ء تک اسد خاں ایک اہم مقام حاصل کر چکا تھا جس پر وہ اورنگ زیب کے دور حکومت کے باقی 31 برسوں میں بھی قایم رہا۔ غرض کہ اس کی وزارت کی مدت دوسرے وزراء کے مقابلے میں دراز ترین مدت تھی۔ اس کے عہدہ اس کے بلند مقام اس کے اعلیٰ نسب و حسب اور شاہی خاندان سے اس کے تعلق کی بنا پر اسے ہر طرف سے بے انتہا عزت و احترام حاصل تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے اورنگ زیب اس کی قابلیت اور صلاحیت کا بہت قدر داں تھا۔ اگرچہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اورنگ زیب کی پالیسیاں کس حد تک اثر انداز ہوئیں۔

اورنگ زیب کی حکومت کے آخری دور میں اسد خاں کو کچھ عرصہ کے لیے اسلام پوری میں خیمہ زن لشکر کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ کیونکہ اب اسے کسی عملی کردار کے لیے ضعیف و نحیف مانا جانے لگا تھا اس کے بعد بھی کوندانہ، راج گڑھ اور داکن کھیڑہ کے محاصرہ میں اورنگ زیب کا ہمرکاب تھا۔

ذوالفقار خاں پسر اسد خاں 1649ء میں پیدا ہوا اور 1660ء میں جب وہ گیارہ سال کا تھا اسے پہلا منصب عطا ہوا۔ 1677ء میں اورنگ زیب کے ماموں امیر الامراء شائستہ خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی اور اعتقاد خاں کا خطاب ملا۔ اس نے اعتقاد خاں کی حیثیت سے 1689ء میں راہیری راج گڑھ پر قبضہ کر کے پہلا کارنامہ انجام دیا۔ راج گڑھ کا قلعہ بے حد مضبوط تھا اور وہاں خزانہ کے ساتھ ساتھ شمبھاجی اور راجہ رام کے خاندان بسے ہوئے تھے۔ لہٰذا انعام کے طور پر اس 2000 دو ہزاری/3000 تین ہزاری سوار منصب کر دیا گیا۔ اور موروثی لقب ذوالفقار خاں دیا گیا۔ اس کے بعد میں اسے پن ہالے کے قلعہ کو فتح کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

ذوالفقار خاں کا اصلی رتبہ اس وقت سے مانا جاتا ہے جب کہ 1690ء میں اسے فوج کی کمان سپرد

کی گئی اور جنجی پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ بہت ہی اہم کام تھا۔ شمبھاجی کے جانشین نے وہاں پناہ حاصل کر رکھی تھی اور ایک طرح یہ مرہٹوں کے اجتماع کا مرکز بن چکا تھا جنجی کی فتح اور راجہ رام کی گرفتاری کے بعد اورنگ زیب کو امید تھی کہ مراہٹوں کی مہم ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد مہاراشٹر میں نظم و نسق کا قیام کوئی مشکل مسئلہ نہیں رہے گا۔ لیکن ذوالفقار خاں کو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جنجی غیر معمولی طور پر طاقتور قلعہ ثابت ہوا اس کے سپرد جو کام کیا گیا تھا اس کے مقابلہ میں فوج ناکافی تھی مرہٹوں کی کارروائیوں کے پیش نظر رسل و رسائل اور رسد کے بھیجنے کا انتظام بہت مشکل تھا۔ اس کے علاوہ مقامی آبادی کا عدم تعاون اور خود ذوالفقار خاں کے اپنے امراء کا غیر اطمینان بخش رویہ تھا کیونکہ وہ دل سے اس مہم کے ساتھ نہ تھے 1692ء میں کرناٹک میں سنت جی گھور پانڈے اور دھنا جی جادو کی آمد نے صورتحال کو دشوار بنا دیا۔ ذوالفقار خاں نے اپنے آپ کو مشکل میں گرفتار پایا اسد خاں اور شہزادے کام بخش کو اس کی مدد کے لیے حکم دیا گیا لیکن کام بخش کی سازشوں کے نتیجہ میں مزید انتشار پھیلا اور اس کو گرفتار کر کے قید کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ محاصرہ کو عارضی طور پر ترک کر دینا پڑا۔

1698 میں ذوالفقار خاں نے جنجی کو فتح کیا لیکن اصل مجرم راجارام فرار ہو گیا اورنگ زیب اس پر خوش تو نہ ہو سکا مگر ذوالفقار خاں کو ایک 1000 ہزار سوار کا انعام دیا اب اس کا منصب پانچ ہزار ذات / پانچ ہزاری سوار کر دیا گیا۔

ذوالفقار خاں کی زندگی میں جنجی کے محاصرہ کا زمانہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بظاہر یہی وہ زمانہ تھا جس میں اس نے اپنے گرد جاں نثار ساتھی اور پیرو اکٹھا کیے اور دکنی امراء سے تعلقات قایم کیے۔ بعض ہم عصر مشاہدین کا خیال ہے کہ اس کے یہاں دکن میں آزاد سلطنت کے قیام کی ہوس پرورش پانے لگی تھی۔ ذوالفقار خاں کے سیاسی خیالات کی بھی اس دور میں نشو و نما ہوئی 1697ء میں اس نے اورنگ زیب کو راجہ رام کی طرف سے معاہدہ کی ایک تجویز بھیجی لیکن اورنگ زیب اس کو سننے کے لیے تیار نہ ہوا۔

جنجی کی فتح کے بعد ذوالفقار خاں کو سب سے پہلے مراٹھا جنرل دھنا جی جادو سے کون کان میں نمٹنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اور اس کے بعد گشتی کمیشن کی حیثیت سے مرہٹوں سے جہاں بھی وہ مل سکیں، نمٹنے کا کام سپرد ہوا۔ ذوالفقار خاں اسے نقصان پہنچانے میں ناکام رہا۔ کیونکہ وہ تیزی سے اپنے پڑاؤ کی جگہیں بدلتا رہا۔ لیکن دوسرے مرہٹہ سرداروں کے خلاف اس نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں اور ایک کامیاب جنرل کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔

بحرہ مند خاں کے انتقال کے بعد 1702ء میں وہ میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہوا 1705 میں جبکہ اورنگ زیب واکن کیرا کے مقام پر مصیبت میں مبتلا تھا ذوالفقار خاں کو اپنے تمام امراء اور جنرل کے ساتھ طلب کیا۔ اس کی آمد سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور جلد ہی قلعہ فتح کر لیا گیا لیکن اورنگ زیب کو چونکہ پڑیا نائک کے فرار میں ذوالفقار خاں اور اس کے ساتھی دلپت راؤ کے ساز باز کا شبہ تھا اس لیے اسے حقیر رقم سے نوازا گیا۔ پھر بھی جلد ہی اس کا منصب (6000) چھ ہزاری ذات / 6000 چھ ہزاری سوار کر دیا گیا 1706 میں اورنگ زیب نے ایک اور اہم قدم اٹھایا۔ ذوالفقار خاں کی فوج کے سپرد شاہو کر دیا گیا اس کا مقصد مرہٹوں سے معاہدہ کرنا اور بات چیت کرنا تھا۔ شاہو کی سپردگی ذوالفقار خاں کی سیاسی اہمیت کو خاموشی سے تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ مرہٹوں سے خاص تعلقات کی بنا پر اگر پہلے نہیں تو اس وقت سے ذوالفقار خاں نے شاہو میں ذاتی طور پر دلچسپی لینی شروع کر دی۔ مرہٹہ سردار مغل پالیسی کے بارے میں اس قدر مشکوک تھے کہ ان کی طرف سے کوئی مثبت رویہ اختیار نہیں کر سکے۔

اورنگ زیب کی وفات تک اسد خاں اور ذوالفقار خاں دربار میں وزیر اور میر بخشی کے دو اہم عہدے حاصل کر چکے تھے اور ان کے ذاتی مناصب (7000) سات ہزار ذات اور (6000) چھ ہزار سوار تک بڑھ گئے تھے۔ علاوہ ازیں ان کو غیر معمولی شہرت اور عزت مل چکی تھی۔ ذوالفقار خاں اپنے وقت کا کامیاب ترین جنرل تھا اور ایک درخشندہ ستارہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ بام عروج پر پہنچنے والا ہیرو تھا۔ اس کے خاص مددگاروں میں داؤد خاں پانی پتی راؤ دلپت بندیلہ اور راؤ رام سنگھ ہاڈا قابل ذکر ہیں۔ تینوں ہی مشہور جنگجو تھے اور کرناٹک میں ایک عرصہ تک ذوالفقار خاں کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ 93، 1692ء میں ذوالفقار خاں کے اشارہ پر راؤ رام سنگھ ہاڈا کا سردار کوٹہ کی گدی پر بیٹھا، اور ذوالفقار خاں کی ماتحتی میں کام کرتا رہا۔ 1706ء میں ذوالفقار خاں بوندی کی زمینداری کو بدھ سنگھ کی بجائے جسے برطرف کر دیا گیا تھا اپنے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ راؤ دلپت بندیلہ جس نے 1668ء میں نوکری کی تھی، 1690 میں جنجی میں متعین کیا گیا اور اس کے بعد ذوالفقار خاں کے ساتھ کام کرتا رہا۔

داؤد خاں پنی خضر خاں کا بیٹا تھا۔ یہ ایک سوداگر تھا۔ جو بیجاپور کے مشہور سرداروں کی پوزیشن تک پہنچ گیا تھا۔ 1677ء میں دکنی پارٹی کے ہاتھوں خضر خاں کے قتل کے بعد داؤد خاں اپنے بھائی سلیمان خاں کے ساتھ شاہی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور اس کو اس کے چچا رن مست خاں سے وابستہ کر دیا اس نے بعد میں کافی شہرت حاصل کی اور اس کو بہادر خاں کے خطاب سے نوازا گیا اس کے بعد

اسے ذوالفقار خاں سے منسلک کر دیا گیا۔ اس نے جنجی کے محاصرہ کے دوران کافی نام پیدا کیا۔ جنجی کی فتح کے بعد جب ذوالفقار خاں کو دربار میں واپس بلا لیا گیا داؤد خاں کو حیدر آبادی کرناٹک کی فوجداری میں نائب بنا دیا گیا اور دو سال کے بعد 1701 میں بیجاپوری کرناٹک کی فوجداری بھی اس کے حوالے کر دی گئی۔ 1704 میں اسے شہزادہ کام بخش کا جو اس وقت حیدر آباد کا صوبہ دار تھا نائب مقرر کر دیا گیا اور اس کا منصب (6000) چھ ہزاری ذات / (6000) چھ ہزاری سوار کر دیا گیا۔

داؤد خاں کے دکن کے امرا سے بہت تعلقات تھے اور وہ ایک امیر آدمی کے طور پر مشہور تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ کٹر خیالات کا حامی نہ تھا اس کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف جانبدارانہ نہ تھا۔ اوپر کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں اور اس کے ساتھیوں کا گروہ بہت طاقتور تھا اس کے خاص ممبروں کے منصب چوبیس ہزار (24000) ذات اور چوبیس ہزار (24000) سوار تک جا پہنچے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ گروہ کسی ذات یا فرقہ پر مبنی نہ تھا۔ اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ایرانی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اورنگ زیب کی وفات کے وقت تک تقریباً تین چوتھائی صدی سے یہیں رہتے آئے تھے۔ یہ گروہ ایک ہی خاندان سے وابستہ ایک ذاتی گروہ تھا۔ اور ذوالفقار خاں سے رشتہ داری اور اس سے ذاتی وفاداری رکھتا تھا! اس گروہ کی مخصوص سیاست نہ تھی لیکن ذوالفقار خان کی ذاتی دلچسپی اور وقار شاہو میں تھا اور مرہٹوں سے اس کے تعلقات بنانے کے لیے کوشاں تھا بندیلہ سے اور راجپوت سرداروں سے اس کے تعلقات بھی غیر اہم نہیں ہیں۔

دربار کے دوسرے گروہ میں غازی الدین فیروز جنگ اس کے بیٹے چن قلیچ خاں (بعد کو جو نظام الملک بنا) حامد خان بہادر اور اس کا عم زاد محمد امین خاں فیروز جنگ کا باپ شامل تھے۔ خواجہ عابد شاہ جہاں کے آخری دور میں ہندوستان آیا تھا اور دکن میں اورنگ زیب کے ساتھ اس وقت شامل ہوا جب وہ تخت کے حصول کے لیے شمالی ہندوستان کی طرف کوچ کر رہا تھا خواجہ عابد کے والد عالم شیخ بخارا کے مشہور عالموں میں سے ایک تھے اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے ان کا سلسلہ ملتا ہے۔ شیخ شہاب الدین دارا شجاع اور جسونت سنگھ کے خلاف مہمات میں حصہ لیا اور صدر مل کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ بعد کو انھیں اجمیر کا اور پھر ملتان کا گورنر مقرر کیا گیا حکومت کے سولھویں سال میں 75-1674ء میں ان پر عتاب نازل ہوا اور انھیں مکہ کی زیارت کے لیے بھیج دیا گیا۔ 81-1680 میں انھیں پھر صدر کل کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور آخر کار بلخ کا

گورنر بنادیا گیا1667 ان میں گولکنڈہ کے محاصرہ کے دوران بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر ان کا انتقال ہوگیا اس وقت ان کا عہدہ پانچ ہزاری تھا۔

غازی الدین خاں (امیر شہاب الدین 1069 میں ہندستان آیا 80 ہجری 79-1668 اور راجپوت کی جنگ میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس نے آراولی کی پہاڑیوں میں حسن علی خاں کی ٹکڑی کی موجودگی کی خبر سخت خطرہ لے کر پہنچائی تھی۔ اس نے مرہٹوں کے ساتھ بھی جنگ میں نام کمایا اور غازی الدین خاں وفیروز جنگ کے خطابات سے نوازا گیا۔1685ء میں بیجاپور کے محاصرہ کے دوران اعظم کے پاس رسد پہنچانے کے انعام میں ماہی مراتب ملا۔ اس پر قبضہ کا سہرا بھی اسی کے سر ہوا اور اس کا عہدہ سات ہزار ذات/سات ہزار سوار مقرر کر دیا گیا اگلے سال ادونی پر قبضہ کر کے اس نے اپنی شہرت میں مزید اضافہ کیا لیکن اس سے اگلے سال حیدر آباد میں پلیگ کی بیماری میں وہ اندھا ہوگیا 1698 میں اسے برار کا گورنر مقرر کیا گیا جس عہدہ پر وہ اورنگ زیب کی حکومت کے دوران آخر تک فائز رہا 1700 سے 1702 تک اسلام پوری کے کیمپ کا انچارج رہا اور برار اور مالوہ میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے کا کام سپرد کیا گیا 1701 میں بہادر پورے واپسی پر اورنگ زیب غازی الدین کے کیمپ سے گزرا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق خان کی فوجوں کا معائنہ کیا خان کی فوجیں چار کوس تک پھیلی ہوئی تھیں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح تھیں ان کے معائنہ کے بعد اورنگ زیب نے ان میں سے بکتر بند کی ایک بڑی تعداد پر اپنا قبضہ جمالیا اور شہزادہ بدر بخت کو خط لکھا "تم دوگنے خراج پر بھی ایسے ہتھیار نہیں رکھ سکتے جیسے فیروز جنگ کے پاس ہیں اس کے پاس وہ تمام سامان موجود ہے جو ہونا چاہیے بلکہ وہ سامان بھی موجود ہے جو نہیں ہونا چاہیے"۔

چن قلیج خاں 81ھ یعنی ہجری 1671 میں پیدا ہوا غالباً آگرہ میں۔ اس نے اپنے باپ کی شروع کی مہمات میں حصہ لیا ادونی بھی اس میں شامل ہے اس کے بعد مرہٹوں کا پیچھا کرنے پر مقرر کیا گیا اور اسی سال وہ بیجاپور کا گورنر اور تل کونکان۔ اعظم نگر اور بلگام کا فوجدار بنایا گیا 1705 میں کھنکیرا کے محاصرہ میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ کھنکیرا کے قبضہ کے بعد چن قلیج خان کا شہنشاہ پر اثر بڑھ گیا اور وہ تمام اہم معاملات میں اس سے مشورہ کرنے لگا چن قلیج خان کے بھائی حامد خاں بہادر اور رحیم الدین خاں نے بھی فیروز جنگ کے ماتحت کام کیا 1707 میں وہ 2500/1500 کے اور 1600-1500 کے منصب پر رہا۔ چن قلیج خاں کے دوسرے عم زاد محمد امین خاں 1687 میں بخارا کے خاں کے ذریعہ باپ کی موت کے بعد آیا وہ 2000/1000 کے منصب پر فائز ہوا اور

تھوڑے وقفہ ہی میں ایک بہادر اور 1000/2000 جنگجو کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ شروع میں وہ فیروز جنگ کے ماتحت کام کرتا رہا 1898 میں وہ دربار میں بلایا گیا اور صدر منصب پر مقرر کیا گیا یہ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے یہ قدم جان کر اٹھایا تھا تاکہ ایرانیوں کا خاص طور سے اسد خاں اور ذوالفقار خاں کا اثر کم کیا جاسکے۔ اس بات پر شبہ کیا جا سکتا ہے اورنگ زیب نے خواجہ عبداللہ کو صدر مقرر کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دربار میں جاتا خواجہ کا احمد نگر میں انتقال ہوگیا۔

اس کے بعد اورنگ زیب نے محمد امین خان کو مقرر کیا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی نسبت سے وہ اس عہدہ کے لیے مناسب ترین آدمی تھا اور اس کا چچا خواجہ عابد اورنگ زیب کی حکومت کے اولین دور میں اسی عہدہ پر فائز تھا۔ حقیقت میں اس بات کا بہت کم ثبوت ملتا ہے کہ اورنگ زیب ایرانی امراء میں شیعہ عقیدہ کی وجہ سے تفریق کرتا تھا حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے شیعہ عقائد کی ناپسندیدگی کو کبھی نہیں چھپایا اس طرح اس کے بہت سے افسر ایران سے نکالے ہوئے اور شیعہ عقیدہ کے ماننے والے ہی تھے صدر کے عہدہ کے فوراً بعد محمد امین خاں نے بخشی کے عہدہ کے لیے ایک درخواست گزاری "دونوں بخشیوں کی جگہوں پر شیطان شیعوں کو قابض کر دیا گیا اور اس طرح شیعوں کو تقویت بخشے گا"۔ اورنگ زیب نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا ذوالفقار خاں کے 1702 میں میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہونے سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ اس کے خاندان کے بارے میں شہنشاہ کو کوئی شبہ تھا

مختلف بیانات اور ثبوت سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ جن گروہوں کو بہت اہمیت اور طاقت حاصل تھی ان کے مراتب اور منصب کی مجموعی طاقت (20,000) بیس ہزاری ذات/ (15600) پندرہ ہزار چھ سو سوار تک پہنچتی ہے۔ فیروز جنگ اور محمد امین خاں دونوں ہی توران سے ہند آئے تھے وہ ہمیشہ اپنے بھائی بندوں کی سرپرستی کرتے اور بہت سے تورانی ان کے ساتھ تھے چن قلیچ خاں اور حامد خاں بھی تورانیوں کی سرپرستی کرتے تھے انھوں نے اسد خاں اور ذوالفقار خاں کے گروہ پر سبقت حاصل کر لی اور فیروز جنگ چن قلیچ خاں کے تعلقات کی کشیدگی اور فیروز جنگ کے نابینا ہونے کی وجہ سے یہ گروہ کمزور تھا۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان شروع ہی سے شاہی مراتب کے لیے رسہ کشی تھی خاص طور سے دونوں نوجوان ذوالفقار خان اور قلیچ خاں میں ذاتی عداوت تھی اور ایک دوسرے سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس طرح کی عداوت کو کوئی عجوبہ نہیں اور اسے بڑھا چڑھا کر نہیں پیش کرنا چاہیے۔ مغل دربار میں

چوتھائی صدی تک شاہی طاقت کے حصول کے ان دونوں گروہ میں سخت کشمکش اور زور آوری رہی اور اس طرح اس زمانہ کی سیاست اور دوسرے حالات پر ان کا گہرا اثر پڑا۔

خانہ جنگی

شہزادے کے درمیان خانہ جنگی سے جاگیرداروں اور صوبہ داروں کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا اور وہ اس جنگ میں ملوث شہزادوں سے مختلف مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ منفرد جاگیرداروں اور صوبہ داروں کے لیے بھی یہ ایک آزمائش کا زمانہ تھا اور ان کو سخت مراحل در پیش ہو جاتے۔ کامیاب امیدواروں کا ساتھ نہ دینے سے خود ان کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا تھا اورنگ زیب کے بیٹے یعنی معظم اعظم اور کام بخش عرصہ سے وفادار جاگیرداروں کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور یہ سعی اس خانہ جنگی کے پیش نظر تھی جس کا اورنگ زیب کی وفات کے بعد وقوع میں آنا ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ ان میں سے بڑے بھائی یعنی معظم کو اورنگ زیب نے 1687 میں قید کر دیا تھا اور رجب 895 ھ میں وہ رہا کیا گیا تو اسے گورنر بنا کر کابل روانہ کر دیا گیا۔[32] کام بخش عالم فاضل اور نہایت سمجھدار شخص تھا لیکن اس کی طبیعت میں گہرائی نہ تھی۔ اعظم دربار کے ممتاز عہدہ داروں کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ خصوصاً اس نے اسد خان اور ذوالفقار خاں کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔[33] دربار میں اعظم شاہ اور کام بخش آپس میں تنازع اور کشیدہ رہتے تھے اور اعظم اپنے مقربین اور اپنے وسائل پر بھروسہ کر کے، کام بخش کو نیچا دکھانے کے موقع کا متلاشی رہا کرتا تھا۔ کام بخش کی زندگی کی حفاظت کے پیش نظر اور دونوں بھائیوں میں جنگ کے امکان کو اپنی زندگی میں روکنے کے لیے اورنگ زیب نے 1707 میں کام بخش کو بیجاپور کا صوبہ دار مقرر کر کے رخصت کر دیا۔ کام بخش کو تمام شاہانہ لوازمات نذر کیے گئے اور اسے شاہی علاقوں ہی سے اپنے نقارے بجانے کی اجازت بخشی گئی۔ یہ وہ خصوصی مراعت تھی جو فقط حکمرانوں اور بادشاہوں کے لیے مخصوص تھی اس سے قبل احسان خاں کو اس کا بخشی خاص مقرر کیا گیا تھا اور اس کو کام بخش کی نگہداری کا منصب سپرد کیا گیا محمد امین خاں کو بھی اسی کے ساتھ شامل ہونے کی ہدایت کی گئی۔ محمد اعظم کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے صوبے مالوہ کی طرف کوچ کرے اس پر وہ نہایت چراغ پا ہو کر رخصت ہوا۔[34]

ایک وصیت نامہ میں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے تکیہ کے نیچے سے برآمد ہوا، حکومت کی تقسیم کے احکامات پائے جاتے ہیں جن کے مطابق

بیجاپور اور حیدرآباد کام بخش کو دے دیئے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ کام بخش کو بیجاپور کا انتظام سنبھالنے کے لیے بھیجتے وقت اورنگ زیب اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خواہش سے متاثر رہا ہو اور اس امید میں کہ ممتاز جاگیرداروں اور عہدہ داروں کی مدد سے کام بخش جو اورنگ زیب کی ضعیفی میں باپ کا بہت چہیتا تھا اپنے دشمنوں سے دفاع کر سکے۔ لیکن شاید اورنگ زیب کو اس کی زیادہ فکر تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کے درمیان ایک توازن برقرار رکھ سکے تاکہ ان میں سے کوئی بھی باپ کو کسی ایک طرف میلان اور تعصب کا مجرم نہ قرار دے سکے۔ اور اس پر بھی وہی الزام عائد نہ کیا جا سکے جو خود اورنگ زیب نے اپنے باپ پر کیا تھا کہ وہ داراشکوہ کی طرف رجحان رکھتا ہے۔ لیکن اورنگ زیب کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ محمد امین خاں کو کام بخش کے ساتھ منسلک کیا جا سکے کیونکہ کام بخش نے احمد نگر سے چند منزلیں ہی طے کی ہوں گی کہ اس کو اورنگ زیب کی وفات کی اطلاع ملی اور اس خبر کو سنتے ہی محمد امین اعظم شاہ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔

اعظم اپنے شاہی پڑاؤ کے شاید دو منزل تک بھی نہ پہنچا تھا کہ 3 مارچ 1707ء کو احمد نگر میں اورنگ زیب کی وفات ہو گئی۔ وہ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے شاہی املاک و اثرات پر قبضہ کر لیا تمام امراء نے جو ہر وقت دربار میں موجود تھے وزیر اعظم اسد خاں کے ساتھ اعظم کی تخت نشینی کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ ذوالفقار خاں جو میر بخشی تھا اور جو مرہٹوں کو پسپا کرنے کی غرض سے ایک مہم پر گیا ہوا تھا وہ تنگ بھدرا دو آب سے تیزی کے ساتھ واپس آیا اور اورنگ آباد کے قریب اعظم شاہ کے ساتھ مع رام سنگھ ہاڑا دلپت بندیلہ اور تربیت خاں میر آتش شامل ہو گیا۔[35]

حکومت کے با اثر امراء کی مدد سے، نیز شاہی رسد، توپ خانے اور دکن کی مہم پر آئے ہوئے تجربہ کار اور نہایت ہوشیار سرداروں کی وفاداری کے پیش نظر اعظم کے بارے میں عام طور پر یہ پیشین گوئی کی جانے لگی تھی کہ دوسرے امیدواروں کی بہ نسبت خانہ جنگی پر قابو اور فتح پانے میں صرف وہی کامیاب ہو سکے گا۔ لیکن اس کی فتح و نصرت کے اسباب حقیقی سے زیادہ محض اندازے اور قیاس پر مبنی تھے امراء میں سے بیشتر خانہ جنگی کے خطرات مول لینے کو تیار نہ تھے اور وہ جی جان سے معظم کے ساتھ نہ تھے اور بالاعلان اس کا ساتھ دیتے ہوئے کترا رہے تھے چنانچہ "چین گروہ" جو ایک طاقتور عسکری گروہ تھا اس نے اس امکانی خانہ جنگی میں حصہ لینے کی خواہش کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کے بعد اعظم نے اس طاقتور گروہ کو خوش کرنے کے لیے محمد امین خاں کو چھ ہزاری چھ ہزار اور سات ہزار اور سات ہزار کا عہدہ عطا کیا اور چین قلیچ خاں کو خان دوراں کا خطاب

عطا کیا۔ اور اس کو نجابت خاں کی بجائے برہان پور (خاندیش) کا گورنر بھی مقرر کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ خود تو دربار سے منسلک رہے اور اپنی جگہ کسی نائب کو مقرر کر دے لیکن چن قلیچ خان نے اورنگ آباد سے ایک یا دو منزل کا سفر کرنے کے بعد ہی شاہی کیمپ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اور سبب یہ ظاہر کیا کہ اس کے صوبے میں خود اس کی موجودگی بہت ضروری تھی۔[36]

فیروز جنگ دولت آباد ہی میں ٹھہرا رہا اور اعظم کے ساتھ شامل ہونے کے لیے کوئی اقدام نہ کیا ذوالفقار خاں نے اعظم کو صلاح دی کہ وہ دولت آباد کے راستہ آگرہ کا سفر کرے اور فیروز جنگ کو اپنے ساتھ شامل ہونے کے لیے مجبور کرے۔ لیکن اعظم آگرہ کا سیدھا راستہ ترک کرنے پر تیار نہ تھا اور اس نے یہ مغرورانہ جواب دیا کہ اس کا مدمقابل داراشکوہ نہیں ہے نیز یہ کہ شاہی افواج (والاشاہی) اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں[37] دراصل اعظم فیروز جنگ اور چن قلیچ خان کے شامل ہونے سے انکار کرنے پر سخت ناراض تھا لیکن اس نے اس وقت اپنی ناراضی کو پوشیدہ رکھنا ہی مصلحت جانا۔ نیز یہ سوچ کر کہ فیروز جنگ کو دشمن کی بجائے دوست بنا کر چھوڑ جانا زیادہ مصلحت آمیز اقدام ہے۔ اس کو سپہ سالار کے خطاب سے فائز کیا اور اورنگ آباد کا گورنر اور دکن کا نائب حکمراں یعنی وائسرائے مقرر کر دیا۔ ایک نقرہ ہاتھی اور دوسرے بہت سے تحائف چن قلیچ خاں کے ذریعہ اس تک پہنچانے کے لیے سپرد کئے گئے۔ منصور خاں سے جو داروغہ توپ خانہ دکن تھا فیروز جنگ کی آمد تک اورنگ آباد کی نگہداشت کے لیے کہا گیا۔[38]

محمد امین خاں بھی برہان پور سے ایک دو منزل سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے فوج کے پچھلے دستوں کو لوٹ لیا جبکہ فوج داؤ دنگر کے پہاڑی مقامات سے گزر رہی تھی اور اس کے بعد وہ برہان پور لوٹ گیا۔ بہت سے سپاہی بھی باغی ہو گئے جن کو دکن میں بھرتی کیا گیا تھا۔ بعد ازاں محمد امین اورنگ آباد کے مقام پر چن قلیچ خاں سے مل گیا جہاں ان دونوں نے ملکر بہت سے اضلاع پر قبضہ کر لیا۔[39]

نہ صرف فیروز جنگ اور چن قلیچ خاں بلکہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں بھی دکن چھوڑ کر اعظم شاہ کے ساتھ چلنے کو تیار نہ تھے اور انھوں نے اعظم شاہ سے پر زور درخواست کی کہ انھیں دکن ہی میں چھوڑ دیا جائے اور اس کا سبب یہ بتایا کہ وہ مرہٹوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکیں گے۔[40]

ارادت خاں نے ان امراء اور دیگر امراء کی بددلی کو اعظم کے مجنونانہ غرور پر محمول کیا ہے جس کے سبب وہ دوسروں کے صلاح و مشورے کو خاطر میں نہ لاتا تھا نیز اس کے شیعی رجحانات اور تنخواہوں

میں اضافوں اور ترقیوں میں بخل کو بھی اس کا سبب بتایا ہے[41] لیکن ارادت خاں کے یہ الزامات کچھ صحیح بنیادوں پر مبنی معلوم نہیں ہوتے جیسا کہ ایک دوسرے ہم عصر مصنف خفی خاں نے لکھا ہے کہ دراصل اس کے یعنی اعظم کے پاس فیاضی کا اظہار کرنے کے لیے دولت نہ تھی[42] دکن کی لڑائیوں میں کثیر دولت خرچ ہو چکی تھی۔ دکن روایتی طور پر ایک خسارہ کا علاقہ تھا۔ اور چونکہ اورنگ زیب کو شاہجہاں کے جمع کردہ خزانے کو خرچ کرنے میں پس و پیش رہتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی حکومت کے آخر ایام میں فوج کی تنخواہ تقریباً تین سال سے واجب الادا چلی آتی تھی اور اب شہنشاہ کی دولت کا خاص ذریعہ بنگال کی مالگزاری کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ جو تھوڑا بہت روپیہ شاہی خزانے سے اعظم کو حاصل ہوا وہ سپاہیوں کی واجب الادا تنخواہیں دینے میں خرچ ہو گیا[43]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتاً فوقتاً جو تلخ کلامی اور بدمزاجی اعظم سے سرزد ہوتی تھی اس کے سبب اس کے بہت سے ہم نوا اور مددگار اس سے علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ اگرچہ امراء میں سے کوئی اعظم سے روپیہ اور ترقی وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا وہ اپنے مغرورانہ اور تحکمانہ انداز میں تیکھے جواب دیتا تھا کہ اس کی فوج کو کسی چیز کی ضرورت نہ تھی بجز اس کے کہ مخالف گروہوں کا خوف و ہراس[44]۔ بہرحال دربار میں دونوں مخصوص گروہوں کے سرداروں کا خانہ جنگی میں حصہ لینے سے پس و پیش، دکن سے مراجعت نہ کرنے کی ان کی شدید خواہش اور ان کے ساتھ ساتھ دکنی افواج کی علیحدگی ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں کی دلچسپیوں کا مرکز صرف دکن ہی بن کر رہ گیا تھا اور یہ آئندہ کے لیے ایک خطرہ کا نشان تھا کہ اہل دکن شمالی ہند کو ایک دوسرا ملک تصور کرتے تھے اور مغلوں کی حکومت کو غیر ملکیوں کی حکومت سمجھتے تھے۔ اس لیے مرکزی حکومت میں کمزوری کے موقع پر دکن میں آزاد اور خود مختار حکومتوں یا سلطنتوں کی تحریک کا زور پکڑ جانا یقینی اور فطری تھا۔

اعظم کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں اگر وہ سب سے پہلے آگرہ پہنچ جاتا اور اس پر قابض ہو جاتا کیونکہ یہاں (آگرہ میں) شاہ جہاں کے خزانوں کا بہت سا حصہ موجود تھا لیکن کوئی ایک فرد واحد بھی ایسا نہ تھا جس کو اس میں شک تھا کہ[45] اعظم شاہ کی لاکھ رکاوٹوں اور پشاور کے فاصلہ کے باوجود شاہ عالم اس سے قبل ہی آگرہ آ پہنچے گا۔ اعظم آگرہ پر اپنا قبضہ جما لیتا اگر اس نے اپنے فرزند بیدار بخت کو جو احمد آباد کا گورنر تھا آگرہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا ہوتا لیکن اعظم کے دماغ کو بیدار بخت کے سلسلے میں زہر آلود کر دیا گیا تھا اور اس کو یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ خود بیدار بخت تخت شاہی پر بیٹھنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس لیے اعظم نے بیدار بخت کو مالوہ کی

میں منتظر رہنے کا حکم دیا۔ جب تک کہ وہ دکن سے نہ آجائے۔ بیدار بخت نے اعظم کا مالوہ میں ایک مہینہ اٹھائیس دن انتظار کیا۔ دریں اثنا شاہ عالم کا تیسرا بیٹا عظیم الشان جس کو کہ اورنگ زیب نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے بہار سے واپس بلا لیا تھا، آگرہ پہنچ گیا۔ قلعہ کے حاکم باقی خان نے جو بیدار بخت کا خسر تھا، قلعہ کو سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ تخت کے دعویداروں میں سے ایک خود وہاں پہنچ گیا۔ چونکہ شاہ عالم کی قبل از وقت آمد متوقع تھی اس لیے آگرہ بآسانی اس کے قبضہ میں آگیا۔

محمد معظم ملقب بہ شاہ عالم، اورنگ زیب کی وفات کے وقت کابل اور لاہور کا گورنر تھا۔ علاوہ ازیں، ملتان کی گورنری بھی اسی کے سب سے بڑے بیٹے جہاندار شاہ کے سپرد تھی۔ دوسرا بیٹا عظیم الشان، بنگال اور بہار کا گورنر تھا ان صوبوں کے ذرائع آمد اور پنجاب اور افغانستان کے فوجی اڈوں پر صاحب اختیار ہونے کے سبب سے شاہ عالم تخت کے دوسرے دعوے دار اعظم سے طاقت آزمائی کے لیے زیادہ تیار تھا۔ اگرچہ موخرالذکر اس کے لیے محض حقارت کے جذبات رکھتا تھا اور اسے ا ہانتاً بقال (یعنی دکاندار) کہہ کر یاد کیا کرتا تھا۔ دور دراز کابل میں شاہی دربار سے اس کی جلاوطنی پردۂ زحمت میں رحمت ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس نے اپنے گرد قابل اعتماد معاونین کو جمع کر لیا تھا اور بار بار کی آمد ورفت سے اپنی افواج کو فوجی نقل وحرکت کی مشق کراتا رہا یہاں تک کہ کسی بھی سقف والے مکان میں سونے سے اس کو وحشت سی ہونے لگتی تھی اس کی یہ عادت زندگی بھر جاری رہی 1703 میں خوش قسمتی سے اسے ایک گمنام سردار اور امیر منعم خاں کی خدمات میسر آگئیں جو امور مالیات کا ماہر تھا اور شاہ عالم کی نمائندہ کی حیثیت سے جلد ہی اس کی مالیات کو صحیح کر دیا۔ شاہ عالم کی سفارش پر منعم خاں کو کابل کا دیوان مقرر کر دیا گیا اور پنجاب کا نائب صوبے دار بھی اور پندرہ سو سے کر ہزار کے عہدے پر فائز کیا۔[46] خانہ جنگی کے احتمال کے پیش نظر منعم خان نے شاہ عالم کے لیے کچھ خزانۂ جنگ جمع کر لیا اور خاموشی سے اونٹ اور نرگاؤ وغیرہ توپ خانہ کھینچنے کے لیے مہیا کر لیے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ کشتیاں بھی فراہم کر لیں تاکہ پشاور اور لاہور کے درمیان دریاؤں کو عبور کیا جا سکے۔[47]

شاہ عالم کو اورنگ زیب کی رحلت کی خبر 20 مارچ 1707ء کو پشاور کے قریب جام رود کے مقام پر ملی، منعم خاں کی تیاریوں کی رو سے وہ کافی سرعت کے ساتھ لاہور اور لاہور سے دہلی تک پہنچتا چلا گیا۔ لاہور کے خزانے سے اسے 28 لاکھ اور دہلی کے خزانے سے 30 لاکھ روپیہ ستنیا

ہوئے جس سے اس کو اپنے سپاہیوں کی ادائیگی کرنے میں بہت مدد ملی۔ اتنے پر بھی کہا جاتا ہے کہ بہت سے سپاہی ناخوش رہے اور ان کو سخت تنگی ترشی کا سامنا کرنا پڑا[49] یہاں تک کہ 12 جون کو وہ آگرہ پہنچ گیا۔ قلعہ کے حاکم باقی خاں نے شاہ عالم کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور قلعہ کی کنجیاں اس کو پیش کر دیں۔ شاہ عالم نے شاہ جہاں کے خزانے سے دو کروڑ حاصل کر کے اپنے اعوان و انصار میں تقسیم کر دیئے۔

جب اعظم گوالیار پہنچا اس کو خبر ملی کہ اس کے حریف نے آگرہ پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ بوکھلا اٹھا۔ اس نے طے کیا کہ اپنے وزیر اسد خاں کو گوالیار میں حرم سرا اور دیگر غیر ضروری ساز و سامان جواہرات اور خزانوں کے ہمراہ چھوڑ کر فوراً آگرہ کا رخ کرے۔

دونوں حریف 18 جون 1707 کو جاجو کے میدان میں ساموگڑھ کے قریب مد مقابل ہوئے اعظم کی افواج بلاشک شاہ عالم کی افواج کی بہ نسبت ہر طرح کم تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اعظم پینتیس ہزار موجودی سوارے کر گوالیار پہنچا تھا اور اس کے سواروں کی تعداد وہاں پہنچتے پہنچتے پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی[49] اور اس کے علاوہ توپ خانہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ شاہ عالم کے ساتھ مورخین نے ایک لاکھ پچاس ہزار سواروں کی تعداد بتائی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصل تعداد اس سے کچھ کم ہی ہو[50] علاوہ اس برتری اور فوقیت کے جو اسے اتنی بڑی تعداد اتنے زبردست خزانے کے سبب حاصل تھی شاہ عالم اپنی طاقت میں ان بھاری توپوں سے بھی اضافہ کر چکا تھا جو اسے آگرہ کے قلعے سے حاصل ہوئیں تھیں۔ جبکہ دوسری طرف اعظم کو اپنا بھاری توپ خانہ دکن اور گوالیار ہی میں چھوڑ دینا پڑا تھا تاکہ وہ جلد از جلد پیش قدمی کر سکے[51] اس کی فوج سخت ترین تکان اور موسم گرما کی بدترین مصائب سے بھی دوچار ہو چکی تھی۔ اس لیے ہر طرح فتح اعظم کی دسترس سے باہر تھی۔ جاجو کی جنگ درحقیقت اس کے لیے ایک جوئے کی بازی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ حریف کو اچانک آلے گا اور شاہ عالم کے سنبھلنے سے قبل ہی ایک بھرپور وار کر سکے گا۔ شاید اسی سبب سے وہ کارگر حملے کا کوئی مناسب منصوبہ مرتب نہ کر سکا۔ اس کے بجائے وہ بے باکانہ آگے بڑھتا رہا۔ جس طرح کہ ایک خوفناک شیر بھیڑوں کے جھنڈ پر جھپٹ پڑتا ہے[52]

اعظم کو ابتدائی مڈبھیڑ میں کچھ برتری حاصل ہوئی لیکن وہ غلطی سے اس کو شاہ عالم کی فوج کا خاص دستہ سمجھ بیٹھا جبکہ وہ دستہ شاہ عالم کی فوج کا محض ہراول دستہ تھا۔ جیسے ہی شاہ عالم کی مخصوص افواج نے جنگ میں شمولیت کی، اعظم کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ شاہ عالم کے توپ خانے

نے اس کی افواج میں تباہی مچادی۔ معتقد وسرکردہ امراء شاہزادہ بیدار بخت اور اس کا بھائی والا جان لقمۂ اجل بن گئے۔ ذوالفقار کو بھی کچھ ضرب پہنچی۔ اس یقین کے بعد کہ میدان اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور فتح کی کوئی امید باقی نہیں وہ اعظم شاہ کے پاس حاضر ہوا اور اس کو بھاگ نکلنے کی صلاح دی تاکہ اگر زندہ رہے تو کسی اور موقع پر قسمت آزمائی کی جاسکے۔[53] لیکن اعظم نے انکار کردیا کیونکہ شاید دارا کا انجام اس کے ذہن میں تھا۔ اور اس نے اپنی زندگی کا مہنگا سودا کرنا منظور کیا وہ تین سو سے چار سو سواروں کے ساتھ جو اس کے ساتھ تھے جنگ کرتا ہی رہا۔ حمیدالدین خاں کے ہمراہ ذوالفقار گوالیار کو چلا گیا اور دیگر لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ انجام یہ ہوا کہ اعظم ایک تیر سے گھائل ہو گیا۔ رستم دل نے اس کا سر قلم کرلیا اور اسے لے کر شاہ عالم کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ذوالفقار خاں نے جو اپنے حاکم اور بادشاہ کے ساتھ آخر تک وفادار رہنے اور لڑنے سے انکار کیا! اس پر متعدد معاصرین نے سختی سے رائے زنی کی ہے، کچھ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اس کا فرار ہونا ہی اعظم کی شکست کا خاص سبب تھا۔[54] اگرچہ یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں، تاہم اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ذوالفقار خاں کا عمل وفاداری کے ہر معیار کے برعکس تھا اور اس سے ذوالفقار خاں پر "خود غرض اور ناقابل اعتماد" ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے۔

ولیعہدی کی جنگ نے سلطنت کو مزید کمزور کر دیا۔ تقریباً دس ہزار نفوس اور متعدد ایسے جری تجربہ کار معتمد امراء جاں بحق ہوئے جو مرہٹوں کے خلاف مہم میں عظیم شہرت حاصل کر چکے تھے دلپت بندیلہ اور رام سنگھ ہاڑا جو ذوالفقار خاں کے دست راست تھے وہ بھی میدان جنگ میں کام آگئے۔ دونوں حریفوں خاص طور پر شاہ عالم نے افواج اور امراء کو پیش قیمت تحائف اور زر مال بخشے تاکہ ان کی اعانت حاصل رہے۔ اس طرح ان دونوں نے حکومت کی حالت کو مزید صدمہ پہنچایا جو کہ پہلے ہی خراب ہو گئی تھی۔[55]

مرہٹوں اور راجپوتوں کے واقعات

اب ہم اعظم شاہ کے ان دو زبردست تاریخی اقدامات کا جائزہ لیں گے جو اس نے شکست سے پہلے کئے۔ نرمدا کے قریب دوراہا کے مقام پر شاہو کو فرار ہونے کا موقع دیا گیا۔ یہ ایک متنازعہ امر ہے کہ آیا وہ از خود فرار ہو گیا یا اس کی رہائی کسی سازش کا نتیجہ تھی۔[56] دورِ جدید کے کچھ مورخین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اعظم نے شاہو کے ساتھ ایک فتح نامہ پر دستخط کئے اور اس کو

چوتھ اور سردیش مکھی کے دکنی علاقے اور شیواجی کا سوراج بھی بخش دیا اور دیگر متعدد مراعات بھی دینا منظور کیں۔[57] اس بیان کی صداقت نہ صرف مشکوک اور غیر مستند ہے بلکہ ان مبالغہ آمیز مراعات کا کوئی بدیہی سبب نہیں معلوم ہوتا خصوصاً ایک ایسے نظر بند سردار کے لیے جس کو انفرادی طور پر مرہٹہ سرداروں کی حمایت حاصل نہ تھی۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہو کا پیچھا کرنے کا کوئی حکم جاری نہیں کیا گیا اور دکن کے شاہی دفاتر کو شاہو کے سلسلے میں کسی قسم کے فرمان جاری ہی نہیں کیے۔ یہ بات اس مفروضہ کو کمزور کرتی ہے کہ شاہو از خود فرار ہو گیا درحقیقت شاہو نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ ایک شاہی فرمان کی تعمیل میں رہا کیا گیا ہے اس لیے آزادانہ احمد نگر کے قریب اورنگ زیب کے مزار پر حاضری دی اور شاہی افواج نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔[58]

مندرجہ بالا ان حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ شاہو کی رہائی ایک سازش تھی، جس کے پیچھے مصلحت اور حکمت عملی دونوں ہی کارفرما تھیں۔ اس کی رہائی سے اعظم کی غیر موجودگی میں مرہٹے منقسم اور غیر متحد رہے اور اگر وہ مرہٹوں کا حکمراں بننے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے ذریعہ مرہٹوں سے ایک صلح نامہ مرتب ہو جانے کی توقع بھی نظر آتی تھی۔ بقول خفی خاں یہ قدم ذوالفقار خاں کے اشارے پر اٹھایا گیا تھا جو شاہو سے بہت زیادہ قریب تھا اور ایک عرصہ سے اس کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا۔[59]

دوسرے یہ کہ ذوالفقار ہی کے اشارے پر سات ہزاری سات ہزاری کے منصب اور مرزا راجہ اور مہاراجہ کے خطابات جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو عطا کیے گئے۔ دونوں راجاؤں سے کثیر افواج کے ذریعہ اعظم کی مدد کرنے کو کہا گیا اور جے سنگھ شاہزادہ بیدار بخت کے ساتھ مالوہ کے مقام پر آکر شریک بھی ہو گیا تھا۔ دونوں راجاؤں سے اس بات پر بھی گفتگو شروع ہو گئی تھی کہ انکا وطن مالوف ان کو واپس کر دیا جائے۔ اور ان سے ایسی مراعات کا بھی وعدہ کیا گیا تھا جن کا ان کے آباء واجداد نے تصور بھی نہ کیا تھا۔[60] یہ دو اقدامات اگرچہ خانہ جنگی کی ضرورت کے پیش نظر اٹھائے گئے تاہم یہ اورنگ زیب کی پالیسی سے گریز کی ضرور نشاندہی کرتے ہیں۔ شاید اعظم اور ذوالفقار کی نگاہوں میں اورنگ زیب کی سخت گیری کی پالیسی ناکام ثابت ہو چکی تھی، ان کے ان اقدامات سے کسی ایسی نرم پالیسی کا امکان ظاہر ہوتا تھا جو راجپوت مرہٹوں اور مغلوں کی حکومت کے درمیان کی خلیج کو دور کر سکے۔ اعظم کی زندگی نے اتنی وفا نہ کی کہ وہ اس پالیسی کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچا دیتا۔ اب یہ کام شاہ عالم کے کاندھوں پر آپڑا تھا اور مغلیہ سلطنت کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی ذمہ داری (شاہ عالم) پر تھی۔

حاشیہ

باب اوّل

32:- شاہزادوں کی اوائل عمر کی سوانح کے لیے، دیکھئے مصنف سرکار کی "اورنگ زیب کا دورِ حکومت" از صفحہ 46 تا صفحہ 129۔ سب سے بڑا فرزند محمد سلطان 1639ء میں اس کی ہندو ملکہ نواب بائی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کو 1659ء میں شجاع سے مل جانے کے جرم میں قید کردیا گیا تھا اور وہ قید ہی میں 1676 میں لقمۂ اجل بن گیا۔ جو لڑکے زندہ بچے ان میں سے محمد معظم نواب بائی کے بطن سے 1643ء میں پیدا ہوا۔ اعظم دل بانو بیگم سے 1653ء میں اور کام بخش اودے پوری محل کے بطن سے 1670ء میں پیدا ہوا۔

33:- خفی خاں (خ۔ خ) صفحہ 547 ذوالفقار خاں کو اعظم کی سفارش پر "ماہی مراتب" (مچھلی کا نشان) بخشا گیا تھا۔ اگرچہ اصول یہ تھا کہ یہ نشان چھ ہزار والے منصب سے نیچے کے منصبدار کو نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اعظم کی سفارش پر ہی اس کو سپہ سالار بھی مقرر کر دیا گیا۔ رقعات 6 رادت 14 معاصر الامرا مصنفہ شاہ نواز خاں جلد 1 صفحہ 310۔

34:- معاصر عالمگیر مصنفہ ساقی مستعد خاں صفحہ 520 خفی خاں جلد 2 صفحات 547 48 نسخۂ دل کشا مصنفہ بھیم سین صفحہ 158- جے پور کی وکیل کی رپورٹ کے مطابق (جے پور ایکارڈس) 26 ۔ذی قعدہ سال 51- 26 مطابق فروری 1707 معلوم یہ ہوتا ہے کہ اعظم تمام دکھال دکن کے علاقے کا دعویدار تھا (تما دکن اعظم است) اور وہ مالوہ کو بڑی دل برداشتگی سے رخصت ہوا۔

35:- اخبارات :- ذوالفقار خاں کے شریک ہونے کی تاریخ 29 ذی الحجہ مطابق 9 اپریل 1707 ہے۔

36:- اخبارات کے مطابق 10، 25 ذی الحجہ مطابق 29 مارچ 1701 ۔ خفی خاں صفحہ 572 ۔ نسخۂ دلکشا 158 ب 162 الف ۔کام ورنے 5 ہزار منصب کا ذکر کیا ہے۔

37:- معاصر الامرا جلد 3 صفحہ 877

38:- اخبارات ۔ 4 محرم مطابق 29 مارچ، خفی خاں صفحہ 572۔ قاسم کا ظفرنامہ بہادرشاہ

39 :۔ خفی خاں صفحہ 522 اعظم نے اس کا پیچھا کرنے کے متعدد مواقع سے منہ موڑ لیا اور صرف اس مسئلہ پر فیروز جنگ اور چن قلیچ خاں کو فرمان بھیجنے پر قناعت کی۔

40 :۔ دل کشا۔ 162 الف، اعظم الحرب 188 تا 192 ؛ اخبارات 27 محرم مطابق 30 اپریل کام در۔

41 :۔ ارادت 11 12 کام در جب سے اعظم دوران علالت 1693 میں ایک امامیہ فقیر کے زیر اثر آگیا تھا۔ تب سے اس کے بارے میں شیعی رجحانات کا شبہ پیدا ہونے لگا تھا (اورنگ زیب جلد 5 صفحہ 363 ج) اس نے نماز جمعہ ترک کر دی تھی اور نصف سے زیادہ اس کی فوج شیعہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

42 :۔ خفی خاں صفحہ 521، 583

43 :۔ اسد خاں نے اعظم کو اطلاع دی کہ خزانہ رکاب میں صرف 52 لاکھ نقد اور 13 لاکھ سونے کی اشرفیاں جبکہ سپاہیوں کی تنخواہ تقریباً ایک کروڑ کے قریب الادا تھی۔ اعظم خاں نے کہا کہ کل رقم سے سپاہیوں کی ادائیگی کی جائے تاکہ وہ خدا کو منہ دکھا سکے اور مرحوم شہنشاہ (اورنگ زیب) کے قرضوں سے سبکدوش ہو سکے (خوش حال صفحہ 8، 9)۔

44 ۔ خفی خاں صفحہ 581، 583

45 ۔ خفی خاں اردو نے جلد اول صفحہ 19 پر اس اقتباس کو غلط سمجھا ہے اور اسی لیے بالکل اس کے برعکس تحریر کیا ہے۔

46 ۔ منعم خاں کے حالات زندگی کے لیے دیکھئے معاصر الامرا مصنفہ شاہ نواز خاں جلد صفحہ 576 اور کتاب ہذا کا باب 2 جو آگے آتا ہے۔

47 ۔ ارادت و خفی خاں صفحہ 573

48 ۔ چہار گلزار شجاعی مصنفہ ہرچرن صفحہ 17

49 ۔ خفی خاں صفحہ 583 جاجو سے قبل کل افواج کی تعداد 65000 گھوڑے اور 45 ہزار پیدل کی قوت کا مظہر تھی۔

50 ۔ ویلنسٹائن صفحہ 276 ، نسخہ دلکشا از بھیم سین صفحہ 164 ۔ الف

51 ۔ نسخہ دل کشا صفحہ 162 الف ۔ اعظم نے ایک خاص انداز سے فاخرانہ طور پر اعلان

کیاکہ توپ خانے کی مدد سے جنگ کرنا بہادری کے خلاف ہے اس لیے وہ اب صرف تلواروں کے ذریعہ ہی جنگ کرے گا۔

52۔ ارادت۔

53 ۔ خفی خاں صفحہ 596

54 ۔ چنانچہ دانش مندخاں اور بھیم سین کا یہ خیال ہے کہ "اگر اپنی وفاداری کے تقاضے کے ماتحت نصرت جنگ دوسرے سرداروں کو ساتھ لے کر حملہ میں شرکت کرلیتا اور اگر ذوالفقار کے لیے بھی ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا تو اعظم شاہ کے اوپر جو مصائب کے پہاڑ گرے وہ خارج از امکان ہوجاتے۔" بہادر شاہ نامہ از نعمت خاں عالی (دانش مندخاں) وہ نسخۂ دل کشا از بھیم سین (نولیو)

55۔ خفی خاں صفحہ 576 پر لکھتا ہے کہ شاہ جہاں کے پس انداز کردہ 24 کروڑ میں سے علاوہ چاندی و سونے کے ظروف کے 9 کروڑ تو قلعہ آگرہ ہی میں سے دستیاب ہوئے تھے یا ایک دوسرے بیان کے مطابق تفصیل اس طرح ہے۔ 13 کروڑ نقد جس میں 100 تولہ سے لے کر تین سو تولے تک کی اشرفیاں شامل تھیں اور جو خصوصاً تحفہ تحائف کے استعمال کے لیے بنائی گئی تھیں اور اکبر کے دور حکومت کی 12 ماشہ اور 13 ماشہ کی مزید اشرفیاں بھی موجود تھیں۔

باب دوم

مفاہمت یا جبر (الف)

بہادر شاہ

تخت نشینی کے بعد، بہادر شاہ (شاہ عالم) کو مجبوراً ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو اورنگ زیب سے اس کے جانشینوں کو بطور وراثت ملے تھے۔ مثلاً بگڑی ہوئی مالی حالت، جاگیرداری نظام کے عمل درآمد میں زبردست نقائص کے نتیجے میں امراء کی اخلاقی پستی، ہندو اور مسلمانوں میں ایسے خیالات کی تحریک جو باہمی اختلافات اور شکوک وشبہات کو ہوا دے رہے تھے۔ نظم ونسق کے نفاذ، عام مسائل خصوصاً دکن میں جہاں، مرہٹے مغلوں کے لیے ایک دردسر بن گئے تھے، سکھوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا تصادم مرہٹوں اور سیوڈیاوں کے ساتھ روزافزوں اختلافات اور ان سب کے مجموعی نتائج جو شہنشاہیت کی عظمت وحرمت پر اثرانداز ہو رہے تھے خصوصاً امراء پر جو حکومت کی بڑھتی ہوئی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اپنے اثرات میں اضافہ کرنے کے مواقع تلاش کر رہے تھے۔

درپیش حالات اور اپنی افتاد طبیعت کے پیش نظر ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہادر شاہ نے سمجھوتے اور مصالحت کی پالیسی اختیار کی۔

بہادر شاہ نے اپنے والد ماجد اورنگ زیب کی مذہبی عصبیت کی پالیسی کو اختیار نہیں کیا اگرچہ وہ خود ایک مذہبی رجحان رکھتا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبھی کسی درویش کے پاس حاضر ہونے اور اس سے ملنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا، اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح وہ بھی تصوف کا قائل معلوم ہوتا تھا اور اس کے بارے میں شیعی رجحانات کا کبھی شک بھی نہ تھا۔ وہ ایک ہندو ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور مغلوں کی روایات کے مطابق اس کی شادی بھی ہندو گھرانے ہی میں ہوئی تھی۔ لیکن بایں ہمہ یہ کہنا قدرے دشوار ہے کہ کیا یہ تمام امور اس کے سیاسی اور مذہبی نظریات پر اثرانداز ہوئے یا نہیں۔ معاصر مورخین اس نظریئے کی طرف مائل نہیں معلوم ہوتے کہ بہادر شاہ کی سیاسی حکمت عملی کسی قابل لحاظ حد تک اس کے مذہبی نظریات سے متاثر تھی۔ البتہ اس کی تخت نشینی کے ساتھ

ہی حکومت کی مذہبی عصبیت کا ضرر رخاتمہ ہوگیا۔

شہزادگی کے زمانے میں بہادر شاہ کے سیاسی نظریات کا معاصر مورخین کو کوئی علم نہیں تھا اس نے متعدد بار دکن کی نیابت کی ذمہ داری سنبھالی لیکن اس کی مصالح سیاسی اور نظم ونسق پر گرفت سے شہنشاہ غیر مطمئن تھا اور اس کی پالیسیوں کو کمزور اور غیر مستحکم سمجھتا تھا اسی وجہ سے اس نے بہادر شاہ کو کبھی بھی کسی طویل عرصہ کے لیے دکن کی خود مختارانہ ذمہ داری نہیں سونپی[3]۔ بیجاپور اور گولکنڈہ پر آخری اقدامات کے زمانے میں اس پر گولکنڈہ کے حکمراں ابوالحسن کے ساتھ سازش کے الزامات عائد کئے گئے اور شہنشاہ نے اس کے نتیجے میں اس کو حراست میں بھی رکھا۔ خفی خاں کے بقول جس نے ان واقعات کے چالیس برس بعد اپنے تاثرات سپرد قلم کیے ہیں شہزادہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کو ایک قسم کی بدعہدی سمجھتا تھا اور اس کا خواہشمند تھا کہ صلح اور جنگ اس کی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ وہ ولی عہد تھا اور امکانی حد تک وہ ابوالحسن کو اپنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنانا چاہتا تھا انھیں وجوہات کی بنا پر وہ اپنے تاثرات اپنے بڑے شہنشاہ[4] ابوالحسن کے لیے معافی نامہ منظور کرانا چاہتا تھا بہادر شاہ کو 1695ء تک حراست میں رکھا گیا تھا۔ پھر اس کو شمال ہند میں آگرہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ بعدازاں ملتان کی گورنری پر اس کا تقرر ہوگیا۔ 1698 میں اس کو کابل کا گورنر مقرر کیا گیا اور خصوصاً ہندوستان اور فارس کی سرحد کی نگہداشت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی 1700ء میں پنجاب کی گورنری کے لیے بھی اسکو نامزد کیا گیا۔ اس طرح اورنگ زیب کی حکومت کے ایک نہایت اہم دور میں بہادر شاہ مرکزی حکومت کے نظم ونسق کے سباق وسباق سے غیر متعلق سا رہا راجپوتوں کے سلسلے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ 1681ء میں بہادر شاہ نے میواڑ کے رانا کے ساتھ ایک خفیہ صلح نامہ کر رکھا تھا جس کے مطابق اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جانشینی کی جنگ میں شریک ہوا تو وہ جزیہ کو ختم کر دیگا اور راجپوتوں کو دوسری اور بہت سی مراعات بھی دے گا بشرطیکہ وہ اس کو فوجی امداد بہم پہنچائیں۔ پتہ یہ چلتا ہے کہ اس قسم کے صلح نامے اعظم اور شہزادہ اکبر کے اور بہت سے راجپوتوں سرداروں کے مابین بھی طے پا چکے تھے[5]۔ اگر ایک طرف اس وقت کے حالات کے پیش نظر راجپوتوں کی سیاسی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ سب ہی شاہزادے ان کو اپنی طرف مائل کرنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے خواہاں تھے لیکن دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ راجپوتوں کی آپس کی نااتفاقی اور پھوٹ نے ان کی دوستی کی قیمت گھٹا دی تھی۔ امتداد کے ساتھ ان صلحناموں اور عہد وعدوں کی قیمت بھی کم ہوتی گئی اور جانشینی کی جنگ کے دوران بہادر شاہ کو

راجپوتانہ کے حکمراں سرداروں سے کوئی مدد حاصل نہ ہوئی۔

جن حالات کا اوپر حوالہ دیا گیا وہ ان امور کے ذمہ دار معلوم پڑتے ہیں جن کے سبب راجپوتوں اور مرہٹوں کے مسائل کے سلسلے میں بہادر شاہ کے نظریات میں استحکام نہ تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں اس کی پالیسی تجربہ اور اس کے نتیجہ میں ناہموار اقدامات کی رہی اور اس کا مقصد یہ رہا کہ مصلحت اور احتیاط کے ساتھ اہم مسائل اور تنازعات کو مصالحت کی روشنی میں حل کیا جاسکے۔

بہادر شاہ کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ ممتاز عہدہ داروں کے انتخاب اور مصالحت کا تھا۔ اعظم کو شکست دینے کے بعد، بہادر شاہ نے اعلان کر دیا کہ وہ کسی شخص کو صرف اس لیے مجرم نہ قرار دے گا کہ اس نے اعظم کا ساتھ دیا۔ کیونکہ اس نے اس کو تسلیم کیا کہ اگر خود اس کے اپنے بیٹے بھی دکن میں ہوتے تو وہ بھی حالات کے تحت اعظم کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے۔ چنانچہ جنھوں نے فوری طور پر خود کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کو ملازمت دینے کے وعدے کیے گئے اور ان کو اورنگ زیب کے عطا کردہ منصوبوں کی بحالی کا بھی یقین دلایا گیا۔[6] گوار لیار میں اسد خاں ذوالفقار خاں اور دوسرے بہت سوں کو یقین دہانی کے خطوط روانہ کیے گئے اور ان کو دربار میں آنے کی دعوت دی گئی اور دکن سے غازی الدین خاں فیروز جنگ، چن قلیچ خاں اور محمد امین خاں کو طلب کیا گیا۔[7] شکست خوردہ حریفوں کے معاونین کو سزا نہ دینے کی پالیسی ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی روایات کے عین مطابق تھی۔ نیز یہ پالیسی حکومت کے مفاد میں اور انفرادی طور پر بہادر شاہ کے مفاد میں بھی تھی۔ اس سے بہادر شاہ کے لیے پرانے عالمگیری امراء کی وفاداری حاصل ہو گئی اور اس طرح کام بخش بھی تنہا رہ گیا جو ابھی تک بیجاپور اور حیدرآباد کو اپنی کمزور گرفت میں لیے ہوئے تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب جانشینی کی جنگ کو ختم ہی سمجھا جانے لگا تھا۔ اور یہ یقین کیا جانے لگا تھا کہ کام بخش کی شکست کسی لمحہ بھی رونما ہو سکتی ہے قدیم عالم گیری امراء کی خواہشات اور توقعات کو خود اپنے معاونین کے مطالبات کیساتھ منضبط کرنا بہادر شاہ کی حکمت عملی کے لیے ایک سخت امتحان تھا۔ اورنگ زیب کی نام نہاد وصیت میں جس کو بہادر شاہ بظاہر صحیح مانتا تھا اور جو اسے جاجو کی جنگ کے موقع پر تسلیم کیے جانے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ شاہزادگان سے ایک یہ اہم وصیت کی گئی تھی کہ خواہ کوئی شاہزادہ تخت نشینی میں کامیاب ہو، اسد خاں کو بہرحال اور بالضرور وزارت پہ قایم رکھے اس سفارش کی بنا پر نیز اس کے ساتھ خاندانی تعلقات اور اپنی خدمات اور تجربات کی بنا پر اسد خاں وزارت کا دعویدار ہوا اور میر بخشی کا عہدہ اپنے فرزند ذوالفقار علی خاں کے لیے طلب کیا۔ اس کے مطالبات

کی جہاں شاہ نے بھی تائید کی جہان شاہ اس وقت باپ کا بہت چہیتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بیگمات نے بھی اسی کے حق کی حمایت کی۔[8]

بادشاہ کو ذوالفقار خاں کے حق کو تسلیم کرنے میں تو کوئی قباحت ہی نہ تھی کیونکہ اس نے اس کو سات ہزار سات ہزار کے منصب پر فائز کیا تھا اور میر بخشی کا عہدہ دینا بھی اسی کے لیے قبول کر لیا تھا لیکن وزارت کا تو اس نے پہلے ہی سے اپنے معتمد اور وفادار اور آزمودہ امیر منعم خاں سے وعدہ کر رکھا تھا جس کی خدمات تخت و تاج کے حصول کو ممکن بنانے کے سلسلہ میں پہلے ہی بیان کی جا چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہادر شاہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں جیسے دو لائق اور با اثر امراء کو بھی اپنے سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس دشواری کا ایک حل اس طرح نکالا گیا کہ منعم خاں کو تو وزارت سونپی گئی اور اسد خاں کو وکیل مطلق کا وہ قدیم عہدہ سپرد کیا گیا جو شاہ جہاں کے عہد میں آصف خاں کے بعد کسی کے بھی حصہ میں نہ آیا تھا۔ اس عہدہ کو اعظم خاں نے بظاہر تو قبول کر لیا لیکن خفیہ طور پر اس نے ایک عرضداشت پیش کی جس میں وہ تمام حقوق اور مناصب اسد خاں نے اپنے لیے طلب کیے تھے جو آصف خاں کو مخصوص طور پر حاصل تھے۔ ان خصوصی حقوق کا مطلب یہ تھا کہ اس کے دربار میں سب کے سب امراء مع وزیر اعظم پیش ہوا کریں اور اس کے دستخطوں کے لیے وہ تمام خطوط پیش ہوں جو صوبہ داروں، فوجداروں اور دیوانوں وغیرہ کی تقرری علیحدگی اور منتقلی سے متعلق ہوں ایک نقل ان تمام خبر ناموں اور رپورٹوں کی اس کو پیش کی جائے جو صوبے داروں اور دیوان صاحبان کی بھیجی ہوئی ہوں۔ اور وہ شاہی مہر بھی اس کے قبضہ میں ہو جو تمام فرمانوں پر لگائی جاتی ہے اس کے علاوہ اس نے کچھ اور انفرادی امتیازات بھی طلب کئے مثلاً نو ہزار نو ہزار کا منصب 'تورغ' نومان' لاہور کی گورنری، دیوان عام میں بیٹھنے کا حق اور شاہزادگان کے بعد اپنے نقارے بجانے کا بھی اس کو حق عطا کیا جائے۔[9]

بہادر شاہ کو اسد خاں کے ان فلک بوس مطالبات سے سخت فکر لاحق ہوئی لیکن اس کو خوش کرنے کی غرض سے اس نے اس کے تقریباً سبھی مطالبات تسلیم کر لیے۔ سوائے نو ہزار منصب کے اور دیوان عام میں بیٹھنے کے اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ یہ آخری دو حقوق آصف خاں کو اس لیے عطا ہوئے تھے کہ وہ شہنشاہ کا رشتہ دار تھا اس لیے اسد خاں کو آٹھ ہزاری منصب دیا گیا نیز اسے آصف الدولہ کے خطاب سے بھی ملقب کیا گیا۔ منعم خاں کو وزارت کا قلمدان سونپا گیا اور اسے سات

ہزاری منصب دو دو اسپہ سہ اسپہ اور ایک کروڑ دام انعام عطا ہوئے اور خان خاناں کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ نیز اپنی غیر حاضری میں آگرہ کی گورنری بھی اسی کو دی گئی۔ اس کے دو بیٹوں یعنی مہابت خاں اور خان زمان کو بالترتیب پانچ ہزاری اور چار ہزاری منصب عطا ہوئے اور مہابت خاں کو بخشی سوم کا عہدہ بھی بخشا گیا اور زیادہ تر امرا اور عہدیداران کو ان کے پچھلے ہی منصوبوں پر برقرار رکھا گیا۔[10] لیکن اس سب کے باوجود مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ پرانے امرا اس لئے خوش نہ تھے چونکہ ایک گمنام امیر یعنی منعم خاں کو وزارت جیسے منصب اعلیٰ پر فائز کیا گیا تھا۔ خصوصاً اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو وزارت نہ ملنے کا بڑا ہی صدمہ تھا۔ دوسری طرف منعم خاں ان شرائط اور قوانین کو ناپسند کرتا تھا جو بظاہر اس کو اسد خاں کا ماتحت قرار دیتے تھے چنانچہ جس روز آصف الدولہ نے بطور دیوان کے اپنا منصب سنبھالا تو خان خانان کے لیے یہ ضروری ہوا کہ وہ اس کی خدمت میں حاضر رہے جس طرح کہ دوسرے وزرا کے لیے بھی لازم تھا اور اس کے دستخط لینا بھی وزیراعظم کے لیے ناگزیر تھا کیونکہ کوئی فرمان آصف الدولہ کے دستخط کے بغیر مکمل نہ ہوسکتا تھا چونکہ منعم خاں اپنے اختیارات میں اسد خاں کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا جب اس لیے جب بھی کوئی اہم وزارتی معاملہ درپیش ہوتا تھا وہ آصف الدولہ کو اس معاملہ کی اطلاع ہی نہ کرتا تھا۔[11]

بالآخر وکیل مطلق کو راستے سے ہٹانے کا ایک بہانہ ہاتھ آ ہی گیا۔ یہ طے پایا کہ چونکہ اسد خاں کو عیش و نشاط کو زندگی بہت عزیز تھی اور وہ معمر بھی ہو چلا تھا اس لیے وہ دہلی چلا جائے اور وہاں سکون کے لمحات گزارے۔ اس فیصلہ کے مطابق اسکو حکم دیا گیا کہ زینت النساء بیگم کو دہلی لے جائے اور اسکو دہلی لاہور اور اجمیر کے صوبوں کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ ذوالفقار خاں کو اپنے والد ماجد کا نائب مقرر کیا گیا لیکن اس استثناء کے ساتھ کہ آصف الدولہ کی مہر تحصیلی کاغذات شہری پروانوں اور سندوں پر وزیر کی مہر کے بعد لگے گی۔ اس کے علاوہ حکومت کے نظم و نسق میں اس کا کوئی دخل نہ رہے گا۔[12] اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد دکن سے چین قلیچ خاں اور محمد امین خاں پہنچ گئے۔ محمد امین خاں کو پانچ ہزاری اور ساڑھے تین ہزاری منصب عطا ہوا اور پہلے تو صدر کے ہی عہدے پر مامور کیا گیا لیکن اس کے فوراً بعد اس کو ہٹا دیا گیا اور مراد آباد اور سنبھل کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ یہ ایک اہم منصب تھا کیونکہ مراد آباد کی فوجداری رقبہ کے لحاظ سے ایک پورے صوبے کے برابر تھی۔[13]

چین قلیچ خان کو چھ ہزاری / چھ ہزاری منصب پر ترقی دے کر فائز کیا گیا نیز اس کو خان دوراں کا خطاب عطا کیا گیا اور اودھ کا گورنر اور گورکھپور کا فوجدار بھی مقرر کیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے

اس منصب کو کچھ پس و پیش کے ساتھ قبول کیا[14] کیونکہ اس کا دل ابھی تک دکن ہی میں پڑا ہوا تھا۔ اور اسی لیے چھ ہفتوں کے بعد اس نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ لیکن منعم خاں کے اشارے پر اس نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا اور اب اس سات ہزاری کے منصب پر ترقی کے ساتھ فائز کیا گیا[15]۔ 1685 میں جو گولکنڈہ کا محاصرہ ہوا تھا اس میں بہادر شاہ کے قید ہونے اور اس کی اہانت کا ذمہ دار فیروز جنگ تھا اس لیے اسے دربار میں حاضر ہونے کے سلسلہ میں سخت تردد تھا۔ اس کی انتہائی رعایت کرتے ہوئے نیز منعم خاں کے اشارے پر اس کو گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا اور اجازت دی گئی کہ وہ شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوئے بغیر اپنا عہدہ سنبھالنے کے لیے روانہ ہو جائے[16] دکن میں کام بخش کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ ابھی سلطنت کا ایک اور دعوے دار موجود ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہاں کے امراء کے ساتھ ایک نرم پالیسی اختیار کی گئی اور اسی لیے فیروز جنگ کے دربار میں حاضر ہونے سے گستاخانہ انکار کو محض اس خوف و ہراس پر محمول کر کے ٹال دیا گیا[17]

اس کے بعد کے عرصہ میں فیروز جنگ، چن قلیچ خان اور محمد امین خاں حکومت کی پالیسی پر کچھ خاص اثر انداز نہ رہے۔ کچھ مصنف نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ شاید منعم خاں اور بہادر شاہ کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے بلش تھی[18] لیکن اس گروہ کی دل شکستگی کا اصل سبب یہ تھا کہ انھیں اپنے حقوق کی پائمالی کا بڑا احساس تھا نیز یہ لوگ راجپوتوں اور مرہٹوں وغیرہ کے ساتھ بہادر شاہ کی نرم پالیسی اور مراعات پر بھی افسردہ تھے جو بہادر شاہ نے منعم خاں اور ذوالفقار خاں کے اشارے پر اختیار کر رکھی تھی انھیں ان کی بنا پر یہ لوگ حکومت کے نظم و نسق کے رجحان اور اس کی پالیسی سے خود کو غیر متعلق سمجھتے تھے[19]۔

1710 میں فیروز جنگ کی وفات اس گروہ کی مزید کمزوری کا باعث ہوئی۔ تقریباً اسی زمانے میں چن قلیچ خاں نے اپنے منصب اور اپنی ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور سبکدوش ہو کر دہلی میں عزلت کی زندگی گزارنے لگے[20]۔

اس طرح اب بساط سلطنت پر صرف دو ہی اہم شخصیتیں باقی رہ گئیں یعنی وزیر اعظم منعم خاں اور میر بخشی ذوالفقار خاں بہادر شاہ کے دربار میں جو سیاسی کشمکش تھی وہ اب ان دو شخصیتوں کی طاقت آزمائی میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ طاقت آزمائی محض انفرادی یا شخصی نہ تھی۔ بلکہ یہ سیاسی حاشیہ آرائیاں بھی رکھتی تھی۔ ذوالفقار خاں کھلے طور پر راجپوتوں اور مرہٹوں کے ساتھ دور رس رعایتی پالیسی کا خواہاں تھا اور یہ اس مقصد سے کہ اس خلیج کو ہموار کیا جا سکے جو ان تولوں

اور حکومت کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ یہ اس کے اس عمل سے بھی مترشح ہوتا تھا جس کے تحت اس نے اعظم شاہ کو بطور مشیر خاص کے دکن سے تخت وتاج کی طاقت آزمائی کرنے کے لیے روانہ ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ منعم خاں اپنے کردار اور اپنے نظریات میں بہادر شاہ سے بہت قریب تھا۔ بہادر شاہ کی طرح وہ بھی صوفیانہ خیالات سے متاثر تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ اس نے تصوف کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس پر مذہبی دائروں کے سخت گیر علماً بہت چراغ پا تھے۔[21] نیز بہادر شاہ کی طرح وہ بھی سمجھوتے اور امن وصلح کی پالیسی کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ وہ کسی حد تک اس خیاضانہ پالیسی پر بھی اثر انداز تھا جس کے تحت ان پرانے عالمگیری امرا کے ساتھ رعایتی سلوک برتا گیا جنھوں نے کہ اعظم کا ساتھ دیا تھا۔ تاہم ایک ایسا امیر ہونے کے باعث جو حال ہی میں عروج پر پہنچا تھا اس میں ابھی سیاسی اور انتظامی سوجھ بوجھ کی کمی تھی اسی لیے اس سے موجودہ پالیسی میں تبدیلی کرتے ہوئے پس وپیش ہوتا تھا نیز ایسے اقدامات پر بھی اسے تردد تھا حالات جن کے متقاضی تھے۔ اس کی میانہ روی کی پالیسی سے کوئی مطمئن نہ تھا۔ اور بالآخر اسی سبب سے ایسے حالات پیدا ہو گئے جن میں حکومت کے مسائل اور بھی الجھ گئے اور دربار میں جو گروہوں اور افراد کے درمیان کشمکش تھی وہ اور سخت ہو گئی۔

راجپوتوں کا مسئلہ (ب)

مندرجہ بالا معاملات کے بعد راجپوتوں کے مسئلہ نے بہادر شاہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ خانہ جنگی کے دوران اعظم اور بہادر شاہ دونوں نے ہی راجپوتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اعظم نے اجیت سنگھ اور جے سنگھ کو مہاراجہ اور مرزا راجہ کے خطابات عطا کیے اور سات ہزاری منصب سے بھی سرفراز کیا نیز دونوں کو علی الترتیب گجرات اور مالوہ کی گورنری بخشی۔[22] جے سنگھ اعظم سے مالوہ میں آملا تھا لیکن اس نے جاجو کی جنگ میں اعظم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تاہم اس کو بہادر شاہ سے کچھ خاص مراعات حاصل نہ ہوئیں کیونکہ بہادر شاہ سے جے سنگھ کا چھوٹا بھائی دجے سنگھ مل گیا تھا۔ اجیت سنگھ طرفین میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی شامل نہ ہوا بلکہ اس نے اس خانہ جنگی سے یہ فائدہ اٹھایا کہ جودھ پور سے مغل سپہ سالار کو برطرف کر دیا۔ اس نے نہ تو دربار میں حاضری دی اور نہ بہادر شاہ کی تخت نشینی پر اسے رسمی مبارکباد بھیجی۔ اس کے بارے یہ بھی کہا گیا کہ وہ جودھ پور میں مسلمانوں پر سختیاں کر رہا ہے اس نے گاؤکشی کو ممنوع قرار دیا تھا آذان دینے پر بھی پابندی

لگادی تھی اور وہ ان مساجد کو منہدم کر رہا تھا جو پچھلی حکومت کے دوران مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں اور پرانے مندروں کی مرمت کرا رہا تھا اور نئے مندروں کی بنیادیں رکھ رہا تھا یہ بھی بتایا گیا کہ ادے پور کا رانا اور مہاراجے سنگھ اس کی زبردست معاونت کر رہے ہیں[23] اس لیے اکتوبر 9، 1707ء کو ایک جنگ کا فیصلہ کیا گیا جس کا مقصد اجیت سنگھ کو سزا دینا اور اس کے گروہ کو پارہ پارہ کر دینا تھا۔ محراب خاں کو جودھ پور کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ ۱۰ ار نومبر کو شہنشاہ بذات خود امیر اور اجمیر کے راستہ سے راجپوتانہ کے لیے روانہ ہوا۔[24] خراماں خراماں چلتے ہوئے، شاہی لشکر جنوری 1708ء کے اواخر میں جے سنگھ کے دارالسلطنت امیر پہنچا۔ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ چونکہ جے سنگھ اور وجے سنگھ دونوں بھائیوں کے درمیان کچھواہا کی راج گدی کے سلسلے میں تنازعہ تھا۔ ان کی ریاست کو شاہی عملداری میں لے کر ضبط کر لیا جائے اور شہر کا نام بدل کر اسلام آباد رکھ دیا جائے اور وہاں سید احمد سعید خاں بارہ کا تقرر بطور نئے فوجدار کے کر دیا جائے۔[25] شہنشاہ نے تین روز تک امیر میں پڑاؤ کیا اور اس دوران میں شہر کے باشندے شہر سے کوچ کر کے اس کو ویران کر گئے۔ متصدی صاحبان جے سنگھ کی املاک کو ضبط کرنے کے لیے روانہ ہوئے لیکن جلد ہی ان املاک کو واپس کر دیا گیا۔ اور حکومت وجے سنگھ کو سونپ دی گئی۔[26]

یہ بات صاف طور پر واضح نہیں ہے کہ بہادر شاہ کے اس عمل کا اصل مقصد کیا تھا بظاہر یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی ارادہ امیر پر مغل حکومت کو بے واسطہ طور پر مسلط کرنے کا تھا اس نے راج گدی کے تنازعے سے فائدہ اٹھا کر تخت کو خاندان کی اس شاخ کے ہاتھ سے نکال دیا جس پر اسے بھروسہ نہیں تھا۔ اور اسے خاندان کی دوسری شاخ کے سپرد کر دیا جے سنگھ نے خانہ جنگی میں اعظم کا ساتھ دیا تھا۔ مزید برآں اس پر یہ بھی شک تھا کہ وہ اجیت سنگھ کے ساتھ مل کر جودھ پور پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔[27] دوسری طرف جے سنگھ کا چھوٹا بھائی، وجے سنگھ کابل میں بہادر شاہ سے مل چکا تھا اور جاجو کی جنگ میں اس نے مکمل تعاون کیا تھا لیکن ریاست وجے سنگھ کے حوالے فوراً ہی نہیں کی گئی۔ جیسا کہ ان معاملات میں مغلوں کا دستور تھا پہلے تو اس کو خالصہ کی تولیت میں دیا گیا تاکہ مقامی بدامنی کو روکا جا سکے اور ضروری تبدیلی سہولت کے ساتھ عمل میں آ سکے۔[28] چنانچہ ایک ہم عصر مورخ لکھتا ہے کہ میواڑ کے فوجدار سید حسین خاں بارہ کو امیر میں ایک شاہی تھانہ قائم کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ امیر ہی کچھواہا کے راجاؤں کا پایہ تخت تھا اور یہ اس وقت تک جب تک کہ راجہ جے سنگھ کے آدمیوں کو وہاں سے نکالا جا چکے۔[29] تاہم جب رعایت کو وجے سنگھ

کو سونپ دیا گیا تب بھی ریاست کا پایۂ تخت شاہی فوجدار کے محاصرہ میں جاری رہا۔[30] پس امیر میں بہادر شاہ نے جو اقدام کیا وہ اورنگ زیب کے اس عمل سے مشابہ ہے جو اس نے جسونت سنگھ کی وفات پر جودھپور میں اختیار کیا تھا اس کے مقاصد بھی شاید یکساں ہی تھے یعنی راجپوتانہ پر زیادہ سے زیادہ قابو جمانا اور وہاں سے گزرنے والے تجارتی راستوں پر تسلط جمانا۔ جیسے ہی بہادر شاہ امبر سے آگے بڑھا، ادے پور کے رانا امر سنگھ نے اپنے ملک پر حملے کے خطرہ کو اس طرح ٹالا کہ اپنے بھائی بخت سنگھ کو مبارکباد کا خط دے کر نئے شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور نذر کے طور پر ایک سو اشرفیاں ایک ہزار روپے سونے کے ساز سے مرصع دو گھوڑے، ایک ہاتھی اور تلواریں وغیرہ بھجوائیں۔ اس پر بھی اس کی بدگمانیاں اس حد تک تھیں کہ وہ اپنے پایۂ تخت سے فرار ہو گیا اور اپنے خاندان و املاک وغیرہ کو پہاڑیوں میں چھپا دیا کیونکہ شاہی فوج اس کی سرحد کے قریب تک آ پہنچی تھی۔ لیکن شہنشاہ نے از راہ عنایت اس کا نذرانہ قبول کر لیا۔

جب بہادر شاہ اجمیر کے قریب پہنچا تو اسے اجیت سنگھ کی طرف سے صلح کے پیغامات وصول ہوئے لیکن یہ پیغامات قبول نہ کیے جا سکے۔ دریں اثنا، جودھپور کا نامزد فوجدار، محراب خاں[31] مراٹھا کے قریب پہنچ گیا اور اجیت کی زیر کمان ایک فوج کو شکست دے کر وہ شہر پر قابض ہو گیا اب درگا داس اور اجیت سنگھ کو دربار میں حاضر ہونے کے فرمان بھیجے گئے۔ اجیت سنگھ نے جو جواب بھیجا اس میں اس نے معافی کی درخواست کی لیکن شہنشاہ کے ارادوں کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ منعم خاں کے صاحبزادے خان زمان کو راجہ بدھ سنگھ ہادا اور نجابت خان کی معیت میں اجیت سنگھ سے ملنے اور اس کی تسلی کے لیے روانہ کیا گیا۔[32] 24 فروری کو اجیت سنگھ نے قانونی طور پر مراٹھا کے مقام پر خود کو شہنشاہ کے حوالے کر دیا۔ اس کا عزت کے ساتھ استقبال کیا گیا اور اس کو قدیم تین ہزاری اور ساڑھے تین ہزاری منصب پر بحال کر دیا گیا جس پر وہ پہلے سے فائز تھا اور مہاراجہ کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا اور اس کے علاوہ اور بہت سے تحفے تحائف سے بھی نوازا گیا اس کے دو بیٹوں کو اعلیٰ عہدے پر مقرر کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ قاضی خاں اور محمد غوث مفتی کو جودھپور میں دوبارہ اسلام کو مضبوط کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔[33] دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں وہاں جو حالات تھے انھیں حالات کو دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔

کچھ جدید مورخین نے بہادر شاہ پر دھوکہ دہی کا الزام عائد کیا ہے۔ اور انھوں نے یہ کہا ہے

کہ محراب خاں کو چوری سے جودھ پور پر قابض ہونے کے لیے بھیجا گیا تھا اور جب اجیت کو اس کا علم ہوا تو وہ غصہ کی آگ سے جل اٹھا[34] لیکن خفی خاں واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اجیت سنگھ عاجزی کے ساتھ خود اس پر راضی ہو گیا تھا کہ خان زماں اور قاضی القضات قاضی خاں اس غرض سے جودھ پور آئیں کہ دوبارہ مساجد تعمیر کریں، مندروں کا انہدام کریں۔ اذان کے لیے احکام شرعی نافذ کریں اور گاؤکشی کو بحال کریں اور منصفوں اور جزیہ جمع کرنے والے حاکموں کا تقرر کریں۔ مصنف مذکور مزید لکھتا ہے کہ اجیت سنگھ کی یہ درخواست قبول ہوئی اور اس کی خطاؤں کو درگزر کیا گیا اور قاضی، مفتی، موذن اور امام وغیرہ قسم کے دوسرے اہل کاروں کو جودھ پور اور قرب وجوار کی آبادیوں میں مقرر کیا گیا۔[35]

اس لیے بہادر شاہ پر صلحنامے کے شرائط سے انحراف کا الزام غلط معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں بھی قطعاً شبہ نہیں ہے کہ اجیت سنگھ جودھ پور کے ہاتھ سے نکل جانے پر خوش نہ تھا۔ سلطنت کی مستند ترین تاریخ کے مطابق اجیت سنگھ نے متعدد بار جودھ پور کی بحالی کے لیے درخواست پیش کی لیکن چونکہ وہ اپنے دل میں بغاوت اور نقض امن کے ارادے چھپائے ہوئے تھا اس لیے شہنشاہ نے جس پر سب کچھ روشن تھا اس کی درخواست نامنظور کر دی۔[36]

راجپوتوں پر عدم اعتماد کی بنا پر اور شاہی رعب اور دبدبے کو ان پر قائم رکھنے کے لیے بہادر شاہ نے جودھ پور پر اپنا تسلط رکھنا مناسب سمجھا۔ وہاں پر جزیہ بھی عائد کر دیا گیا۔[37] اس سے بھی زیادہ برا یہ ہوا کہ اجیت سنگھ اور جے سنگھ کو شاہی کیمپ میں نیم نظر بندی کی حالت میں رکھا گیا اور شہنشاہ خود کام بخش کی سرکوبی کے لیے دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر 30 اپریل 1708 کو دونوں راجاؤں نے شاہی کیمپ سے راہ فرار اختیار کی لیکن اس وقت شہنشاہ کام بخش والی مہم کو نسبتاً زیادہ اہم سمجھتا تھا اور اس لیے اس نے فرار شدہ راجاؤں کا تعاقب کرنے کا حکم جاری نہیں کیا

یہ دراصل بہادر شاہ کی اس راجپوت پالیسی کی ناکامیابی کا اشاریہ تھا، جو اس نے منعم خاں کے مشورے سے اختیار کی تھی۔ ایک ہم عصر صاحب قلم مرزا محمد نے منعم خاں پر سخت تنقید کی ہے اور اس نے اس پالیسی کو یہ کہہ کر ناکارہ قرار دیا ہے کہ "یہ غلط اصولوں پر مبنی تھی" اس کی رائے ہے کہ انھیں (اجیت سنگھ اور جے سنگھ کو اعتماد دلانا چاہیے تھا اور ان کے ساتھ مروت اور مراعات کا راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔" لیکن وزاعظم منعم خاں ان سب پہلوؤں کی طرف سے غافل رہا بلکہ اپنے شہنشاہ کو یہ سمجھایا کہ ان لوگوں کو میٹھے میٹھے الفاظ اور جھوٹے وعدوں کے ساتھ ٹال دیا جائے۔ ادھر ان کی

املاک کو شاہی حکام کے سپرد کر دیا جائے اور ان کو بڑی بڑی جاگیروں کے وعدوں کا لالچ دلا کر دربار میں رکھا جائے اور ان کے معاملات کو اس مدت تک طول دیا جائے جب تک کہ کام بخش کو کام تمام نہ ہو جائے۔ اس کے بعد جیسا مناسب ہوگا کر دیا جائے گا اسی اثنا میں راجپوتوں کی بغاوت کو کچل دیا جائے گا اور ان کی طاقت کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔[39]

نظر بندی سے فرار ہو کر جے سنگھ اور راجیت سنگھ اودے پور پہنچے جہاں پر انھوں نے مہارانا کے ساتھ مغلوں کے خلاف متحد ہو کر لڑنے کے لیے ایک محاذ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اگر راجپوت روایات پر یقین کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ راجپوت راجاؤں نے نہ صرف اپنے ممالک کو واپس لینے کا منصوبہ بنایا بلکہ اس کا بھی کہ مغلوں کے اثرات کو راجپوتانہ سے بالکل ختم کر دیا جائے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ پورے ہندوستان کو اپنے زیر اثر لے آنے کا خواب دیکھنے لگے۔[40]

محاذ بندی کے مشورہ کے بعد اجے سنگھ نے جودھ پور پر حملہ کیا اور اس پر اپنا قبضہ جما لیا اور جے سنگھ نے امبیر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ بعد ازاں انھوں نے ہنڈوان اور بیانہ کی مغل چوکیوں پر بھی لشکر کشی کی۔ جب شہنشاہ کو اس راجپوت بغاوت کا علم ہوا۔ اس نے اسد خاں وکیل مطلق کو دہلی سے آگرہ روانہ ہونے کا حکم دیا اور اس بغاوت کو دبانے کے لیے اقدامات کرنے کو کہا۔ متعدد سپہ سالاروں اور فوجی سرداروں کو اس کی معاونت کا حکم دیا گیا ان سالاروں اور سرداروں میں چن قلیج خاں، خان دوراں صوبہ دار اودھ، خان جہان صوبہ دار الہ آباد اور محمد امین خاں فوجدار مراد آباد شامل تھے۔ لیکن ان امرا نے کوئی جنبش نہ کی ان کی بجائے اسد خاں اور ذوالفقار خاں نے جو بظاہر منعم خاں کی راجپوت پالیسی سے متفق نہ تھے، جے سنگھ اور راجیت سنگھ سے گفت و شنید شروع کی۔[41]

اسی اثنا میں 1708 کا برسات کا موسم ختم ہوا۔ راجپوت فوجوں نے اجمیر کے نواح پر لشکر کشی شروع کی اور گیارہ روز تک شہر کا محاصرہ کیے رہے یہاں تک کہ صوبہ دار سید شجاعت خاں بارہہ نے ان کو پسپا کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے سامبر پر حملہ کیا۔ ایک لڑائی کے حادثہ میں مشہور سردار، سید حسین خان کام آیا۔ اور اس طرح راجپوتوں کو ایک شاندار فتح نصیب ہوئی۔ لیکن اس کے علاوہ انھیں کہیں اور کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور محض لوٹ مار پر ہی قانع رہے راجپوتوں کی یہ مختصر سی کامیابی بھی شاہی وقار کو صدمہ پہنچانے کے لیے کافی تھی۔ مرزا محمد بڑے تلخ لہجے میں کہتا ہے "اگر کوئی ایسا پرانا تجربہ کار امیر جس کے ہمراہی میں آزمودہ کار لوگ ہوتے، اجمیر

کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا اور دو جری اور ہر دلعزیز سردار ضروری اسلحہ جات سے لیس ہو کر جودھ پور کے اوپر مسلط کیے جاتے تو راجپوتوں کی بھلا کوئی طاقت تھی جو اپنے ممالک کو واپس لے سکتے۔ سید حسین خاں بارہ ایک جری اور بہادر انسان تو ضرور تھا لیکن وہ ایک نیا ترقی یافتہ امیر تھا اور اسے لوگوں کا اعتماد حاصل نہ تھا اور نہ اس کے پاس حالات کا سامنا کرنے کے لیے وافر سامان ہی موجود تھا۔[43]

4 اکتوبر 1708ء کو راجپوت راجاؤں کو ان کے منصب پر بحال کر دیا گیا اور یہ اسفنداں اور شاہزادہ عظیم الشان کے مشورے سے ہوا جو اس وقت باپ کا بڑا چہیتا تھا۔[44] لیکن ان کے پایۂ تخت (وطن جاگیر) کو لوٹانے کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ اسد خاں نے جو کہ لاہور، دہلی اور اجمیر کے صوبوں کا مختار کل تھا راجاؤں کو ان کے وطن مالوف کی سندیں دینا طے کیں "بشرطیکہ وہ اپنے تعلقے سانبھر اور دیدوانہ سے ہاتھ اٹھالیں اور کابل اور گجرات میں تقرر کیے جانے پر راضی ہوں" لیکن راجے اب ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کو تیار نہ تھے نہ اپنے گھروں سے دور جاکر کوئی عہدہ لینے کو تیار تھے اور مالوہ اور گجرات کی صوبے داری کا مطالبہ کرنے لگے۔[45]

فروری 1709ء میں کام بخش کو شکست دینے کے بعد بہادر شاہ نے دوبارہ اپنی توجہ راجپوتانہ پر مرکوز کی۔ وہاں راجاؤں کو ان کے منصبوں پر بحال کیے جانے کے بعد اکتوبر 1708ء سے ایک ناقابل اعتبار جنگ بندی چل رہی تھی۔[46] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دربار میں ایک طاقتور گروہ راجپوتوں کے خلاف ایک سخت اور درشت پالیسی اپنانے کے حق میں تھا۔ چنانچہ اجمیر میں غازی الدین فیروز جنگ کا تقرر ہوا اور اس کو حکم ہوا کہ فوری طور پر احمد آباد سے اپنے نئے منصب کو سنبھالنے کے لیے روانہ ہو جائے۔[47] ایک خبر یہ تھی کہ شہنشاہ راجپوتوں کو سزا دینے کی غرض سے اور انھیں سبق دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔" خائف ہو کر راجپوتوں نے اپنے پرانے ہمدردوں یعنی اسد خاں اور شاہزادہ عظیم الشان سے بیچ میں پڑنے کی درخواست کی۔[48]

ان موثر شخصیتوں کے بیچ میں پڑ جانے سے اور ساتھ ہی ساتھ پنجاب میں سکھ بغاوت کی خبروں کے اثر نے مصالحت کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ سکھوں کی بغاوت کا علم شہنشاہ کو دسمبر 1709ء میں نرملا کے قریب ہوا۔[49] اس کے فوراً بعد یہ خبر آئی کہ وزیر خاں سرہند کا فوجدار باندہ کے ہم نواؤں کے ہاتھ مارا گیا۔ شاہی پایۂ تخت کے قریب اور شمال مغربی سرحد کے نازک مقام کے پاس سکھوں کی بغاوت کے امکانی اثرات کو راجپوتوں کے طول طویل معاملوں سے زیادہ اہم تصور کیا

گیا۔ مواخرالذکر تو مغلوں کے پرانے معاونین تھے اور جیسا کہ ایک مصنف کہتا ہے "وہ نسلوں اور صدیوں سے (مغل شہنشاہوں کے) محکوم رہنے کے عادی ہو گئے تھے؛ اس کا امکان نہ سمجھا گیا کہ اگر ان کو ان کے قدیمی اور آبائی علاقوں پر قابض رہنے دیا گیا تو وہ ملک گیری کے لیے کوئی اقدام کریں گے[50]۔"

اس لیے راجپوت راجاؤں سے بہت تیزی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا۔ ان کے آبائی علاقے انھیں واپس کر دیئے گئے اور ان کا مطالبہ بھی قبول کر لیا گیا کہ وہ شہنشاہ سے اس کی نقل و حرکت کے درمیان (سر سواری یعنی دربار میں نہیں) ہی گفتگو کر سکیں گے اور وہاں تک شاہزادہ عظیم الشان ان کی رہنمائی کرے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ شہنشاہ کے سامنے حاضری کے بعد انھیں چھ ماہ کی رخصت ملے گی اور اس کے بعد ان کا جہاں بھی تقرر کیا جائے گا وہ وہاں جا کر اپنے فرائض منصبی انجام دیں گے۔ 21 جون 1710ء کو جبکہ شہنشاہ سفر میں تھا اس کے حضور منعم خاں کے فرزند مہابت خان نے دو راجاؤں کو پیش کیا۔ دستور کے مطابق آداب و تحائف پیش کرنے کے بعد انھیں چھ مہینے کی مہلت گھر واپس جانے کے لیے دی گئی[51]۔

یہ شرائط جن کے بارے میں ایک اہم عصر لکھتا ہے کہ "یہ حد سے زیادہ متجاوز تھیں[52]۔" اور ایک دوسرا اہم عصر کہتا ہے کہ وہ شہنشاہ کے وقار اور اس کی حکمت عملی کے خلاف نہیں تھیں[53]۔ یقیناً راجپوتوں کے ساتھ صلح اور امن کی پالیسی کی طرف ایک پہلا قدم ہو سکتی تھیں۔ بہادر شاہ بہت خواہشمند تھا کہ راجپوت سکھوں کے خلاف اس کی اعانت کر سکیں اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف بھی کام آ سکیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے کی طرح راجپوتوں کو اب بھی مغل سلطنت کا داہنا بازو بنائے رکھنے اور محافظ و معاون کی طرح قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن ایسی پالیسی کی کامیابی کے لیے ایک نیا فیاضانہ سلوک کی ضرورت تھی نہ کہ شک و شبہ کی۔ راجپوت راجا نہ صرف آبائی علاقوں کی واپسی چاہتے تھے بلکہ یہ بھی کہ پہلے کی طرح انھیں بلند منصب عطا کیے جائیں اور انھیں مالوہ اور گجرات جیسے اہم صوبوں کا صوبہ دار مقرر کیا جائے[54]۔ یہ دونوں صوبے ان کے آبائی علاقے سے بھی متصل تھے اور یوں بھی ایک دوسرے کے قریب تھے اور اپنی بے اعتمادی کی وجہ سے دونوں راجا ان صوبوں کے صوبہ دار مقرر کیے جانے کو شہنشاہ کے اعتماد اور بھروسہ کا ایک ثبوت سمجھتے تھے۔

بہادر شاہ کی حکومت کی باقی مدت میں بھی راجپوتوں کے معاملات ایک ہی حالت پر قائم رہے منعم خاں راجپوت راجاؤں کی اس مانگ کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا کہ انھیں مالوہ اور گجرات کے صوبوں کا صوبے دار مقرر کیا جائے۔ اس نے ان کے بجائے انھیں کابل اور گجرات کی تقرری قبول

کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ عظیم الشان نے جو خود کو راجپوتوں کا دوست بنا کر پیش کرتا تھا ان سے مشرقی علاقوں کی تقرری کا وعدہ کیا اور عدم تقرری کی حالت میں وطن کو واپس جانے کی رخصت کا یقین بھی دلایا بشرطیکہ وہ دربار میں حاضر ہوں[55] لیکن راجپوت راجاان تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے وہ دربار میں حاضری کو ٹالنے کی کوشش کرتے تھے یہ کہیں اکتوبر 1711ء میں جاکر ممکن ہوا اور وہ بھی بار بار کے بلاوے کے بعد اور چھ مہینے کی رخصت ختم ہونے کے بھی پندرہ مہینے بعد کہ دونوں راجہ دربار میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے[56] اس وقت تک منعم خاں فوت ہو چکا تھا اور تمام معاملات کا مرکز شاہزادہ عظیم الشان بنا ہوا تھا۔ راجاؤں کا تقرر سادھورا کے لیے کیا گیا جہاں انھوں نے "ایک بڑی فوج" کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کیے اور پہاڑ کے دامن کو باندہ والے گروہ کے حملوں سے محفوظ رکھا۔[57]

ڈھائی مہینے کے بعد جے سنگھ کو احمد آباد کھوراعرف چترکوٹ کا فوجدار مقرر کیا گیا اور اجیت سنگھ کو گجرات کے سوراٹھ کا۔[58] یہ تقرر راجپوں کی توقعات سے کہیں کم تھے۔[59] اس لیے انھوں نے وطن لوٹ جانے کی درخواست پیش کی۔ اپنے وعدہ کے مطابق شہنشاہ نے اس سے اتفاق کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے پیچھے ایک چوکی چھوڑتے جائیں اور جنوری 1712ء میں یہ دونوں راجے وطن کے لیے روانہ ہوئے۔[60]

اس طرح بہادر شاہ کی راجپوت پالیسی میں ایک ارتقائی تبدیلی رونما ہوئی۔ پہلے تو اس نے جودھپور پر بزور شمشیر مغلوں کا تسلط قایم رکھنا چاہا اور راجپوتانہ پر اپنا اثر اس طرح بڑھانا چاہا کہ جے سنگھ کو امیر کی گدی سے ہٹاکر اس کے چھوٹے بھائی کو گدی نشین کیا اور امیر میں ایک شاہی فوجدار کو رہنے کا حکم دیا اس سے راجپوتانہ میں ایک بغاوت پھیل گئی اور وہ بھی اس وقت جبکہ بہادر شاہ دکن میں کام بخش کو زیر کرنے گیا ہوا تھا۔ کچھ حالات سے مجبور ہو کر اور کچھ دربار کے اس گروہ کے زیر اثر جو راجپوتوں کے ساتھ ایک رعایتی پالیسی کا حامی تھا، بہادر شاہ نے جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو ان کے پایہ تخت اور آبائی علاقے واپس کر دیئے لیکن اتنے پر بھی راجاؤں کو اس قسم کے منصب دینے سے انکار کر دیا جس طرح کہ وہ چاہتے تھے۔

اس طرح راجپوتوں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ خلیج تنگ تو ضرور ہو گئی لیکن ختم نہ کی جا سکی۔

دکن کا مسئلہ

دکن کا مسئلہ جیسا کہ پہلے ہی خوب واضح کر دیا گیا ہے ان دشوار مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ تھا جن کا مغلوں کو سترہویں صدی کے آغاز سے سامنا کرنا پڑا۔ اور بہادر شاہ بھی زیادہ عرصہ تک اس سے بے خبر نہ رہ سکتا تھا اس مسئلہ کو دوہری نوعیت کا مسئلہ کہا جا سکتا ہے پہلے تو مغربی ساحل پر وہ علاقہ جہاں مرہٹی زبان بولی جاتی تھی اور جہاں شیواجی نے آزادی یعنی سوراج حاصل کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ دوسرے میسور تک دکھنی پہاڑ کا مسئلہ ایک زرخیز اور نہایت ہی فائدہ رساں علاقہ جس پر کہ اکثر شمالی فوجوں نے لوٹ مار مچائی تھی لیکن جس پر شمالی ہندوستان کی مکمل حکمرانی کا امکان شاذ ہی نظر آتا تھا۔ مغل حکمراں ایک عرصہ سے اس علاقہ کی دولت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن اس کو مغل سلطنت کے ماتحت لانے کی مستقل کوشش تقریباً 1776ء ہی شروع ہوئی۔ شیواجی کے وقت سے مرہٹہ لوگ اس علاقے سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کر رہے تھے جو ان کی تمام مالگذاری کا 35 فی صد ہوتا تھا۔

بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت یہ مسئلہ اس سے اور بھی الجھ گیا تھا کہ وہاں سلطنت کا ایک دعوے دار موجود تھا یعنی کام بخش جس نے اپنا سکہ بھی رائج کر رکھا تھا اور جو اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھواتا تھا اور اس طرح گویا اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اورنگ زیب نے بیجاپور پر چڑھائی کر کے وہاں کی خود مختار سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس دوہرے مسئلہ کو سلجھانے کے لیے یعنی ان علاقوں میں یکساں نظم و نسق قایم کرنے اور مرہٹوں کی بغاوت کو دبانے کے لیے اورنگ زیب نے اپنی عمر کے آخری چھبیس سال دکن ہی میں گزارے تھے۔

لیکن ان دشواریوں کے باعث جن کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے صرف محدود کامیابی حاصل ہوئی اس کے مرنے کے بعد مسئلہ اور بھی الجھ گیا۔ امراء پہلے ہی سے دکن میں اس طویل قیام سے دل شکستہ ہو چکے تھے کیونکہ وہ شمالی ہند سے سینکڑوں میل دور تھے جس کو کہ وہ اپنا اصلی وطن سمجھتے تھے۔ کسی نئے حکمراں کے لیے اتنا اثر قایم کر لینا آسان نہ تھا جو ان کو دکن میں مزید قیام کرنے پر مجبور کر سکتا۔ علاوہ ازیں دکن ہی پر مستقل توجہ مرکوز کیے رہنا شمالی ہند کے لیے نقصان رساں ہو سکتا تھا جبکہ مغل سلطنت شمالی ہندوستان کے وسائل کے بل بوتے پر قایم تھی۔

اورنگ زیب کی طرف جو سلطنت کو دو حصوں میں منقسم کرنے کی تجویز منسوب کی جاتی تھی اس کا مقصد بظاہر دونوں مسئلوں کا حل کرنا معلوم ہوتا تھا یعنی مغل سلطنت کا پورے ملک پر تسلط قایم ہو جانا اور ساتھ ہی ساتھ دکن میں ایک ایسا دفاعی مرکز قایم کرنا جو مرہٹوں کے خطرے پر قابو پانے کے لائق مضبوط اور طاقتور ہو۔ اس تجویز کے ماتحت ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا پہلا گولکنڈہ اور بیجاپور کے زیر اثر علاقہ تو کام بخش کو سونپ دیا گیا۔ دوسرا جس میں دکن کے باقی چار صوبے اور مالوہ، گجرات اور آگرہ شامل تھے یہ علاقہ اعظم شاہ کو دے دیا گیا تھا اور تیسرا جس میں بقیہ سلطنت شامل تھی بہادر شاہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔[61]

جاجو کی جنگ سے قبل بہادر شاہ نے اس وصیت کو قبول کر لیا تھا اب اس نے کام بخش کے سامنے بھی بالکل ایسی ہی تجویز رکھی۔ ایک خط میں جو کام بخش کو حافظ احمد مفتی عرف معتبر خاں کے ذریعہ بھیجا گیا۔ بہادر شاہ نے تحریر کیا کہ ہمارے والد ماجد نے بیجاپور کا صوبہ تمہارے سپرد کیا تھا اب ہم تمہارے لیے بیجاپور اور حیدر آباد کے دو صوبے مع کل رعایا املاک و ساز و سامان چھوڑتے ہیں اس شرط پر جو دکن کا قدیمی اصول بھی ہے کہ سکے ہمارے نام سے ڈھلیں گے اور خطبہ بھی ہمارے نام ہی کا پڑھا جائیگا وہ خراج جواب تک ان دونوں صوبوں کے صوبے دار پیش کرتے تھے اسے بھی ہم چھوڑتے ہیں۔ تمہارے لیے لازم ہے کہ عوام الناس کے ساتھ انصاف کرو حکم عدولی کرنے والوں کو سزا بھی دو اور اس علاقے کے ظالموں اور لیٹروں قلع قمع کر دو۔[62]

یہ کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ کیا بہادر شاہ اس پیش کش میں سچائی اور صداقت سے کام لے رہا تھا ہو سکتا ہے کہ اسکو یہ توقع ہو کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی قدیم سلطنتیں ایک تیموری حکمراں کے تسلط میں آکر اندرونی طور پر امن وامان برقرار رکھ سکیں گی اور اسی کے ساتھ مرہٹوں کا سدباب بھی ہو سکے گا۔[63] اور اس قسم کی سلطنت ہندوستان گیر تیموری حکمرانی کے اصول سے منافی بھی نہ ہو گی لیکن اس تجویز پر عمل درآمد ہونے کا موقع میسر ہی نہیں آیا کیونکہ کام بخش نے حقارت کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کر دیا جو بہادر شاہ نے پیش کی تھی اس سے موا خرالذکر کو کام بخش کے کاندھوں پر ہی معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کی خونریزی کا الزام دھرنے کا موقع مل گیا۔[64]

اگر کام بخش نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے سبھی اہم قلعوں پر کوئی موثر قبضہ کر لیا ہوتا، اپنے امرا کا اعتماد اور تعاون حاصل کر لیا ہوتا اور مرہٹوں سے بھی اس کی کوئی مفاہمت ہو گئی ہوتی تو کام بخش یقیناً بہادر شاہ کے لیے ایک زبردست خطرہ بن سکتا تھا کام بخش نے مرہٹوں سے گفت و شنید

ترکی لیکن اس کی یہ کوشش کچھ زیادہ بار آور نہ ہو سکی۔

وہ ذوالفقار خاں کے نائب، داؤد خاں کی مخالفت کے سبب کرناٹک کو اپنے قابو میں نہ لا سکا۔ شمال میں نظر بیگ خاں نے جو گولکنڈہ کا فوجدار تھا اور جس کا بہادر شاہ سے ساز باز تھا اس کی فرمانبرداری کرنے سے انکار کر دیا[65] دوسرے بہت سے امراء نے بھی بہادر شاہ کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کے ذریعہ اپنی خود مختاری دکھانے کی کوشش کی حالات اس بات سے اور بھی بگڑ گئے کہ کام بخش نے اپنی شک و شبہ کی عادت کی بنا پر اپنے میر بخشی اور نہایت معتمد سردار، تقرب خاں کی وفاداری کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے تقرب خاں کو قید کر دیا اور اس کو اور اس کے ہمنواؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔[66]

ان تمام امور کا یہ نتیجہ ہوا کہ جیسے ہی بہادر شاہ کے قدم نزدیک پہنچے ویسے ہی کام بخش کے امراء اور سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ کام بخش شکستہ دلوں کی ایک قلیل تعداد کے ساتھ رہ گیا۔ فرار ہونے کو اپنی شان کے خلاف جان کر اس نے جان کی بازی لگا کر مقابلہ کیا لیکن ناکام رہا اور 13 جنوری 1709 کو میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

اس طرح وہ خانہ جنگی جس نے کہ ملک کے مختلف حصوں کو پچھلے دو سال سے ایک غیر مستحکم حالت میں ڈال رکھا تھا بہادر شاہ کی فتح کے ساتھ ختم ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں بہادر شاہ ہندوستان کی اتنی وسیع سلطنت کا حکمراں بن گیا جتنی شاید ہی کسی دوسرے ہندوستانی حکمراں کے زیر نگیں رہ چکی ہو۔ بہادر شاہ کی فتح نے ایک ہندوستان گیر سلطنت کے خیال کو تقویت پہنچائی۔ اور وقتی طور پر علاقائی خود مختاری کا خاتمہ نظر آنے لگا۔ ملک کی سیاسی سالمیت کا تصور ملک کا ایک بنیادی خیال بن گیا۔ اور اسی نے ان تمام سیاسی تحریکوں کو ممکن بنایا جو ملک میں اٹھارہویں صدی میں رونما ہوئیں۔ مثلاً اس کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ مغل بادشاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اس حالت میں بھی جبکہ اس کی ساری قوت اور شان و شوکت رخصت ہو چکی تھی۔

اس کے بعد بہادر شاہ کو دکن کے نظم و نسق کے لیے مناسب اقدام کرنے تھے پہلے دکن کے چھ صوبوں کی نائب حکمرانی شاہزادہ عظیم الشان کو پیش کی گئی کیونکہ وہ اس وقت باپ کی نظروں میں چڑھا ہوا تھا۔ لیکن عظیم الشان نے مشرقی صوبوں یعنی بنگال، بہار، اڑیسہ اور الٰہ آباد کی حکمرانی

کو ترجیح دی۔ کیونکہ ان میں سے چند پر دہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی نیابت کر چکا تھا اس لیے دکن کی نیابت ذوالفقار خاں کے سپرد ہوئی[67] اس کو دکن سے متعلق کل مالگزاری اور تمام دکماں نظم و نسق کے سلسلے میں پوری آزادی دے دی گئی۔ اور اس کو دربار میں رہنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنی پچھلی میر بخشی کی ذمہ داری کے علاوہ اس نئی ذمہ داری کے قبول کرنے کا شرف بخشا گیا۔ اس کے قدیم مصاحب اور پروردہ داؤد خاں پنی کو دکن میں اس کا نائب بنایا گیا اور اس کا سات ہزاری / پانچ ہزاری منصب (پانچ ہزار دو اسپہ) دیا گیا اور بیجاپور، برار اور اورنگ آباد کی گورنری بھی اس کو ملی اورنگ آباد کو اس کا صدر مقام مقرر کیا گیا۔[68]

میر بخشی اور دکن کا (غیر حاضر) نائب حکمراں بننے سے ذوالفقار خاں سلطنت کے اہم ترین امراء میں شمار ہونے لگا۔ اس سے قبل مغل بادشاہوں نے کبھی کسی ایک کو بیک وقت ایسے دو عظیم ترین منصب نہیں دیئے تھے خواہ حالات کا دباؤ کیسا ہی سخت رہا ہو یہ نیا اقدام اور نئی جدت آئندہ کے لیے ایک خطرناک علامت بن گئی مزید برآں ذوالفقار دکن سے متعلق مال گزاری یا کسی دوسرے معاملے میں کوئی مداخلت برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منعم خاں ذوالفقار خاں کو اس قدر وسیع اختیارات دیئے جانے کا مخالف تھا۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ برہان پور (خاندیش) اور نصف برار جس کو بالعموم پائیں گھاٹ کیا جاتا تھا۔ دکن کا کوئی جزو نہ تھے کیونکہ خاندیش تو خود مختار فاروقی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور پائیں گھاٹ کو اکبر نے تحویل میں لیا تھا۔ وہ ان صوبوں کو دہلی کے ماتحت صوبوں میں شامل کرنا چاہتا تھا اور ان صوبوں کے سیاسی و مالی معاملات اور تقرر علیحدگی اور منتقلی اہل کاران کا اختیار وہ اپنے سب سے بڑے فرزند مہابت خاں کو دلانا چاہتا تھا جو تیسرے میر بخشی کے عہدے پر فائز تھا اس سے منعم خاں اور ذوالفقار خاں میں مزید تلخی بڑھ گئی اور تنازعہ اس حد تک بڑھا کہ عام گفتگو کا ایک موضوع بن گیا چونکہ بہادر شاہ امراء کے درمیان تنازعوں میں فیصلہ دینا ناپسند کرتا تھا اس لیے جو حالات جیسے ہوتے ویسے ہی چلتے رہا کرتے تھے۔[69]

چنانچہ دکن پر ذوالفقار خاں ہی نائب حکمراں رہا اور وہاں کے معاملات کے لیے وہی تنہا صاحب اختیار بھی رہا۔ ذوالفقار خاں کے اختیارات اور اس کے اثرات دکھانے کے لیے ایک مثال ہی کافی ہے۔ اس کی وکالت اور پشت پناہی کی بنا پر نیماجی سندھیا کو جو ان

علاقوں کا بااثر ترین سردار تھا۔ سات ہزاری/پانچ ہزاری منصب دیا گیا اور اس کے بیٹے پوتوں کو جو منصب دیئے گئے ان کا حساب سب ملا کر چالیس ہزار ذات اور پچیس ہزار سوار تک پہنچتا ہے۔ اورنگ آباد کے آباد علاقوں کے بہت سے پرگنے اس کو منتقل کر دیئے گئے اور وہاں سے ایک ہزار سے زائد چھوٹے بڑے منصب داروں کو علیحدہ کیا گیا۔ سخت مخالفت اور شور و شر کے باوجود ذوالفقار خاں کے ان اقدامات کو بدلا نہ جا سکا۔[70]

اس میں کوئی شک نہیں کہ دکن کے نائب حکمراں یا اس کے نائب کو وسیع اختیارات دینا ایک انتظامی ضرورت تھی۔ لیکن مرکزی حکومت کی کمزوری کے پس منظر میں اور دکن میں خود مختارانہ رجحانات کی موجودگی کے پیش نظر اس سے بڑے امراء کے دلوں میں طمع اور لالچ کی آگ بھڑک اٹھی جو دکن پہ دانت لگائے بیٹھے تھے۔ وزارت اور میر بخشی کے منصبوں کے ساتھ دکن کی نائب حکمرانی کا منصب بھی دربار کے سیاسی گروہوں کی کشمکش کے لیے ایک طاقت آزمائی کا مرکز بن گیا۔ نئے نائب حکمراں کے اختیارات اور اثرات کی آزمائش اس میں تھی کہ وہ مرہٹوں کے مسئلہ کو اپنے پسندیدہ طریقہ سے طے کر سکے۔ لیکن اس مقام پر آکر اس کی خود مختاری ایک دشواری کے نرغے میں آتی دکھائی دی۔ کام بخش کی شکست کے بعد ذوالفقار خاں نے شاہو کے وکیل سے شہنشاہ کو روشناس کرایا۔ اس نے ایک عرضی پیش کی جس کا مقصد دکن کے چوتھ اور سر دیش مکھی کی مالگزاری کو جو دکن کے چھ صوبوں سے حاصل ہوتی تھی طلب کرنا تھا اور اس نے تباہ شدہ علاقوں کی خوش حالی کو بحال کرنے کی شرط بھی لگائی تھی اس مسئلہ پر دونوں وزیروں میں سخت تنازعہ شروع ہوا۔ بالآخر بہادر شاہ نے جو ان میں سے کسی ایک کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا حکم دیا کہ منعم خاں اور ذوالفقار خاں کی درخواستوں کے پیش نظر سر دیش مکھی کی سندیں دے دی جائیں۔[71] دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے شاہو کو مرہٹہ حکمراں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جیسا کہ اورنگ زیب نے بھی کیا تھا۔ اس نے چوتھ کے مطالبے کو بھی مسترد کر دیا صرف دیش مکھی کی اجازت دی گئی اور اس کے لیے بھی مقابل دعویداروں کو جھگڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا یہ اقدام دکن میں امن و امان کی بحالی کی ضرورت کی پالیسی کو ترجیح دینے کے بالکل خلاف تھا کیونکہ آپس میں جھگڑا کرتے کرتے یہ ظاہر ہی تھا کہ دونوں مقابل دعویدار مغل سرحدوں پر ضرور لوٹ مار کریں گے۔ اور در اصل ایسا ہی ہوا بھی جیسے ہی بہادر شاہ نے دکن سے قدم نکالا شاہو رائے گڑھ سے باہر آگیا اور اس نے اپنے سرداروں کو یہ حکم جاری کر دیا کہ شہنشاہ نے مجھ کو ان

علاقوں کے سردیش مکھی کی اجازت دے دی ہے لیکن چوتھ کی اجازت ابھی نہیں ملی ہے۔ اس لیے تم شاہی سرحدوں پر حملے کرو اور بدامنی پھیلاؤ تاوقتیکہ وہ ایسا کرنے پر راضی نہ ہو جائے۔[72]

اب یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ بہادر شاہ کی مرہٹہ پالیسی کم نظری اور خام خیال پر مبنی تھی۔ دراصل اس پر یہ ذمہ داری آپڑی تھی کہ وہ اس وزیر کی رائے پر عمل کرے جو سیاسی معاملات میں اس کا مشیر کار تھا یا اس دوسرے وزیر کی جو کہ دکن اور مرہٹوں کے معاملات کے لیے ذمہ دار تھا۔ ذوالفقار خاں کے مشورے کو ٹھکرا کر اس نے مرہٹوں کے ساتھ مفاہمت کا سنہرا موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ اس وقت مرہٹوں کی طاقت بہت ہی گھٹ چکی تھی۔ وطن میں شاہو کی حالت متزلزل تھی اور اگر بہادر شاہ اس کو تسلیم کر لیتا تو اسے ضرور شاہو کی دوستی حاصل ہو جاتی اور شاہو اس کا احسان مند بھی ہوتا۔ علاوہ ازیں شاہو کی جانشینی کو اورنگ زیب نے بھی ہمیشہ تسلیم کیا تھا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد خود بہادر شاہ نے ایک طرح شاہو کے حق کو تسلیم کر لیا تھا کیونکہ اس نے اس کو پچھلے منصب پر بحال کر دیا تھا اور تخت نشینی کی مبارکباد کے بدلے میں اسکو شاہی فرمان اور تحفے تحائف بھی بھیجے تھے۔[73] اور اس سے کام بخش کے خلاف فوجی تعاون کے لیے بھی حکم دیا تھا۔[74]

جہاں تک مرہٹوں کے ساتھ شرائط صلح کا سوال ہے ذوالفقار خاں جو وسیع تجربہ کا مالک تھا اور مرہٹوں کے کردار اور ان کی سیاست سے بھی واقف تھا، اس رائے کا معلوم ہوتا تھا کہ بددلی سے رعایتیں دینے کی پالیسی زیادہ کارآمد نہ تھی۔

وہ واضح طور پر محسوس کرتا تھا کہ دکن کی پالیسی میں دور رس اور زبردست تبدیلیاں لانے کا مناسب وقت آچکا تھا اور اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کو بجائے مخالفین کے سلطنت کا حصہ دار بنایا جائے اور عسکری اور انتظامی خصوصیات سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ ان کو دکن کی خوشحالی اور خوش انتظامی کی ذمہ داری دے کر وہاں مستحکم امن وامان کی صورت پیدا کی جائے۔

بہادر شاہ کی روانگی کے فوراً ہی بعد صوبہ برہان پور، بیجاپور اور اورنگ آباد میں مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر پہنچی 1710ء میں صوبہ بیجاپور میں مرہٹوں کا ایک زبردست گروہ داخل ہو گیا اور احمد نگر کی طرف رخ کیا۔ رستم خاں بیجاپوری جو آٹھ ہزاری / آٹھ ہزاری کا منصب والے تھا اور صوبہ دار بھی تھا ان کی طرف بڑھا لیکن انھوں نے جنگ سے احتراز کیا۔ جب یہ خبر بہادر شاہ کو ملی اس نے اپنی ناراضی کی علامت میں رستم خاں کا منصب ایک ہزار کے حساب سے کم کر دیا

لیکن جلد ہی پھر د: سوم ہوگیا اور اب خان کو پچھلے منصب کے علاوہ ہزار کا منصب بھی دے دیا اسی اثنا میں مرہٹوں کا ایک دوسرا جتھا برہان پور پر حملہ آرا ہوا اور پایہ تخت کے قرب وجوار تک کو لوٹ لیا۔ صوبہ دار میر امین خان جنگ کرنے کے لیے نکل آیا لیکن وہ چاروں طرف سے مرہٹوں سے گھر گیا۔ خان نے زبردست جنگ لڑی لیکن وہ اسی لڑائی میں کام آگیا اور اس کے دو بیٹے زخمی ہو گئے۔ مرہٹوں کا ایک دوسرا گروہ اورنگ آباد کے قریب ظاہر ہوا اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں لوٹ مار کی۔ نائب حکمراں کے نائب داؤد خاں پنی نے ان کے خلاف لشکر کشی کی لیکن مرہٹوں نے جنگ کرنے سے پرہیز کیا اور اس کی آمد پر فرار ہو گئے۔ اب بارش کا موسم قریب آنے لگا تھا اور یہ کشمکش بھی انجام کو پہنچی۔[75]

برسات کے بعد مرہٹے پھر پوری طاقت کے ساتھ آگئے، چندر سین جادھو نے وجیا داگ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور پھر گلبرگہ کی طرف چلا۔ ہیبت راؤ عنال کرنے، سوما جگن ناتھ وغیرہ کی اعانت سے بیجاپور پر حملہ کیا لیکن داؤد خاں کے نائب میراماں نے اسے صوبے سے باہر نکال دیا۔ گنگا نے جو فیروز جنگ کا ایک برخاست کیا ہوا سردار تھا مالوہ اور برہان پور میں بدامنی پھیلائی شاہو کی ہدایت کے ماتحت، مرہٹوں کے ایک چالیس ہزار کے جتھے نے جنید کے علاقے پر حملہ بولا اور ذوالفقار خاں کی جاگیر میں لوٹ مار مچائی۔[76] مغل ان حملوں کو روکنے سے بے بس تھے اگرچہ داؤد خاں پنی ایک بڑی فوج کی ہمراہی میں مرہٹوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے رستم خاں کے ہاتھ سے لے کر خود باگ ڈور سنبھالی کیونکہ رستم خاں کئی بار ناکامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے خاندیش سے ساتنا گھورا پاڑے کو پسپائی پر مجبور کیا اور اس کے دفاع کا اچھا انتظام کیا اور اپنے بھتیجے الاول خاں کو برار کی حفاظت کے لیے بھیجا اس نے اپنی حکمت عملی سے مرہٹوں میں بدامنی پھیلانے کوشش بھی کی۔ 1710 کے اواخر میں راؤ بھا نمبال کر مغلوں سے مل گیا اورنگ آباد میں داؤد خاں نے اس کا استقبال کیا اور اس کے لیے سات ہزار چھ ہزار کا اور اس کے سرداروں کے لیے پانچ پانچ ہزار کا منصب مہیا کیا۔ دوسرا مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر آنے والا پیماراج سندھیا تھا لیکن سب سے اہم گریز چندر سین مادھو کی تھی جو اگست 1711 میں مغلوں سے بالاجی وشوناتھ کے ساتھ شکار کے سلسلہ میں تصادم کے بعد آملا۔ اگرچہ مغلوں سے اس کا تعلق اس سے کچھ پہلے ہی سے چلا آرہا تھا۔[77]

غالباً یہ اسی عرصہ کی بات ہے کہ داؤد خان نے شاہو سے ایک خفیہ ساز باز کیا اس معاہدہ کے مطابق دکن کی چوتھ اور سردیش مکھی کو شاہو کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس مال گزاری کو

مرہٹہ اہل کار نہیں وصول کر سکتے تھے۔ بلکہ داؤد خاں کا نائب ہیرامان اس کو جمع کر کے ایک بندھی رقم کی شکل میں مرہٹوں کو دیتا تھا۔ شاہزادوں اور امراء کی جاگیریں ہر حال گزاری سے مستثنیٰ تھیں مرہٹوں کو اس معاہدہ کی کوئی تحریری توثیق نہیں دی گئی تھی۔[78] لیکن بغیر ذوالفقار خاں کے علم اور اس کی رضامندی کے یہ معاہدہ رونما ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ شہنشاہ کی بھی کوئی خفیہ مرضی اس کے پیچھے کار فرما رہی ہوگی۔

یہ معاہدہ شاہو کے لیے ایک آسمانی تحفہ تھا کیونکہ اس سے مرہٹوں کی نظر میں اس کا وقار ایک ایسے وقت میں بڑھ گیا جبکہ وہ زوال پذیر نظر آرہا تھا۔ لیکن بدقسمت دکن کو اس پر بھی چین نصیب نہ ہوا۔ اس معاہدہ سے لاتعداد تنازعے اور اختلافات پیدا ہوئے جن کا انجام ہمیشہ خوں ریزی ہوا۔ مرہٹوں کے ہاتھ ہر طرف بڑھنے لگے ان کے اہل کار قدیم دستور کے مطابق ہر جگہ چوتھ وصول کرنے آموجود ہوتے۔[79] دسمبر 1711 میں برہان پور کا صوبہ دار میر احمد خاں ایک ایسے دستے سے لڑتا ہوا مارا گیا جس کی سربراہی تلسی بائی نام کی ایک خاتون کر رہی تھی۔[80] مرہٹوں نے کرناٹک کے متعدد مقامات مثلاً کرنول، شولاپور، بیری نگر اور بہت سے دوسرے علاقوں کا محاصرہ کیا۔ آکو گھوراپاڈے سے ستر ہزار کا دستہ لے کر صوبے میں اس وقت تک موجود رہا جب تک کہ وہ دلیر خاں اور عبدالنبی خاں کے ہاتھوں دریا کے پار دھکیل نہیں دیا گیا۔ مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں سے زمینداروں کو موقع مل گیا اور وہ ہر جگہ سر اٹھانے لگے اور کرناٹک میں مغلوں کے اختیارات محض برائے نام رہ گئے۔[81]

داؤد خاں کا معاہدہ اورنگ زیب کی پالیسی سے ایک زبردست گریز تھا۔ دکن میں مرہٹوں کا جو چوتھ اور سردیش مکھی پر دعویٰ تھا اس کو اصولاً تو تسلیم کر ہی لیا گیا تھا مگر معرض تحریر میں نہیں لایا گیا تھا۔ لیکن اس سے مغل سلطنت کو وہ فوائد حاصل نہیں ہوئے جن کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن دکن میں امن وامان اور مرہٹوں سے دوستانہ تعلقات کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مرہٹہ حکمراں کا مرہٹہ سرداروں پر اقتدار ختم ہو چکا تھا اور ان میں سے زیادہ تر برائے نام اس کے ماتحت تھے۔ اور اپنی خواہش سے خود ہی لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کے ہاتھوں جو مرہٹہ حکومت تباہ و برباد ہو چکی تھی اس سے جو لاقانونیت پھیل گئی تھی وہ آسانی یا تھوڑے عرصہ میں قابو میں نہیں لائی جاسکتی تھی۔ البتہ مغل حکمراں اور مرہٹہ حکمراں کی باہمی مفاہمت سے ہی دوبارہ لٹیرے مرہٹوں پر قابو حاصل کیا

جا سکتا تھا۔ لیکن پچھلے شک و شبہات اور مغلوں کا احساس غرور اس مفاہمت کے راستہ میں حائل تھا۔ چوتھ اور سردیش مکھی۔ کہ معاہدہ کو مغلوں کا معرض تحریر میں لانے سے انکار کرنا ان شک و شبہات کو زندہ رکھے ہوئے تھا اور یہ اس معاہدے کے عارضی ہونے کی نشاندہی کرتا تھا دکن میں اہل کاروں کے فریب اور شاہو کی وطن دشمنی کا اثر بھی بدامنی کی صورت میں رونما ہوتا تھا اور اس سے مرہٹوں کی خانہ جنگی جاری رہنے میں مدد مل رہی تھی۔

سکھوں کی بغاوت

4مئی 1710 جبکہ شہنشاہ نرمدا کے قریب فروکش تھا لاہور کے دیوان نے خبر بھیجی کہ ایک شخص سمی گرو گووند کی رہبری میں لاہور کے قرب وجوار میں اور سرہند میں سکھوں نے شورش برپا کر دی تھی۔ شہنشاہ نے متعدد فوجداروں کو مناسب اقدامات کرنے کا حکم دیا لیکن یہ شورش تیزی سے پھیلتی گئی اور 22 مئی 1710 کو سرہند کا فوجدار وزیر خان شکست کھا کر مارا گیا اور شہر تاراج کر کے زیر و زبر کر دیا گیا۔[82]

اورنگ زیب نے مقامی پہاڑیوں کے راجاؤں کے تعاون سے اور دیگر اونچی ذات کے معاونین کی مدد سے اور زبردست دباؤ کے ذریعہ گورو گووند کی شورش کو ناکام کر دیا تھا لیکن اس بغاوت کے پس منظر میں جو اسباب تھے وہ ابھی تک برقرار تھے۔[83] جب بہادر شاہ لاہور سے چلا کر اعظم کے خلاف تخت نشینی کے لیے طاقت آزمائی کرے، گورو گووند نے چند مٹھوائوں کی معیت میں بہادر شاہ کا ساتھ دیا تھا جس کے لیے انھیں منصب بھی بخشا گیا تھا۔ گرو جاجو کی جنگ میں بھی شامل تھا اور بعد ازاں وہ بہادر شاہ کے ساتھ راجپوتانے اور دکن بھی پہنچا۔ دسمبر 1708 میں خبر ملی کہ گرو کی وفات ہو گئی اور وہ کافی جاگیر چھوڑ گئے۔ بہادر شاہ نے ان کی جائیداد پر خاتون ضبطی لاگو نہیں کیا۔ کیونکہ اس کو کسی درویش کی جاگیر کی ضرورت نہ تھی پنجاب میں بظاہر امن و سکون قائم رہا۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ سال بعد ایک شخص سمی باندا کی رہبری میں جو خود کو گرو گووند سنگھ بتاتا تھا، سکھوں کی شورش دوبارہ رونما ہوئی۔ یہ زمانہ توہم پرستی کا زمانہ تھا اس لیے عوام کو شناخت کرنا بھی آسان تھا۔ تمام ہم عصر مورخین اس پر متفق ہیں کہ گرو نے پست اقوام یعنی جاٹ اور کھتریوں کے تعاون کو ہی اپنی شورش کی بنیاد بنایا ان لوگوں میں ایسے پست پیشہ ور بھی شامل تھے جیسے کہ بھنگی، چمار۔ اس جھوٹے گرو باندا نے سات آٹھ ہزار آدمیوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا اور شروع میں تو اس کے پاس چار پانچ ہزار

سوار تھے لیکن جلد ہی اس نے اپنی طاقت بڑھا کر سترہ ہزار اور پھر چالیس ہزار مسلح سپاہیوں تک کا اضافہ کر لیا۔ سونی پت اور سرہند کے فوجدار اور دوسرے بہت سے سردار کھلی جنگ میں شکست کا منہ دیکھ چکے تھے۔ سکھوں نے سلطان پور اور سہارن پور کی بستیوں کو محاصرہ میں لے لیا تھا اور لاہور کے قرب و جوار سے لے کر دہلی کے قریب تک کے اتنے بڑے علاقے پر تسلط جما لیا تھا کہ وہاں سے دہلی پہنچنا چند ہی دنوں کا کام تھا۔[85] اس علاقے میں سکھوں نے اپنا نظام حکومت قائم کر لیا تھا۔ انھوں نے مالگزاری کی وصولیابی کے لیے تھانیداروں اور تحصیل داروں کو مقرر کیا تھا وہ جن جن بستیوں کو پامال کرتے گئے وہاں اپنے فوجداروں کو چھوڑتے گئے۔ یہ سردار عموماً پست اقوام میں سے منتخب کئے جاتے تھے۔ اگر کوئی بھنگی یا چمار گھر بار چھوڑ کر گرو سے جا ملتا تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ پروانۂ تقرری لے کر ہی گھر واپس آتا۔[86]

اگر اس قسم کے بیانات کو مبالغہ آمیز بھی سمجھا جائے تب بھی ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا سکھوں کی بغاوت دراصل پست اقوام کی بغاوت تھی۔ سکھ بھی مسلمانوں کی طرح اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ زیادتیاں کرتے تھے۔ اور اس لیے اکثر مقامات پر مقامی ہندو زمیندار اور صاحب ثروت لوگ مغل حکومت ہی کا ساتھ دیتے تھے۔ سکھوں کے سامنے کوئی واضح سماجی اور سیاسی مقاصد نہ تھے۔ ان کے پاس ایک مضبوط بنیادی اقتصادی ڈھانچہ کی کمی تھی جس پر ایک نئے اور بلند سماج کی تعمیر کی جا سکتی تھی۔ سکھ زیادہ سے زیادہ جس معیار پر پہنچ سکتے تھے وہ ایک ایسے سماجی ڈھانچہ کی تعمیر تھی جس کی بنیاد کسانی یا دہقانی قبیلہ بندی پر قائم تھی اس قسم کی کوشش کا بلند اقوام کی طرف سے سدباب ہونا لازمی تھا۔ اگر تیزی سے کسانوں کی کثیر سے کثیر تعداد کو آمادہ پیکار کیا جا سکتا تو یہ کوشش بھی کامیاب ہو سکتی تھی۔ لیکن سکھوں کی تحریک کی مذہبی بنیاد اس کے قابل قبول ہونے میں ایک رکاوٹ ثابت ہوئی جس سے تحریک کا تیزی کے ساتھ ترقی کرنا دشوار ہو گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا یہ ہوا کہ شہنشاہی حکومت اپنی ابتدائی غفلت سے جاگ اٹھی اور ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ سکھوں کے خلاف اقدامات کر سکیں۔ اسد خاں کو گرو کے خلاف مہم پر جانے کا حکم ہوا، چن قلیچ خان، محمد امین خان، خان جہاں صوبہ دار الہ آباد سید عبد اللہ خاں بارہہ اور متعدد دیگر سرداروں کو اس سے تعاون کرنے کا حکم ملا اور ان لوگوں کو اپنی تیاری مکمل کرنے کے لیے مناسب پیشگی رقوم دی گئیں۔[87] اواخر جون میں شہنشاہ اجمیر سے روانہ ہوا اور بہ نفس نفیس سکھوں کے خلاف مہم پر روانہ ہوا۔ لاہور اور دہلی کی اس سڑک کو صاف کر کے جو عرصہ سے

بند چلی آ رہی تھی - بہادر شاہ نے ہمالیہ کی ترائی میں سادھورا کے مقام کو اپنا صدر مقام بنایا - یہ وہ جگہ تھی جہاں سکھوں نے اپنی پناہ کے لیے متعدد قلعے تعمیر کر رکھے تھے - لوہ گڑھ پر جسے گرو گوبند نے تعمیر کیا تھا اور جہاں خود وہ اور ان کے بعد بندہ شاہی شان شوکت سے رہتے تھے دسمبر 1710 میں چڑھائی کی گئی لیکن خاص شکار یعنی بندہ بھاگ نکلا، بہادر شاہ نے وزیر اعظم منعم خاں کی اس کی اس لاپرواہی پر جس کے سبب بندہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا سخت باز پرس کی۔ کچھ مورخین کا تو یہ بیان ہے کہ شہنشاہ کی شدید سخت کلامی ہی وزیر کی معجل وفات کا باعث ہوئی ایسا معلوم ہوتا ہے بندہ کے لوہ گڑھ سے فرار ہو جانے کے بعد بہادر شاہ نے سکھوں کے مسئلہ میں دلچسپی لینا ختم کر دیا تھا - وہ لاہور لوٹ آیا اور شاہی افواج نے بندہ کے خلاف مہم کو جاری رکھا - اس کے بعد کبھی کبھی جنگ ہو جاتی تھی ورنہ شاہی افواج پہاڑوں کی ترائی سے آگے نہ پہنچ پائی تھیں اور گرو لوٹ مار کے لیے کبھی کبھی میدان میں اتر آتا تھا - شاہی سپہ سالار رستم دل اور محمد امین خاں کو گرو کے تعاقب میں اس لیے کامیابی نہ ہوتی تھی کہ اس نے گوریلا جنگ کے طریقے اپنا رکھے تھے اور اب وہ شاہی فوجوں کے مقابلے میں جنگ کرنے کے حق میں نہ تھا - چنانچہ جب اس نے میٹھ جالندھر پر حملہ کیا تو مغل سپہ سالار خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مقامی سکھوں اور ان کے ہم نواؤں کو باقی ماندہ مغل سپاہ کو موت کے گھاٹ اتارنے اور بٹالہ اور کلانور اور اردگرد کے دیہات میں اپنی فوجی چوکیاں قایم کرنے کا موقع مل گیا - جب مغل فوجوں نے دوبارہ اپنا قدم جمایا تو انھوں نے سکھوں اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف سخت اقدامات کئے جس کے نتیجہ میں مجرموں کے ساتھ بہت سے معصوم لوگ بھی شکار ہوئے۔[89] خود شاہی لشکر میں سکھوں کی جانب سے جاسوسی کا سخت خوف و ہراس تھا اور متعدد لوگوں پر شبہ تھا کہ وہ خفیہ طور پر سکھ ہیں اور گرو تک خبریں پہنچاتے ہیں اس لیے ایک حکم نافذ ہوا کہ تمام ہندو اپنی داڑھیاں صاف کریں گے۔[90] ان ہندو فقیروں جوگیوں اور سنیاسیوں کو شاہی پڑاؤ سے نکال دیا گیا جن پر گرو کی طرف سے جاسوسی کرنے کا شبہ تھا۔[91]

اس قدر احتیاط اور کوششوں اور شہنشاہ کی موجودگی کے باوجود گرو کے خلاف لشکر کشی کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی - اس کا ایک سبب دونوں مغل سپہ سالاروں کے درمیان باہمی حسد اور تنازعہ تھے جن کے نتیجہ میں ستمبر 1711 میں رستم دل کی اہانت اور نظر بندی ہوئی - جنوری 1712 میں جب شہنشاہ کی وفات ہو گئی، محمد امین نے لاہور کی خانہ جنگی میں حصہ لینے کے لیے اپنا عہدہ چھوڑ دیا

اور گرو نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر لوہ گڑھ اور سادھورا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔[92]

چنانچہ ڈیڑھ سال تک پنجاب میں زبردست افواج اور بہترین سپہ سالاروں کو جمع رکھنے کے باوجود بھی بہادر شاہ سکھ بغاوت کو کچلنے میں ناکام رہا۔ اس کا بنیادی سبب شاہی افواج کی کمزوری کو نہیں بلکہ سکھ شورش کے طریقہ عمل اور گرو کی حکمت عملی کو سمجھنا چاہیے۔ سکھوں نے دوبارہ اس حقیقت کو ثابت کر دیا جس کا مظاہرہ اس سے قبل مرہٹوں اور راجپوتوں نے بھی کیا تھا کہ ایک ایسی فوج جس کو مقامی آبادی کی ہمدردی حاصل ہو اور جو وہاں کی جغرافیائی حالات کا کماحقہ فائدہ اٹھا سکتی ہو اور جس کے سربراہ گوریلا جنگ کے طریقے اپناتے ہوں ایسی فوج اگرچہ پائیدار نہیں لیکن ایک طویل عرصہ کے لیے اس فوج سے بھی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی ہے جو اس سے بہتر ہو۔

سکھ تحریک نے ایک آزاد سکھ حکومت کے قیام کی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو اس قسم کی دوسری تحریکیں دوسری جگہوں میں بھی معرض وجود میں آتیں اور اٹھارہویں صدی کی سیاسی تصویر کا رخ بھی بدل سکتی تھی۔

منعم خاں کی وفات، وزارت کے لیے کشمکش کا آغاز

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ذوالفقار خاں منعم خاں کو غاصب سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ منصب وزارت کو اپنے خاندان کے لیے حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ 28 فروری 1711 کو منعم خاں ایک مختصر سی بیماری کے بعد وفات پا گیا۔ اس کے انتقال سے وزارت کا مسئلہ پھر زور پکڑ گیا۔ اسد خاں اور ذوالفقار خاں نے سخت بے دلی سے وزارت کو منعم خاں کے ہاتھ میں جانے دیا تھا اب ذوالفقار خاں کا یہ خیال پختہ تر ہو گیا کہ صرف وہ خود ہی اس منصب کا حق دار تھا۔ شروع شروع میں تو شاہزادہ عظیم الشان بھی جو اپنے باپ کے دربار میں بلند ترین اہمیت کا مالک تھا، ذوالفقار خاں کا حامی تھا۔ وہ اور سعد اللہ خاں دیوان و تن خالصہ[93] نے یہ تجویز پیش کی کہ ذوالفقار خاں کو وزارت پر فائز کیا جائے اور منعم خاں کے صاحبزادگان یعنی مہابت خاں اور خانہ زاد خاں[94] کو علی الترتیب میر بخشی اور دکن کا نائب حکمراں مقرر کر دیا جائے۔ اس طرح عظیم الشان، ذوالفقار خاں کو اپنا دستِ راست بنانا چاہتا تھا۔ نیز منعم خاں کے بیٹوں کو بھی خوش رکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کچھ دنوں سے اس کے قریب ترین دوست ہو گئے تھے۔ لیکن اس تجویز کی ذوالفقار خاں اور خود شہنشاہ نے

مخالفت کی۔ ذوالفقار خاں میربخشی اور دکن کی نائب حکمرانی کے منصوبوں سے دست بردار نہ ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے وزارت تو اپنے والد محترم کے لیے طلب کی اور خود کو میربخشی اور دکن کی نائب حکمرانی کے منصب پر برقرار رہنے کا مطالبہ کیا۔ بہادر شاہ کو یہ اعتراض تھا کہ منعم خاں کے بیٹے ان منصبوں کے لیے جن کے لیے ان کا نام تجویز کیا گیا تھا، غیر موزوں تھے[95] جہاں تک ذوالفقار خاں کے مطالبہ کا سوال تھا تو اس بات کی کوئی نظیر موجود نہ تھی کہ ایک ہی خاندان کے افراد کو بہ یک وقت تین ایسے عظیم منصب دیئے گئے ہوں یعنی وزارت، میربخشی اور دکن کی نائب حکمرانی۔ اور بہادر شاہ کا یہ خیال بھی صحیح تھا کہ ایسا کرنا خود شاہی خاندان کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ عظیم الشان اس نظریئے سے متفق تھا۔ چنانچہ ذوالفقار خاں کے مطالبوں کو رد کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ تجویز کیا گیا کہ صفوی شاہزادہ محمد ہاشم کو رسمی طور پر وزارت پر فائز کر دیا جائے اور بخشیوں میں سے کوئی ایک اس کے فرائض کو انجام دے۔ لیکن شاہزادہ کی رعونت اس راہ میں حائل ہوئی اور یہ تجویز بھی رد ہوگئی۔ انجام یہ ہوا کہ وزارت پر کسی کا تقرر نہ ہو سکا اور عارضی طور پر سعد اللہ خاں کو میر دیوان مقرر کیا گیا اور اس کو شاہزادہ عظیم الشان کی نگرانی اور ماتحتی میں فرائض انجام دینے کا حکم دیا گیا۔[96]

اس تنازعہ سے یہ نتیجہ نکالنا غیر مناسب ہوگا کہ ذوالفقار خاں از حد حریص، مغرور اور متکبر تھا شاید ذوالفقار خاں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ اب طاقت مرکوز ہو کر کسی ایک شخص کے ہاتھ میں رہنی چاہئے۔ اس خیال کا تعلق اورنگ زیب کی حکومت کے آخری ایام سے ہے جبکہ شاہی افواج کو متعدد شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ نظریہ بہادر شاہ کی دور حکومت میں اور بھی زور پکڑ گیا تھا جبکہ شاہی پالیسی بے راہ ہو چلی تھی۔ ذوالفقار خاں کو شاید اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ مغل حکومت کو تباہی سے صرف وہ شخص بچا سکتا تھا جس کو شاہی معاملات کا صحیح ادراک ہو جو مرہٹوں راجپوتوں اور ہندوؤں کا اعتماد حاصل کر سکے اور اسی کے ساتھ جس کو پرانے امراء اور سرکردہ عہدہ داروں کا تعاون بھی حاصل ہو[97] ذوالفقار خاں کی نظر میں ایسا انسان صرف وہ خود تھا۔ اس نظریہ سے اور بہت سے نتائج برآمد ہوئے ان میں خاص یہ تھا کہ وزیر کو تمام معاملات کا محور بنا دیا جائے۔ اور وہ نہ صرف انتظامی معاملات اور اقتصادی معاملات کا مختار کل ہو جو کہ اس کے خاص میدان عمل تھے، بلکہ فوجی معاملات بھی جو کہ میربخشی کے زیر انتظام رہے تھے اسی کے زیر اختیار ہوں۔ وزیر کو دولت مند صوبوں پر بھی اختیارات دیئے جائیں کیونکہ اس کے بغیر وہ امراء کے کسی ایک طبقے کی طرف سے پیش آنے والے اختلافات اور حاسدانہ اقدامات کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ذوالفقار خاں کی خواہشات لازمی طور پر مجرمانہ یا باغیانہ نہ تھیں۔ بلکہ ذوالفقار خاں کا نظریہ وزارت ہندوستان میں مغلوں کی قایم کردہ روایات سے ایک بنیادی اختلاف تھا۔ اس اختلاف نے وزیر اور حکومت کے درمیان نیز وزیر اور امرا کے درمیان ایک کشمکش اور طاقت آزمائی کا امکان ظہور پذیر ہونے لگا۔

اس طرح منعم خاں کی وفات سے دربار کی سیاسی طاقت آزمائی نئے دائروں میں داخل ہو گئی جس سے نئی تبدیلیاں وجود میں آئیں جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

طرز حکومت اور انتظام سلطنت

اوپر کے بیان سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ بہادر شاہ کے عہد میں اورنگ زیب کی پالیسیوں سے انحراف کا آغاز ہوا، اس انحراف کا اظہار مرہٹوں کے ساتھ تعلقات میں زیادہ اور راجپوتوں کے ساتھ تعلقات میں کچھ کم ہوا۔ لیکن سکھوں کے سلسلے میں کچھ خاص وجوہات کے تحت جبر و تشدد کی قدیم پالیسی کچھ مزید شدت کے ساتھ جاری رکھی گئی۔ ہندو رعایا کے ساتھ شہنشاہ کے تعلقات میں اور مذہبی معاملات میں بھی اورنگ زیب کی پالیسوں سے ایک محتاط گریز دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ شاہی دربار میں شراب نوشی اور رقص و سرود پر پابندی جاری رہی[98] اگرچہ بہادر شاہ اپنے باپ کی تنگ نظری کی پالیسی اور نظریات کو اپنانے سے کوسوں دور تھا۔ وہ اپنے وزیر منعم خاں کی طرح ایک صوفی تھا اور سید کا خطاب اختیار کرنے پر اسے تقلید پسندوں کے غم و غصہ کا بھی شکار ہونا پڑا۔ اس کے حکم سے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے لیے لفظ وصی کے اضافہ پر بردست فتنہ و فساد برپا ہوا۔ اور اپنی اس کوشش سے اسے دست بردار ہونا پڑا۔[99] لیکن اس کے نتیجہ میں شہنشاہ اور عوام کے درمیان ایک بُعد پیدا ہو گیا۔

جہاں تک ہندوؤں کے ساتھ بہادر شاہ کے برتاؤ کا سوال ہے نہ تو مندروں کے انہدام کے واقعات سننے میں آتے ہیں نہ جبراً تبدیل مذہب کے واقعات ہی سامنے آتے ہیں۔ لیکن ہندوؤں کے لیے پالکیوں کے اور عربی اور عراقی گھوڑوں کے رتھوں اور ہاتھیوں کے استعمال پر پابندی بحال رہی۔[100] ان کو حکم تھا کہ کانوں میں موتی وغیرہ نہ پہنیں اور داڑھیاں کتروائیں۔[101] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے حکم دیا کہ صوبوں میں ہندوؤں کا تقرر خبر رسانوں کے طور پر نہ کیا جائے۔ جزیہ اگرچہ باقاعدہ طور پر تو ختم نہیں کیا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا رواج ختم سا ہوتا نظر آتا تھا۔[102]

اس طرح سیاسی تنازعات اور دوسرے محرکات کے پیدا کردہ ہندوؤں کے عدم اعتماد کا خاتمہ نہ ہو پایا لیکن تنگ نظری اور متعصبانہ خیالات میں ایک قسم کی تبدیلی ضرور رونما ہوتی نظر آئی۔

تاہم ایک فیاضانہ اور امن پسندانہ پالیسی سے جو فوائد حاصل ہونے چاہئے تھے وہ انتظامیہ اور اقتصادی کمزوری کے سبب حاصل نہ ہو سکے۔ بہادر شاہ کو انتظامی معاملات سے دلچسپی بھی نہ تھی اور نہ اس کا رجحان ہی اس طرف تھا۔ خفی خاں کے بقول "حکومت کی حفاظت اور ملک کے انتظام کی طرف سے اس درجہ کوتاہی تھی کہ تیز فہم اور زیرک طبع لوگوں نے بہادر شاہ کی تخت نشینی کی تاریخ شاہ بے خبر کے الفاظ سے نکالی تھی۔"[103] بہرحال بہادر شاہ کی انتظامی کوتاہی کو اس کے وزیر منعم خاں نے کسی حد تک پورا کیا۔ وہ ایک نہایت کامیاب تجارتی دماغ تھا۔ ہدایت اللہ خاں (اسعد اللہ خاں) دیوان تن اور خالصہ نے بھی بہت حد تک ان کمزوریوں کو دور کیا کیونکہ وہ لیاقت اور جفاکشی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔[104]

اقتصادی معاملات میں کمزوری آجانا بہت خطرناک تھا مغل حکومت کے روز اوّل سے ہی مغل حکمراں منصب داروں کو بطور جاگیر زمینیں دینے کے لیے زمینوں کو حاصل کرنے کے مسائل سے دوچار تھے۔ یہ مسئلہ بڑھتے بڑھتے بہت نازک ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں یہ معاملہ نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا جس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے اورنگ زیب کے عہد میں حکومت کی توسیع سے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوا۔ اپنی تخت نشینی پر بہادر شاہ نے اندھا دھند جاگیریں اور ترقیاں دے کر اس مسئلہ کو اور نازک بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ بھیم سین کے بقول "منشیوں نے بھی اعلیٰ منصب حاصل کر لئے تھے۔"[105] ان معاملات نے اخلاص خاں عرض مکرر کو سخت تشویش میں ڈال دیا کیونکہ وہ ایک ایسا عرض مکرر تھا جو اپنی لیاقت اور دیانتداری کے لیے اور مالگزاری اور حساب کتاب کے معاملات میں اپنی سخت گیری کے لیے مشہور تھا اور اس نے وزیر کو عرض داشت پیش کی کہ بادشاہ کا یہ اسراف بے جا دوراندیشی کے اور حکومت کے خلاف تھا اور یہ کہ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا پوری دنیا بھی ان لوگوں کو جن پر بادشاہ بخشش کی بارش کرنا چاہتا تھا جاگیریں دینے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس نے تجویز کیا کہ وزیر کو اس معاملہ کی جانچ کرنی چاہئے کہ منصبوں پر مقرر افراد اپنے منصبوں کے اہل تھے یا نہیں اور عہدہ داروں کو ملنے والا عہدہ یا منصب یا ترقی ان کی اہلیت سے زیادہ تو نہیں لیکن اس قسم کی جانچ پڑتال سے جو غم و غصہ پیدا ہوتا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ تو منعم خاں اور نہ اخلاص خاں

تیار تھے۔ بالآخر محمد ساقی مستعد خاں مورخ کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ اب یہ ضروری ہو گیا کہ عرض مکرر یا وزیر کے ذریعہ بادشاہ کو پیش کیے جانے سے پہلے ہر عرضی مستعد خان دیکھیں اور اسے واجب قرار دیں لیکن اس سے زبردست تاخیر کا ہونا لازمی ہو گیا۔ دو ممتاز ملکہ یعنی مہر پرور اور آمنہ الحبیب نے اور شہنشاہ کے دیگر مقربین نے بغیر مستعد خاں کی جانچ پڑتال اور دستخطوں کے اپنی عرض داشتوں پر شہنشاہ کے دستخط حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن ایسی بے ضابطہ عرضیوں پر محکمہ مالیات کی طرف سے بے توجہی برتی جانے لگی۔ بادشاہ متصدیوں سے یہ کہہ چکا تھا کہ اس کے دستخطوں کی پرواہ کیے بغیر جو مناسب کارروائی ہو وہی کریں۔ اس سے شاہی دستخطوں کا وقار ختم ہو گیا۔ 106

ہمیں اس کا کچھ علم نہیں کہ منعم خاں، اخلاص خاں اور مستعد خاں بادشاہ کی بے پناہ فیاضی پر کہاں تک روک۔ ٹوک لگا سکے۔ لیکن جاگیری نظام کے بڑھتے ہوئے مسائل کو اس بے دلی سے کیے ہوئے ان اقدامات سے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نازک مسئلہ کی حقیقت کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے ہو سکتا ہے۔

پچھلے شہنشاہوں کا یہ دستور تھا کہ منصب داروں کو شاہی جانوروں کی پرورش کے لیے (یا زیادہ صحیح ہوگا کہ شاہی بار برداری اصطبل کے لیے) خرچ دیا کرتے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اورنگ زیب کے دور میں جاگیروں کی آمدنی نہایت غیر یقینی ہو گئی تھی۔ اور ان میں سے متعدد ویران اور غیر مزروع ہو گئی تھیں۔ آختہ بیگی اور دوسرے متصدی منصب داروں کے وکیلوں سے یہ خرچ وصول کرتے رہے۔

جاگیریں بمشکل تمام بہم پہنچتی تھیں اور خفی خاں کے الفاظ میں ایک انار اور سو بیمار کا سا حال تھا اور سخت تاخیر اور دشواری کے بعد منصب داروں کو کوئی چھوٹی سی جاگیر مل پاتی تھی اس کے باوجود متصدی جانوروں کی پرورش کے پورے اخراجات طلب کرتے رہتے تھے اگرچہ جاگیروں کی کل آمدنی بھی ان رقوم (ان کی آدھی یا تہائی بھی نہ تھی) سے کم ہی ہوتی تھی۔ ان حالات میں منصب داروں کے خاندانوں کے زبوں حالات کا اچھی طرح تصور کیا جا سکتا ہے منصب داروں کے وکیلوں کی عرض داشتوں کا اس سلسلہ میں کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انھیں پوری رقوم ادا کرنے کے سلسلے میں پریشان کیا جاتا تھا۔ سزائیں دی جاتی تھیں اور انھیں قید و بند کا سامنا کرنا پڑتا تھا حالات یہاں تک بگڑے کہ منصب داروں کے وکیلوں نے بطور احتجاج اپنے عہدوں سے مستعفی ہونا

شروع کر دیا۔[107]

بالآخر منعم خاں نے اصلاحات کیں۔ اس نے حکم نافذ کیا کہ جب کسی منصب دار کو جاگیر دی جائے (لیکن اس سے قبل نہیں) تو جانوروں کی پرورش کا خرچہ اس کی کل آمدنی سے نکالا جائے اور جو باقی بچے وہ اس کو بطور تنخواہ دے دیا جائے۔[108] دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جانوروں کی پرورش امرائی تنخواہ پر منحصر نہ رہی بلکہ ایک مرکزی ذمہ داری بن گئی اور اسی کے مطابق امرائی تنخواہیں بھی کم کر دی گئیں۔ اس طرح منصب داروں اور وکیلوں کے کاندھوں سے جانوروں کے خرچہ کا بوجھ ہٹ گیا۔ دراصل اس حکم کی اہمیت یہ تھی کہ جانوروں کے خرچہ کی مکمل طور پر ادائیگی کر دی جائے۔[109]

اس اصلاح سے بے شبہ منصب داروں کو کافی سہولت مل گئی لیکن اس سے مرکزی حکومت کی ذمہ داری بڑھ گئی۔ جاگیریں تقسیم کرنے کے سلسلے میں بہادر شاہ کی فیاضی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات میں شبہ تھا کہ وہ ان زمینوں کو جو امرائی کی چھوڑی ہوئی تھیں خالصہ میں رکھ بھی سکتا تھا اور ان سے شاہی جانوروں کی پرورش کے لیے خرچ بھی وصول کر سکتا تھا اس سے غالباً شاہی خزانہ کا خرچ بڑھتا ہی چلا گیا۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہادر شاہ کے عہد میں مالی بحران کا سامنا تھا۔ سننے میں آتا ہے کہ جب بہادر شاہ تخت نشین ہوا اس کو آگرہ کے قلعہ میں 13 کروڑ کی لاگت کا سکہ بند اور غیر سکہ بند سونا چاندی ہاتھ آیا۔ دورِ حکومت کے آخر تک، یہ سب خرچہ ہو چکا تھا۔ خفی خاں کہتا ہے۔ اس کے (بہادر شاہ کے) دورِ حکومت میں اخراجات کو دیکھتے ہوئے حکومت کی آمدنی ناکافی تھی۔ اس لیے سرکاری معاملوں میں سخت کفایت سے کام لیا گیا۔ خصوصاً شاہی خاندان کے اخراجات کے لیے روزانہ شاہزادہ عظیم الشان کے خزانے سے روپیہ منگوایا جاتا تھا تب جا کر کام چلتا تھا۔[110] شاہی افواج کے اسلحہ دار سپاہی اس بات کے شاکی تھے کہ ان کی تنخواہ پچھلے چھ سال سے واجب الادا چلی آتی تھی۔[111]

اس طرح بہادر شاہ کے دورِ حکومت کو سخت مالی بحران سے دوچار ہونا پڑا اور جاگیر داری نظام کے نازک حالات سے سابقہ پڑا۔ اگرچہ منعم خاں اور کچھ دوسرے امرائی نے بہت سے غلط اور بے جا اخراجات کو روکنے کی کوشش کی اور منصب داروں اور دوسرے عہدے داروں کی بے تحاشہ بڑھتی ہوئی تعداد کو قابو میں لانے کی طرف بھی توجہ کی۔ حکومت اور مذہبی عصبیت کی پالیسی

میں کافی کمزوری آگئی ہندوؤں کے ساتھ زیادہ رواداری کا سلوک اختیار کیا گیا اور اورنگ زیب کی راجپوتوں اور مرہٹوں کے ساتھ جو سخت گیری کی پالیسی تھی اس میں بھی ایک تبدیلی رونما ہوئی لیکن یہ اقدامات محض تجرباتی اور پس وپیش کے حالات میں کئے گئے تھے۔ اس لیے ان سے قابل لحاظ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تجربات کی روشنی میں بہادر شاہ ایک نیا منصفانہ اور قابل قبول طرز عمل کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اگر اس کی زندگی نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو شاید وہ مغل دور حکومت کے مسائل کے کچھ زندہ و پائندہ حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوتا۔ لیکن حالات وواقعات کے زیر اثر وہ اپنے محتاط اور معتدل طرز عمل سے کوئی خاص اور قابل لحاظ فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ نتیجتاً وہ اپنے وارثوں کے لیے اس سے زیادہ مشکلات چھوڑ گیا جو اپنے پیش روؤں سے خود اس کو ورثہ میں ملی تھیں۔

باب سوم

عہدۂ وزارت کے لیے ذوالفقار خاں کی جدوجہد

ا۔ وزارت کا مسئلہ

منعم خاں کی موت سے وہ مسئلہ سامنے آگیا جو عملی طور پر دربار کی سیاست پر آنے والے بیس سال تک جاری رہا اور وہ گویا مغلیہ حکومت کے باقی تمام دوسرے مسائل کے لیے ایک مرکزی نقطۂ نظر بن کر رہ گیا۔ یہ مسئلہ ایک موزوں اور مناسب وزیر کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ وزیر کا مقام قرون وسطیٰ کے مشرق قریب۔ نیز ہندوستانی کے انتظامیہ میں تخت نشین حکمراں کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح منسلک ہوتا ہے۔ بادشاہ وقت کے ساتھ وزیر کے تعلقات کی نوعیت ہمیشہ بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ ایک با اثر وزیر سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ نہ صرف بادشاہ کے اقتدار کو بے اثر کر دے بلکہ خود ہی حکمراں نہ بن بیٹھے۔ اس کے برعکس بے اثر اور بے رسوخ وزیر اکثر نقصان رساں ثابت ہوا ہے[1]۔ اکبر نے مرکزی حکومت کے فرائض و مناصب کو کم و بیش ہم رتبہ عہدہ داروں میں تقسیم کر کے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مالی معاملات کی ذمہ داری دیوان صاحبان کے سپرد کی تھی جنکا تقرر بنیادی طور پر ان کے انتظامی اور مالی معاملات کے تجربہ کی بنا پر ہوتا تھا اور جن کا سرکاری منصب داری کے لیے دعوے دار یا حقدار ہونا کچھ لازمی نہ تھا[2]۔ اس طرح اکبر کے وزرا شہنشاہ کے معتمد و معتبر ہونے کے سبب اہم بالشان ہوتے تھے نیز اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مالی محکمات کے سربراہ بھی ہوتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وزیر کا دربار کے منصب داروں میں سے سب سے زیادہ ممتاز منصب دار ہونا پھر سے رواج پا گیا۔ جہانگیر کے دور حکومت کے اواخر اور خاص کر شاہ جہاں کے عہد حکومت میں، منصب داروں میں سے جو سب سے زیادہ ممتاز ہوتے تھے انھیں میں سے کچھ کو وزارت کا قلمدان سپرد ہونے لگا تھا[3]۔ اورنگ زیب کے عہد میں میر جملہ کو اورنگ زیب کی تخت نشینی کے لیے کامیاب کوششیں کرنے کے صلہ میں وزارت کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ اس کا جانشین عمدۃ الملک اسد خاں ہوا۔ یہ دونوں منصب دار یعنی 7000 ذات 70:00 سوار کے بلند ترین منصب پر فائز تھے۔ علاوہ خود اپنے

عہدہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ان کو وقتاً فوقتاً اہم فوجی سربراہی بھی سپرد کی گئی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے زمانۂ وفات تک دربار میں وزیر کا بلند ترین منصب دار اور بادشاہ وقت کا خاص مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ مالی معاملات کے سربراہ ہونے کی قدیم ترین رسم کی جڑیں بھی نہایت گہری اور مضبوط ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں وزارت کے عہدہ کے ساتھ بااثر سرپرستی اور انفرادی مفادات کے زبردست مواقع بھی منسلک تھے۔ اس لیے کچھ تعجب کی بات نہیں کہ عہدۂ وزارت کے لیے شدید جد وجہد ہر دور میں نظر آتی ہے اور اس کا حصول منصب داروں اور عہدہ داروں کی حد بے پردہ کوششوں کا مرکز قرار پا چکا تھا۔

وزارت کی نہج میں اس باریک تبدیلی کے باوجود شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں وزرا بادشاہت کے مستحکم اقتدار کو نقصان پہنچانے کی کوئی طاقت نہ رکھتے تھے اور اس لیے ان سے کوئی امکانی خطرہ نہ تھا۔ ان شہنشاہوں کی انفرادی اہلیت اور مغلیہ حکومت کا زبردست وقار وزرا کو ان کے دائرے میں محدود رکھنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس وقت اس مسئلہ کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ کسی کمزور اور نااہل اور ناقابل حکمراں کے عہد میں بھی وزارت کا ادارہ اسی طرح بخوبی تمام اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا یا نہیں۔ ایسا قیاس ہے کہ اس مسئلہ نے کبھی نہ کبھی اورنگ زیب کے دماغ کو بھی پریشان رکھا تھا۔ لیکن اس کو اطمینان تھا کہ اسد خاں جس کو اس نے اس کام میں ماہر کر دیا تھا اس عہدہ کے فرائض سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوتا رہے گا۔[4] اسی کے ساتھ وہ حکومت کو تقسیم کرنے کے تصور سے بھی پُر امید تھا جس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

تخت نشینی کی جنگ میں بہادر شاہ کی کامیابی نے منعم خاں کو عہدۂ وزارت پر فائز ہونے کا موقع فراہم کیا۔ وہ ابھی تک صرف ایک معمولی منصب دار تھا۔ اور اس کا تقرر بہادر شاہ کی تخت نشینی کی جنگ میں معاون و مددگار ثابت ہونے کے صلہ میں کیا گیا تھا۔ وزیر مقرر ہونے کے علاوہ منعم خاں کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار (دو اسپہ وسہ اسپہ) منصب اور لاہور کی (غیر حاضر صوبہ داری) اور دیگر متعدد نقد وغیر نقد انعامات واکرامات سے نوازا گیا تھا۔[5] ایک طرح سے تو منعم خاں کے لیے سات ہزاری (7000) / سات ہزاری (7000) کا منصب اس کے عہدہ وزارت سے بھی زیادہ اہم تھا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر کا دربار میں امیر الامرا ہونا بشمولیت امارات خزانہ اس درجہ قابل قبول ہو چکا تھا کہ اس کا اچانک پندرہ سو کے منصب سے سات ہزاری کے منصب پر فائز کیا جانا کسی کے لیے باعث حیرت نہ ہوا اگرچہ منصب [illegible] اس قدر اچانک [illegible] تھا۔

نظر نہیں آتی۔[6] منعم خاں کو عطا کئے گئے دوسرے مراعات بھی اسی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں
موجودہ بادشاہ بہادر شاہ اور امرائیں سب سے زیادہ باثر وزیر کے درمیان تصادم کا امکان متعدد عوامل کے سبب ٹلتا رہا۔ اول تو یہ کہ منعم خاں نے کبھی بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ اس کا جو کچھ وقار تھا وہ محض بہادر شاہ کا مرہون منت تھا۔ اس لیے اس نے کبھی اپنی پچھلی خدمات یا اپنے وقار کی عظمت پر نگاہ غلط انداز نہ ڈالی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ حکومت خدا کا عطا کردہ خاص عطیہ ہے۔ اس لیے حکمرانوں پر احسان کرنے کا کوئی دعویدار نہیں بن سکتا اس لیے کسی کا ان کی کامیابی میں خود کو محرک سمجھنا محض غرور تمکنت ہے اور کچھ نہیں۔[7] دوسرے یہ کہ منعم خاں امراء کے کسی باثر گروہ کا سربراہ نہ تھا۔ اس لیے بہادر شاہ کے لیے اس کے اثرات سے خوفزدہ ہونے یا اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کا موقع نہ تھا اس نے بخوشی تمام منعم خاں کو انتظام حکومت کا بار سنبھالنے دیا اور اپنی فراست کی بنا پر اس نے نہ خود اس کے روزانہ کے معاملات میں دخل اندازی کی اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دی۔ تیسرے یہ کہ منعم خاں ایک اعلیٰ منتظم نہ بھی تاہم ایک اوسط درجہ کا قابل و ماہر منتظم ضرور تھا۔

اس نے اپنے اخلاق، علم و فضل اور قدیم عالم گیری امراء کے لحاظ و پاس کے سبب ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔[8] لیکن اتنے متعدد حسن اتفاقات کا دوبارہ یکجا ہونا ناممکنات میں سے معلوم ہوتا تھا اس لیے بہادر شاہ کو منعم خاں کا جانشین تلاش کرنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس سے وزارت کا مسئلہ سنجیدہ شکل اختیار کر گیا بہادر شاہ نے بالآخر اس مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہا کہ اکبر اعظم کی روایت پر عمل کرتے ہوئے وزارت کے فرائض کو متعدد اشخاص میں تقسیم کر دیا جائے لیکن اکبر کی روایت کو پوری طرح زندہ کرنے سے قبل ہی بہادر شاہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کے نتیجہ میں وزارت کا سوال پھر طاقت آزمائی کی آتش فروزاں کی نذر ہو گیا۔

ذوالفقار خاں اور تینوں شاہزادوں کا وفاق

اپنے اور اپنی نسل کے لیے وزارت کا عہدہ حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد ذوالفقار خاں نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے نئے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے اس کی مہم کا اصل مقصد شاہزادہ عظیم الشان کو زبردست شکست دینا تھا۔ کیونکہ وہ شاہزادہ عظیم الشان کو وزارت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا عظیم الشان' بہادر شاہ کے بیٹوں میں سے سب سے زیادہ بااثر اور لایق و فایق تھا۔ وہ اوائل عمر ہی میں اورنگ زیب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا اور اس کو بہت عزیز ہو گیا تھا۔ بنگال کی صوبہ داری یعنی 1697 تا 1706 کے عرصہ میں صوبہ کی اندرونی تجارت کو اپنی اجارہ داری میں لے کر اس نے بہت وافر دولت پس انداز کر لی تھی۔[9] بہادر شاہ کی تخت نشینی کے لیے اس کی کوششوں کا اور اول الذکر کے دربار میں اس کے اثرات کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ دولت طاقت اور اثر میں اس نے اپنے تینوں بھائیوں یعنی جہاں دار شاہ کو رفیع الشان شاہ اور جہان شاہ کو اس قدر پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ عام طور پر یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ جانشینی کی طاقت آزمائی میں ان کی کامیابی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اب ذوالفقار خاں نے حکومت کی تقسیم کے معاہدہ کو بنیاد بنا کر مقصد برآری کے لیے تینوں بھائیوں کو ایک وفاق کی شکل میں عظیم الشان خاں کے خلاف متحد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔[10]

اس طرح بااثر ترین شاہزادہ اور دربار میں بااثر ترین امیر الامرا کھلے طور پر ایک دوسرے کے دست و گریبان ہو گئے۔ ان حالات کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے آغاز ہونے والی خانہ جنگی ان تمام خانہ جنگیوں سے مختلف تھی جو اس سے قبل مغل شاہزادگان کے درمیان وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔

آخری لمحہ تک ذوالفقار خاں کو اپنی کامیابی کا یقین نہ تھا اور وہ شاہزادہ عظیم الشان سے کسی معاہدہ پر پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ذوالفقار خاں کی اصل شرائط کا تو ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ بہرحال وہ کوشش جو اس نے مشہور مورخ ارادت خاں کے توسط سے بہادر شاہ کی وفات کے فوراً بعد کی، اس کو عظیم الشان کے جانب سے اس کے ترجمان شیخ قدرت اللہ[11] نے مسترد کر دیا اور ذوالفقار خاں کو فوری طور پر سر تسلیم خم کرنے کو کہا گیا ورنہ کسی دوسری جگہ کا کوئی امکان نہ تھا۔[12] اسی طرح ان کوششوں کا بھی وہی حشر ہوا جو منعم خاں کے صاحبزادگان کے توسط سے کی گئی تھیں۔[13]

ذوالفقار خان کیا چاہتا تھا اور کس قسم کی خواہشات رکھتا تھا اس کا اندازہ حکومت کو منقسم کرنے کی اس تجویز سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے اسی زمانے میں یا اس سے کچھ قبل ہی مرتب کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق نرمدا کے جنوب کا کل خطہ جہاں شاہ کے حصہ میں آیا تھا۔ ملتان ٹھٹھا اور کشمیر رفیع الشان کے زیر نگیں ہونا تھا اور باقی جہاں دار شاہ کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ اس تجویز کا ایک خاص اور نہایت ہی عجیب پہلو یہ تھا کہ ان تینوں بھائیوں کا مشترک وزیر ذوالفقار خاں ہی کو ہونا تھا۔ وہ جہاں دار شاہ کے دربار میں رہنا چاہتا تھا جس کے نام کے سکے چلتے تھے اور تمام ملک میں اسی کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا اور وزیر اعظم اپنے نائبین کے ذریعہ دوسرے حکمراں بھائیوں کے دربار میں اپنے فرائض ادا کرنا چاہتا تھا۔[14]

اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا ذوالفقار خاں کو حکومت کو تقسیم کرانے کی تجویز حکمت عملی کا ایک حصہ تھی یا اس بات کا اقرار تھا کہ تخت نشینی کا مسئلہ کا حل ممکن نہیں یا پرانے حل کو نئے طریقے سے استعمال کرنے کا تجربہ کرنا تھا۔ حکومت کی تقسیم کی تجویز تو ہمایوں کے وقت ہی میں ناکامیاب ہو چکی تھی۔ اس کا لاحاصل ہونا شاہ جہاں کے دور حکومت اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی ثابت ہو چکا تھا۔ شاید اورنگ زیب کی طرح ذوالفقار خاں کو بھی یہ خیال ہونے لگا تھا کہ اب حکومت اس قدر وسیع تھی کہ اس کا کسی ایک مرکز کے ماتحت رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اسی لیے غیر مرکزیت کی تجویز قابل غور تھی۔ ذوالفقار خاں کی تجویز کے مطابق اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ حکومت کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے غیر مرکزیت یا حکومت کی تقسیم کی تجویز پر عمل درآمد کیا جائے۔ چنانچہ سب سے بڑے بھائی کو اتحاد اور سالمیت کا نشان بنایا جاتا تھا اور اس میں شہنشاہ اقتدار اعلی اور وزیر اعظم کو حکومت کا اصل محرک اور وزیر کو حکومت کا ناظم بنانا تھا۔ اگر اس تجویز پر عمل درآمد کر لیا جاتا تو حکمرانی کا پورا زور اور اس کی پوری قوت وزیر کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتی۔ کچھ مورخوں کے خیال کے مطابق تقسیم کی تجویز میں اولاً عظیم الشان شریک تھا اور اسی کی مرضی سے یہ تجویز مرتب کی گئی تھی۔ لیکن یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنی دولت و ثروت اور جاہ و سپاہ کے گھمنڈ میں وہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا تھا۔ چنانچہ دوسرے شاہزادوں کے سامنے بجز جنگ کے کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہ گیا تھا اور اسی لیے انھوں نے عظیم الشان کے حصے کو جہاں دار کی طرف منسوب کر دیا۔[15] بہر حال یہ بات ہرگز قرین قیاس نہیں ہے کہ عظیم الشان نے کسی ایسی تجویز سے اتفاق کیا ہو جس کے مطابق حکمرانی کی اصل قوت وزیر کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس لیے یہی سمجھنا چاہیے کہ

حکومت کی تقسیم کی تجویز محض ذوالفقار خاں ہی کی تجویز تھی اور اس کے ذریعہ وہ پوری حکمرانی کی طاقت کو اپنے ہاتھ میں مرکوز کرلینے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرلینا چاہتا تھا۔

ہم کو شاہزادوں کے درمیان جو حکمرانی کی جنگ ہوئی تھی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سبھی مبصرین اس پر متفق ہیں کہ محض ذوالفقار خاں کی قوت اور جسارت کی بنا پر باقی تین شاہزادوں نے عظیم الشان پر فتح پائی۔ عظیم الشان اپنی جگہ اس فاش غلطی کا مرتکب ہوا کہ وہ محض پیش بندیوں تک ہی محدود رہا اور وہ اس خیال خام کی بنا پر کہ چونکہ اس کا خزانہ باقی شاہزادوں کے خزانوں سے کہیں زیادہ تھا اس لیے خود اس کو کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے گی اور دوسرے شاہزادوں کی فوج خزانے خالی ہونے پر منتشر ہو کر رہ جائے گی۔ اس سے ذوالفقار خاں کو ایک چال چلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے عظیم الشان کا تعلق لاہور سے منقطع کر دیا اور لاہور کے قلعہ میں جمع شدہ خزانوں اور توپ خانوں پر قبضہ کرلیا اور عظیم الشان کو خود اس کے کیمپ ہی میں نظر بند کر دیا۔[16]

شاید عظیم الشان کے اس طرز عمل کا سبب اس کی فوج کی تعداد کا اپنے بھائیوں کی افواج کی تعداد سے کم ہونا تھا۔[17] عظیم الشان کو اپنے بھائیوں میں پھوٹ پڑنے کی توقع ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ وہ ان کی صلاحیتوں کو بہ نظر حقارت دیکھتا تھا۔ اور اسے چین قلیچ خاں اور دیگر امرائے کمک ملنے کی بھی امید تھی۔[18] لیکن اس کے بھائیوں کی مجموعی افواج کی تعداد نے اسے مغلوب کر دیا اس لئے کہ کسی بھی طرف سے کوئی کمک اس تک پہنچ سکتی اس کی افواج فاقہ کشی اور بغاوت کے سبب بہت کمزور بھی ہوگئی تھیں۔

عظیم الشان کی شکست اور اس کی موت کے بعد باقی تینوں بھائیوں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم پر تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ ذوالفقار خاں نے ابتداہی سے جہاں دار شاہ کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا سبب جیسا کہ ارادت نے اشارہ کیا ہے، شاید یہ ہو سکتا ہے کہ "جہاندار شاہ ایک کمزور شاہزادہ تھا" عیش و عشرت کا شوقین تھا اور کام سے بددل تھا چنانچہ ذوالفقار خاں جیسے وزیر کو وہ تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا تھا وہ ایسے اقتدار کا متمنی تھا جس میں اسے کسی کا ماتحت نہ رہنا پڑے۔[19] ایک دوسرے مبصر کے قول کے مطابق بہادر شاہ نے خود بستر مرگ پر جہاں دار شاہ کے حق میں اعلان کر دیا تھا۔[20]

ذوالفقار خاں کی اعانت جہاں دار شاہ کی متواتر فتح کا باعث ہوئی جو اسے اپنے دونوں

بھائیوں کے خلاف نصیب ہوئی۔ 29 مارچ 1712 کو بہادر شاہ کی وفات کے ایک ماہ بعد جہاندار شاہ باقاعدہ طور پر تخت نشین ہوا اور اسی کو شہنشاہ بننے کا فخر نصیب ہوا۔

ذوالفقار خاں بطور وزیر اعظم، اس کے اختیارات اور اس کا مقام

جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے بعد ذوالفقار خاں اپنے حق کی بنا پر وزیر بن گیا۔ وہ دکن کی نائب حکمرانی پر بھی قایم رہا جسے وہ اپنے نمائندہ داؤد خاں کے ذریعہ چلاتا رہا۔ مزید براں، اس کو نئے شہنشاہ کے ہاتھوں ایک عدیم المثال منصب یعنی دس دس ہزار دو اسپ کا منصب عطا ہوا۔[21] اور اس کو ایک شہزادہ کا منصب اور اختیارات حاصل ہو گئے۔[22] اس کا باپ پہلے کی طرح وکیل مطلق کے منصب پر قایم رہا اور اس کو (غیر موجودگی میں) گجرات کی صوبہ داری اور بارہ بارہ ہزار کے منصب بھی عطا کئے گئے۔ جہاں دار اس کی بڑی عزت کیا کرتا تھا اور اس کو (عمی) یعنی چچا کے نام سے پکارتا تھا۔[23] لیکن اسد خاں سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے سے گریز کرتا اور شاذ ہی دربار میں جاتا تھا۔ کل اختیارات ذوالفقار خاں کے ہاتھ میں تھے اور امن و جنگ کے کل معاملات میں جہاندار اسی کے مشورے کے مطابق عمل کرتا تھا۔[24] ذوالفقار خاں کے مقربین میں سے ایک امیر عبدالصمد خاں[25] کو سات ہزار کا منصب دے کر صدر بنایا گیا۔ ذوالفقار خاں کے دیوان سبھا چند کو راجہ کا خطاب دیا گیا اور اس کو دیوان خالصہ شریفہ یعنی شاہی زمینوں کا دیوان مقرر کیا گیا۔[26]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالفقار خاں نے گویا اپنی حسرت پوری کر لی تھی۔ لیکن اسے جلد ہی محسوس ہوا کہ وہ اتنے اثرات اور اختیارات کا مالک نہیں تھا جتنا وہ خود کو حقدار سمجھتا تھا اس کا سبب ان شاہی مقربین کی خفیہ مخالفت تھی جو وزیر کے سلسلے میں شہنشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتے رہتے تھے۔ ان مقربین میں سے خاص کوکل تاش خاں یعنی شہنشاہ کا دودھ شریک بھائی (کوکا) تھا ایک عرصہ تک کوکل تاش جہاں دار شاہ کا رفیق ہمراز اور مشیر تھا اور اس شاہزادہ کے تمام معاملات کا وہی منتظم اور ذمہ دار تھا۔ جہاندار نے شہنشاہ بن جانے پر کوکل تاش کو وزیر بنانے کا وعدہ[27] کیا تھا۔ کوکل تاش وزارت نہ ملنے پر سخت خفا تھا لیکن حالت کے تحت جو ہوا وہ ناگزیر تھا۔ نہ صرف کوکل تاش بلکہ اس کا کل خاندان اس کی والدہ، اہلیہ اور دختر جن کا کہ شاہی خاندان سے بہت قریب کا تعلق تھا، وزارت سے اس کو بے حق کئے جانے پر نہایت رنجیدہ تھے وہ ذوالفقار خاں کے تبدیل کئے جانے کے سلسلے میں مستقل کوشاں رہتی تھیں

وہ جہاں دار کے خدشات کو ہوا دیتیں اور اس کو یقین دلانے کی کوشش کرتیں کہ امیرالامرا کے حوصلے ایک ماتحت کی حیثیت سے کہیں بڑھ کر تھے اور وہ ہوس کو پورا کرنے کے لیے حکمرانوں اور ان کے شاہزادوں کا خون بہانے سے بھی باز نہ رہے گا۔ مزید یہ کہ وہ پہلے ہی بغاوت کا ارادہ کر چکا تھا۔ یا تو وہ تخت و تاج کو اپنے لیے حاصل کرے گا اور اگر اس نے اس میں خطرہ دیکھا تو وہ حکومت کو علی تبر خاں (یعنی عظیم الشان کا وہ بیٹا جو زندہ رہ گیا تھا) کے حوالے کر دے گا یا وہ مقید شاہزادوں میں سے کسی کو بھی جو بادشاہ سلامت کے علاوہ اس کو مفید اور پسند خاطر نظر آئے گا[28] حکومت کا سربراہ بنا دے گا۔ جہاں دار نے ان اشارات کا بہت اثر لیا کیونکہ وہ وزیر کی انتہائی تیزی و طراری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کو یقین تھا کہ کوکل تاش بطور وزیر کے اس کے خواہشات کے مطابق عمل کرنے والا ثابت ہوگا۔ چنانچہ کوکل تاش کو نو ہزاری نو ہزاری منصب سے نوازا گیا۔[29] اور اس کو میر بخشی کا عہدہ سپرد کیا گیا اور اس کے بھائی اعظم خاں کو آٹھ ہزاری منصب تک ترقی دی گئی اور آگرہ کا صوبیدار مقرر کیا گیا جبکہ اس کا برادر نسبتی زلف، خواجہ حسن خاں دوراں کو بھی آٹھ ہزاری منصب کی ترقی دی گئی اور اس کو بخشی دوئم مقرر کیا گیا۔[30] کوکل تاش کے ساتھ سعد اللہ خاں بھی شریک کیا گیا جو کہ خان سامانی کے عہدہ پر فائز تھا اور پانچ ہزاری منصب رکھتا تھا اور دربار میں بڑا اثر رسوخ اور وقار رکھتا تھا۔[31] منعم خاں کے انتقال کے بعد، سعد اللہ خاں سے ذوالفقار خاں کو وزارت سے علیحدہ رکھنے میں بہت کام لیا گیا تھا اور اسی لیے وہ موخر الذکر کے زہر آلود ارادوں سے بہت خائف رہتا تھا۔

شہنشاہ کی پس پردہ اعانت کے سہارے اس بااثر جماعت نے اعلانیہ انتظامی معاملات میں مداخلت اور وزیر کے اختیارات کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کوکل تاش کے مشورہ پر، سر بلند خاں کو، بغیر وزیر کے مشورہ کے گجرات کا نائب گورنر مقرر کر دیا گیا۔ وزیر کی مرضی کے خلاف اسی کے مشورہ سے[32] خواجہ حسن خاں دوراں کو جسے خفی خاں اس وقت کے کمترین انسانوں میں شمار کرتا ہے شاہزادہ عزیزالدین کا اتالیق مقرر کیا گیا جبکہ وہ بہار کی طرف فرخ سیر کی پیش قدمی کو روکنے کی مہم میں لگا ہوا تھا۔ وزیر کی رائے یہ تھی کہ کسی تجربہ کار اور پرانے امیر کو اس کام کے لیے مقرر کیا جانا چاہیے تھا۔ جبکہ ایک معاصر مورخ کے الفاظ میں خواجہ حسن خاں دوراں نے کبھی ایک بلی کو بھی نہ مارا تھا۔[33] کوکل تاشی جماعت کے علاوہ ایک دوسری جماعت بھی تھی جو شہنشاہ کی ہر دلعزیز ملکہ لعل کنور اس کے رشتہ داروں دوستوں اور ہم نشینوں پر مشتمل تھی۔ یہ جماعت بھی ذوالفقار خاں کی مخالف تھی۔ لعل کنور جس کو ایک رقاصہ کہا جاتا ہے[34] ایک مدت سے جہاندار کی لونظر تھی۔ ۱۳ کے تخت نشین

ہونے پر لعل کنور کے مراتب بھی بلند ہوئے یہاں تک کہ اسے شاہی نشان اور ڈھول تاشوں کے ساتھ فوج کی نقل و حرکت کو ملاحظہ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا گویا کہ وہ خود شہنشاہ بن گئی تھی۔ پانچ سو شراف سپاہ (احادیث) اس کے جلوس چلتے تھے۔[35] وہ شہنشاہ کی مستقل ہم جلیس تھی اور اس طرح وہ زبردست اثر و رسوخ کی مالک تھی۔

لعل کنور کی ذوالفقار خاں سے مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ وزیر اس کے نئے منصب یافتہ رشتہ داروں کی ان کے منصبوں کے مطابق عزت نہیں کرتا تھا۔ اور ان کو ایسے منصبوں اور مرتبوں کا حق دار نہیں مانتا تھا جو شریف خون کے لوگوں کے لیے مخصوص تھے۔ چنانچہ لعل کنور کے ایک بھائی کو ایک صوبہ کا گورنر مقرر کیے جانے کی تجویز کو ذوالفقار خاں نے یہ کہکر رد کر دیا تھا کہ اس سے امرا میں بے اطمینانی پھیلے گی۔[36] ایک دوسرے موقع پر لعل کنور کے بھائی خوش حال خاں کو وزیر اعظم کے حکم سے اس جرم کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے ایک شادی شدہ عورت پر دست درازی کی تھی۔ اس کی املاک ضبط کر لی گئی اور اس کو سالوگڑھ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ لعل کنور کو دخل اندازی کرنے کی مجال نہ تھی۔[37]

ہم عصر مصنفین، متعدد ایسی داستانیں بیان کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاندار شاہ بعض اوقات اخلاق کے معمولی معیار سے بھی گر جاتا تھا اور شاہی عظمت و جلالت کی اہانت کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔[38] لعل کنور شاہی تقرب اور سرپرستی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ اس کی ایک دوست زہرہ کے دروازے پر جو باعتبار پیشہ ایک سبزی فروش تھی، صبح سے شام تک ایسے لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا جو ترقی و تقرب کے خواہاں رہتے تھے۔[39] لعل کنور کے متعدد اعزا اور احباب نے بھی اس کے علوی مرتبت سے زبردست فائدے اٹھائے چنانچہ اس کے بھائیوں میں سے تین بھائی سات ہزاری اور پانچ ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور انھیں نہایت زرخیز جاگیریں ملیں اور ایسے عہدے ملے جن کے ساتھ فوائد تو وابستہ تھے مگر ذمہ داریاں نہ تھیں۔[40]

قدرتی طور پر امرا اور عہدے داران، شہنشاہ کا ایک عام عورت سے تعلق دیکھ کر بڑی کاہش محسوس کرتے تھے جو ایک [illegible] پیشہ سے علاقہ رکھتی تھی اور اس کے عزیز و اقارب کو اپنے ہم مرتبہ عہدوں پر دیکھ کر انھیں اپنی تحقیر محسوس ہوتی تھی۔ دوسری طرف لعل کنور ملکہ کے متعلقین اپنی تازہ [illegible] عزت کو [illegible] مشکل ہی سے ہضم کر سکتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی جسارت اور گستاخیوں سے

ہر طبقہ کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔[41] لیکن سیاسی معاملات میں لعل کنور کے اثرات کو مبالغہ آمیز انداز میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس بات کا یقین کرنے کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ لعل کنور کی عزت افزائی سے کم ذات لوگوں کی بھاری تعداد کو امرائے کے عہدہ تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ لعل کنور کے رشتہ داروں کا بھی دربار سے متعلق کسی اہم جگہ پر تقرر نہیں کیا گیا تھا اور کوئی ایسا عہدہ نہیں دیا گیا تھا جس سے انتظامی ذمہ داریاں وابستہ ہوں۔ لعل کنور کا اثر غیر سیاسی اثر تھا اور اس کے اور نور جہاں کے درمیان مطابقت یا مماثلت کی کوشش کرنا گمراہ کن ہوگا۔[42] تاہم محض اس کا شاہی تقرب اور تعلق سے منسلک ہو جانا ہی وزیر کے مرتبہ کی بلندی اور اس کے ذرائع آمدنی پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کیونکہ شہنشاہ سے ملاقات کرنے والوں اور اس کا قرب حاصل کرنے والوں سے ملنے والی رقوم آمدنی کا ایک قابل لحاظ اور باعزت ذریعہ مانا جاتا تھا۔ لعل کنور اور ذوالفقار خاں کے درمیان مخاصمت کی اصل وجہ یہ تھی۔

اندرونی رقابتوں کے ابھرنے سے حکومت کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ذوالفقار زبردست اثر کا مالک تھا اور جہاں دار میں نہ تو اس کو برخاست کرنے کی جرات تھی اور نہ وہ کھلے طور پر کسی معاملہ میں اس سے اختلاف ہی کر سکتا تھا۔[43] چنانچہ اس نے وزیر سے پیچھا چھڑانے کی خفیہ تدابیر شروع کر دیں اور اس طرح اس نے ایک زہر آلود فضا بیدار کی جس سے انتظام سلطنت کی کوئی شاخ اور کوئی شعبہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔[44]

ذوالفقار خاں کا طرز سیاست اور انتظام

اس پس منظر میں ذوالفقار خاں نے ہندو رائے عامہ کو مطمئن کرنے اور حکومت اور راجپوتوں اور مرہٹوں کے درمیان کی خلیج کو مندمل کرنے کے لیے یہ اقدامات کئے تھے تاکہ دربار میں اس کا اقتدار مستحکم ہو سکے یہ ضرور ہے کہ ان اقدامات کی صحت پر وہ یقین رکھتا تھا۔

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اعظم کے مختصر دور حکومت میں ذوالفقار خاں کے اشارے پر شاہو کو نظر بندی سے رہا کر دیا گیا تھا۔ اور جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو علی الترتیب سات ہزاری ذات سات ہزاری سوار منصب اور مرزا راجہ اور مہاراجہ کے خطابات بخشے گئے تھے۔ لیکن بہادر شاہ کے دور حکومت میں امن پسندی اور صلح و احتیاط کی پالیسی بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکی جیسا کہ مندرجہ بالا اقدامات کے بعد توقع کی جاتی تھی۔

ذوالفقار خاں نے جہاندار کی حکومت میں وزیر بننے کے بعد پھر اپنی پچھلی پالیسی کو اختیار کیا۔ سب سے اول توجزیہ ختم کر دیا گیا[45] جو ہندوؤں کے لیے ایک تفریق اور تنگ نظری کی علامت بن گیا تھا، ان لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی غرض سے اٹھا لیا گیا۔ اس طرح راجپوتوں اور مرہٹوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا گیا۔ اس کے بعد، جے سنگھ اور راجیت سنگھ کو سات ہزاری ذات سات ہزاری سوار منصب دیئے گئے اور علی الترتیب ان کو مرزا راجہ سوائی اور مہاراجہ کے خطابات بخشے گئے۔[46] اس کے فوراً بعد ہی جے سنگھ کو مالوہ کا اور اجیت سنگھ کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا گیا جے سنگھ کی موروثی حکومت میں مندسور کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح اجیت سنگھ کو بھی سوراٹھ، پلٹن اور ایدار کے علاقے بخش دیئے گئے لیکن اس کو مجبور کیا گیا کہ ناگور اندر سنگھ کو اور کشن گڑھ اور روپ نگر راج سنگھ واپس دے دے عام طور پر راجگان مطمئن تھے یا اس کی وجہ یہ تھی کہ راجپوت وکیل کے بقول شہنشاہ نے ہماری تمام ہی عرضداشتیں منظور فرمالیں۔[47] مرہٹوں کے سلسلے میں دکن کے انتظامات میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی اور ان کو بدستور قائم رکھا گیا داؤد خاں کے معاہدہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ بہر حال ایک نئی تبدیلی یہ ضرور ہوئی کہ راجہ رام (کولھاپور کی شاخ سے منسوب) کے بیٹے شواجی دوئم کو تین ہزار ذات اور دو ہزار سوار کا منصب اور انوپ سنگھ کا خطاب دیا گیا۔ ایک خلعت اور حیدر آباد کی دیش مکھی بخشنے کا ایک فرمان بھی اس کو بھیجا گیا۔[48] اس سے کولھاپور شاخ کا شاہی جاگیر تسلیم کیا جانا ظاہر ہوتا ہے جو ستارا شاخ سے کم مرتبہ تو ضرور تھی (جیسا کہ اس کے حکمراں کو چھوٹا منصب دیئے جانے سے ظاہر ہوتا ہے) تاہم یہ مؤخرالذکر اس سے کسی بھی طرح ماتحت نہ تھی۔ اس طرح ذوالفقار خاں نے پیش نظر مسائل کے ایک ایسے حل کی طرف قدم بڑھایا جو کہ مرہٹوں کے ایک گروہ کی ہمدردی حاصل کر سکتا تھا اور اسی کے ساتھ شاہی مفادات سے بھی مطابقت رکھتا تھا مدعد کی تقسیم کی تجویز کو شاہو نے تارا بائی کے سامنے 1708 ہی میں پیش کر دیا تھا لیکن اس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا تھا۔[49] نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی برقرار رہی اور اس کے سبب دکن میں بھی بدامنی قایم رہی اور دونوں دعویدار مرہٹہ اقوام شاہی سرحدوں پر چھاپہ مارتی رہیں۔[50] مہاراشٹر کی تقسیم میں شہنشاہی حکومت کا بیہی مفاد تھا یعنی اس سے مرہٹوں کے حوصلوں پر ایک قدغن لگی رہتی۔ ایسے اقدام کے لیے شاہو بھی کوئی حق بجانب شکوہ نہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ سارا بائی کی سرکوبی کرنے میں ناکام رہا تھا اور اس زمانے میں وہ اس سے بہت تنگ آیا ہوا تھا۔[51] 1711 میں تارا بائی نے مغل

دربار میں اپنا ایک وکیل، آیا مل نام کا گفتگو کرنے اور معاملات طے کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس سفیر کو اردوے پہنچ ٹھہرنے کا حکم ملا۔ اور وہیں سے گفتگو کرنے کا مشورہ دیا گیا۔[52] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کیا تھا۔ سوراج کے علاقے کی تقسیم اور دکن کی چوتھ اور سردیش مکھی دونوں شاخوں کے درمیان تقسیم ان شاخوں کا علیحدہ علیحدہ وجود تسلیم کئے جانے کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ حیدرآباد کی دیش مکھی کا کولھاپور شاخ کو ملنے کا حکم بھی اس سمت ایک اقدام ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ذوالفقار خاں کا عمل ایک اور نہایت زیرک سیاست داں نظام الملک کے عمل کی طرف اشارہ کر رہا تھا جس نے آئندہ ستارا شاخ کے مقابل کولھاپور شاخ کو کھڑا کرکے ستارا شاخ کو زیر کرنے کی کوشش کی۔

سکھوں کے سلسلے میں ذوالفقار خاں کیا پالیسی اختیار کرنا چاہتا تھا اس کی وضاحت کے لیے کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس نے محمد امین خاں کو بندہ کے خلاف مہم جاری رکھنے کے لیے مقرر کیا اس طرح بظاہر اس نے بہادر شاہ و منعم خاں کی جبر و تشدد کی پالیسی ہی کو برقرار رکھا۔ گورو گوبند کا متبنیٰ لڑکا اور اس کا قانونی طور پر مانا ہوا روحانی جانشین اجیت سنگھ مع اپنی والدہ کے مغل دربار میں موجود تھا اور اس کو ایک شاہی منصب بھی ملا ہوا تھا۔[53] شاید اس سے قبل کہ اجیت سنگھ کی امداد کی جائے یا اس کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی اقدام کیا جائے۔ بندہ (جھوٹے گرو) کی بغاوت کو کچلنا ضروری معلوم ہوا۔

جاٹوں اور بندیلوں کے سلسلے میں، بہادر شاہ کے زمانے کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی چھترسال اب بھی ایک وفادار جاگیردار تھا اور اس کو فرخ سیر کے خلاف مہم میں شاہزادہ عزالدین کی اعانت کے لیے طلب کیا گیا۔[54] چورامن جاٹ نے لاہور کی جانشینی کی جنگ میں عظیم الشان کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اس کو بھی معاف کر دیا گیا اور شہنشاہ کے سامنے اس کو آنے کی عزت بخشی گئی اور اس کا وہی منصب بحال کر دیا گیا جو 1707 میں منعم خاں نے اس کے لیے حاصل کیا تھا۔[55]

ذوالفقار خاں کی یہ کوشش تھی کہ امن پسندی کی پالیسی کی طرف رجعت کرکے حکومت کو گویا کچھ اور مدت کی زندگی حاصل ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ اس نے جو سیاسی اور انتظامی اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کر لینے کی کوشش کی اس سے قدرتی طور پر اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے وقت کے قدیم امرائیں سخت ردعمل ہوا۔ اس وقت پرانے امرائیں سے سب سے طاقتور جماعت چین قلیج خاں اور محمد امین خاں کی تھی۔ اس خاندان کی جماعت اور ذوالفقار خاں کے خاندان

کے مابین جو رقابت تھی اس پر پہلے ہی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ بہادر شاہ کے دور حکومت میں چن کا خاندان پس پردہ ہی رہا۔ چن قلیچ خاں مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے منصب سے مستعفی ہو کر دہلی میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ محمد امین خاں کو مراد آباد کا فوجدار بنایا گیا اور اس کو سکھ گرو کا تعاقب کرنے کا حکم ملا۔ آئندہ خانہ جنگی کے اندیشہ سے عظیم الشان نے چن قلیچ خاں سے رسوخ پیدا کیا۔ اور کسی بہت اونچے منصب کا وعدہ کر کے اس کو اپنی طرف ملا لیا تھا۔ جب چن قلیچ خاں نے بہادر شاہ کی موت کی خبر سنی تو اس نے ایک فوج جمع کی اور لاہور کا رخ کیا۔ لیکن وہ ابھی دہلی سے ایک ہی منزل تک گیا تھا کہ اسے عظیم الشان کی شکست اور اس کی وفات کی اطلاع ملی۔ چنانچہ اس نے اپنے سپاہیوں کو رخصت کر دیا اور دہلی لوٹ آیا۔[56]

جب ذوالفقار خاں وزیر بن گیا تو وہ اپنی طاقت سے چن قلیچ خاں کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عبدالصمد خاں کی درخواست پر جو (عبدالصمد خاں) ایک دوسرا تورانی امیر تھا شادی کی نسبت سے وہ بھی خاندان سے منسلک تھا اور ذوالفقار خاں کا حاشیہ نشین بھی تھا۔ اسد خاں نے مداخلت کی اور ذوالفقار خاں کو اپنے ارادوں سے باز رہنے پر مجبور کر دیا۔ جہاندار کے دہلی پہنچنے کے بعد چن قلیچ خاں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا اس وقت اس کو پانچ ہزاری کا منصب اور مالوہ کی صوبہ داری کا عہدہ سپرد کیا گیا۔[57] لیکن خان اب بھی مطمئن نہیں تھا اور وہ اپنے عہدے اور منصب سے مستعفی ہو گیا۔[58] محمد امین کو سکھ گرو کا پیچھا کرتے رہنے کے کام پر ہی مستقل کر دیا گیا اور اس طرح وہ دربار سے دور ہی رہا۔

اس طرح یہ طاقتور گروہ غیر متعین تو تھا ہی درہم برہم بھی ہو گیا۔ ذوالفقار خاں نے چن قلیچ خاں کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اگرچہ ایک موقع پر اس نے موخر الذکر کی ہم نوائی اس وقت کی جبکہ اس کے (چین کے) سپاہی زہرہ کے سپاہیوں سے برسر پیکار ہو گئے۔ زہرہ لعل کنور کی دوست تھی اور وہ شہر کی ایک تنگ گلی سے گزر رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ زہرہ نے چین قلیچ کی ان الفاظ سے اہانت کی کہ "اے اس نابینا کے فرزند" اس پر خاں کے ہمراہیوں نے زہرہ کے ملازمین کی خوب سرکوبی کی۔ زہرہ نے لعل کنور سے شکایت کی اور اس نے شہنشاہ سے اس سلسلے میں گفتگو کی! لیکن چین اس سے قبل ہی ذوالفقار خاں سے مل چکا تھا۔ جس نے چین کی ہم نوائی کی اور اس کے نتیجہ میں جہاں دار کو اس کے خلاف اقدام کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔[59]

جب عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر کی بغاوت نے مشرق کے علاقے میں نازک صورت اختیار

کی۔ تب اس کو احساس ہوا کہ چین قلیچ خاں واقعی اتنا اہم تھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسے سات ہزاری منصب دیا گیا اور شاہزادہ عزالدین کی فوج میں اس کا تقرر ہوا۔ لیکن خان اس تنازعہ میں حصہ لینے کا متمنی نہیں تھا اس لیے اس نے غیر جانبداری کی۔ وہ ابھی آگرہ ہی میں تھا جب کجواہ کے مقام پر عزالدین کو فرخ سیر کے ہاتھوں شکست ہوئی۔[60]

اس طرح ذوالفقار خاں قدیم امرا کی سب سے اہم جماعت کی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چین قلیچ اور محمد امین کا طرز عمل جہاندار اور ذوالفقار کی اس شکست کا بڑی حد تک ذمہ دار تھا جو انھیں فرخ سیر کے ہاتھوں نصیب ہوئی۔

چین قلیچ اور محمد امین کی جماعت کو اپنی طرف نہ لا سکنے کی ناکامی سے بھی شاید ایسی نازک صورت حال پیدا نہ ہوتی اگر ذوالفقار خاں امرا کی دوسری جماعتوں کو اپنے اردگرد جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن متعدد ایسے وجوہات تھے جن کے سبب وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ ہم عصر مورخ ارادت کے بقول وزیر بے انتہا مغرور اور بدنامی کی حد تک بدشکن ہو گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ذوالفقار خاں نے پرانے خاندانوں کو تباہ کر دینے کی ٹھان لی تھی وہ ان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے نئے نئے بہانے ایجاد کیا کرتا تھا۔ ان کی بے عزتی کرتا تھا اور ان کے مال و دولت کو لوٹا کرتا تھا۔ وہ آدمی نہایت بدنصیب تھا جو اپنی دولت مندی کے لیے مشہور ہو جاتا تھا۔ کیونکہ دولت کے ساتھ ہی الزامات لگنے شروع ہو جاتے تھے اس نے ایسے ایسے الزامات اور اتہامات لگائے کہ پرانے زمانہ میں ان کی مثال ڈھونڈ کر بھی نہیں لائی جا سکتی اور اب وہ ان ہی ذلیل کارناموں کے لیے یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ اپنے لیے تو وہ بڑی بڑی رقوم اور خراج حاصل کرتا تھا لیکن دوسروں کو وہ کوئی رقم بھی دینے میں اتنا بخل کرتا تھا کہ خود اس کے پروردہ انتہائی مفلسی کے شکار رہتے تھے وہ کسی کو جاگیر تو بخشتا ہی نہ تھا چنانچہ بلند و پست امیر و غریب قریب و دور اپنے اور بیگانے غرض سب کے خیالات اس کی طرف سے برگشتہ ہو گئے تھے اور سب کے سب اس کی تباہی کی دعا مانگتے رہتے تھے۔[61]

ان لمبے چوڑے الزامات کا قابل قبول ہونا دشوار ہے۔ در اصل ارادت خاں کوئی غیر جانب دار مبصر نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ ہی سے ذوالفقار خاں کا مخالف تھا پہلے وہ منعم خاں سے وابستہ تھا اور بعد میں عظیم الشان سے۔ علاوہ ازیں ذوالفقار خان کے اختیارات سنبھالنے کے بعد جب ارادت خاں اس کے پاس ملازمت حاصل کرنے پہنچا تو ذوالفقار خاں اس کے ساتھ مہربانی

سے پیش آیا لیکن کوئی عہدہ سپرد نہ کیا۔ چنانچہ ارادت خاں تلخ ہو کر کہتا ہے "اب کسی عہدہ میں کوئی کشش باقی نہ رہ گئی تھی کیونکہ اب ایک ایسی حکومت تھی جس کا کوئی سربراہ نہیں تھا۔ وزارت کم ظرف ظالموں اور اختیارات کے غلط استعمال کرنے والوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی"[62]

ارادت خاں اور دوسروں نے[63] جو ذوالفقار خاں پر تشدد کا عام الزام عائد کیا ہے اس کی بنیاد پھانسی قتل، قید و بند اور املاک کی ضبطی کے وہ متعدد واقعات ہیں[64] جو جہاندار کی تخت نشینی کے بعد رونما ہوئے۔ ارادت خاں تحریر کرتا ہے "اس نیک نام خانزادہ کا ایک عام دستور یہ تھا کہ اگرچہ امرائیں سے کوئی امیر اپنے تعلقات کی بنا پر میدان جنگ میں اس کا مخالف معلوم ہوتا تھا تاہم فاتح نہ تو اس کو موت کے گھاٹ ہی اتارتا تھا اور نہ اس کی تضحیک ہی کرتا تھا اس کے برعکس ایک شکست خوردہ حریف کے ساتھ وفاداری اور میدان جنگ میں شجاعت خود فاتح کے لیے پروانہ سفارش کا کام کرتے تھے۔ حکمراں جانتے تھے کہ حکومت کا استحکام اور سلطنت کا کاروبار تجربہ کار امرا پر ہی منحصر ہوتا تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "امرا کی دشمنی تخت سے نہیں ہوتی کیونکہ جیسے ہی کوئی حکمراں مستحکم طور پر تخت نشین ہو جاتا تھا وہ اسی کی وفادار رعایا بن جاتے تھے۔ اگر ہم انھیں نیست و نابود کر دیں تو حکومت کس کے ذریعہ چلائیں"[65]۔

لیکن جب شکست خوردہ شہزادوں کے وفادار، ذوالفقار خاں کے پاس ملازمت کے لیے پہنچے تو ان میں سے اکثر کو صاف انکار کا جواب دے دیا گیا[66]۔ ایسا کرنا اس سے پہلے کے طریقہ کے بالکل خلاف تھا لیکن ذوالفقار خاں کی عداوت پسندی ہی تنہا اس کی ذمہ دار نہ تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر کی بغاوت ابھی فرو نہیں ہوئی تھی۔ سزائے موت وغیرہ کے احکام کے لیے کوکل تاش کی ذمہ داری کا معاملہ بھی کچھ صاف نہیں ہے[67] لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اب اصل طاقت وزیر کے ہاتھوں میں مرکوز تھی اور وزیر حکمرانوں جیسی فیاضی کا سلوک نہیں کر سکتا تھا کیونکہ حکمرانوں کو اپنے استحکام کا یقین ہوتا تھا اور امرا سے وفاداری حاصل کرنا ان کا حق تھا۔ اس لیے وہ بے فکر ہو کر فیاضانہ سلوک کرتے تھے۔

ارادت خاں، ذوالفقار خاں پر کنجوسی اور جاگیریں دینے میں پس و پیش کرنے کا بھی الزام لگاتا ہے جبکہ وہ (وزیر) خود اپنے لیے زبردست رقوم حاصل کرتا رہتا تھا۔ جاگیروں اور منصبوں کے دینے کے سلسلے میں کنجوسی کا الزام ذوالفقار خاں کے خلاف ایک قدیم الزام تھا[68]۔ یہ یاد رہے کہ کفایت شعاری اس وقت کی سخت ترین ضرورت تھی۔ کیونکہ حکومت کی آمدنی کے ذرائع بہت

ناکافی تھے اور خزانہ خالی تھا۔[69] اپنی فیاضی میں بہادر شاہ نے خالصہ کی جاگیر کو بھی برباد کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ خود منعم خاں نے بھی ایسا کرنے کے خلاف قدم اٹھانا شروع کر دیا تھا لیکن منعم خاں بدنامی مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا اور وہ اس معاملہ ہی سے دست بردار ہو گیا کیونکہ شکلیات کا تانتا بندھ گیا تھا۔[70] لیکن ذوالفقار خاں نے وہی کر دکھایا جس کے کرنے سے منعم خاں دامن بچا رہا تھا۔

جہاں دار کے دورِ حکومت کے اوائل میں ذوالفقار خاں نے حکم صادر کیا کہ کسی منصب دار کو اس وقت تک کوئی سند نہ دی جائے جب تک کہ اس کے حقوق و دعاوی پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جائیں۔ اس طرح عہدوں میں ترقیاں بھی تحقیقات کے بغیر نہیں کی جاتی تھیں اس نے منصب داروں کو اس بات پر بھی مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ فوج کی مقرر کردہ تعداد بھی ضرور رکھیں اور منصب دار کی فوجوں سے متعلق جو قوانین تھے ان کو بھی نافذ کرنے کی طرف اس نے توجہ کی۔[71] لیکن کفایت شعاری اور قانون کا سخت نفاذ امرا کے مزاج کے خلاف تھا خصوصاً کوکل تاش کے اور شہنشاہ کے مقربین بہت شاکی ہوئے اور ان تکلف وہ قوانین پر اس بالواسطہ طریقہ سے عمل کرنے کی کوشش کی اپنا اپنا ایک نمائندہ بطور عرض فکرو (بخشش میں ملی ہوئی جاگیروں سے متعلق اہل کار) بنا دیا۔ اس سے کوکل تاش خاں اور وزیر کے مابین سخت تنازعہ پیدا ہو گیا کیونکہ وزیر مالیات کے سلسلہ میں کوئی دخل اندازی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ تنازعہ جہاندار شاہ کے حضور میں پیش ہوا لیکن وہ اعلانیہ طاقتور وزیر کی مخالفت کرنے کی جسارت نہیں رکھتا تھا۔[72] جلد ہی ذوالفقار خاں کے وضع کردہ قوانین ختم کر دیئے گئے اور شاہی مقربین کو کھل کر منصب بخشے جانے لگے۔ چنانچہ ذوالفقار کی کفایت شعاری کی کوشش نے اس کو اپنے ہی لوگوں کی نظر میں قابل نفرین بنا دیا۔

اس الزام پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پرانے امرا کی جماعت کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ ہمارے سامنے پہلے ہی چین قلیچ خاں اور محمد امین خاں کے ساتھ اس کا برتاؤ آ چکا ہے اگرچہ یہ دونوں حضرات پرانے امرا کی ایک زبردست جماعت کے سربراہ تھے۔ اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے وقت کے بہت سے امرا مرکز اور صوبوں دونوں جگہ اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے وزیر کم ذات کے نئے لوگوں کو مراتب عطا کرنے کے ضرور خلاف تھے اور اسی لیے اس نے کئی بار لعل کنور اور اس کے متعلقین کے مقابلہ میں اور ان لوگوں کی کبر و نخوت کے خلاف قدیم امرا کے مفاد کا دفاع کیا۔ تاہم ارادت خاں نے جو الزام لگایا ہے وہ پرانے امرا کے اس ایک طبقہ کے جذبات کی عکاسی ضرور کرتا ہے جو اپنے اختیارات اور اثرات سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور شاید

جن کی آمدنی کے ذرائع بھی کم ہو گئے تھے۔ [86]

مالی انتظام کے سلسلے میں ذوالفقار خاں کو اس سے بھی زائد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دکن میں اورنگ زیب کے طویل قیام سے شمالی ہندوستان کا انتظام تنزلزل ہو گیا تھا۔ مالی بحران اور جاگیرداری نظام کا جو حال اورنگ زیب کے آخری ایام حکومت میں ظاہر ہونے لگا تھا اس نے بہادر شاہ کے دور حکومت میں نہایت نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ بظاہر جو اصلاحات منعم خاں نے کیں ان سے حالات نہ سنبھل سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاندار شاہ کے زمانے میں تجارت کے پرانے طریقوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور اجارہ داری یعنی (کرایہ داری کی کھیتی) عام ہو گئی تھی۔[73] دوسرے الفاظ میں ٹوڈرمل کے ضبطی نظام کو جواب تک پورے مالگزاری نظام کی بنیاد تھا، قطعاً ترک کر دیا گیا تھا اور اب حکومت نے مالگزاری دینے والے کسانوں سے سودا طے کرنا شروع کر دیا تھا اور یہی طریقہ سرکاری اہل کاروں اور درمیان کے سب آدمیوں کے ساتھ بھی تھا یہ ان کا کام تھا کہ جو چاہیں رعیت سے حاصل کریں ظاہر ہے کہ اس سے عام لوگوں پر ظلم و استبداد کا دروازہ کھل گیا۔ اس سے جاگیروں کی اصل اور کاغذی آمدنی میں بھی بہت نمایاں فرق ہونے لگا جس سے آخر میں خود منصب داری نظام حکومت ہی کی کمر ٹوٹ گئی۔

سوال یہ ہے کہ زراعت میں اس مالگزاری نظام کے اختیار کرنے کے لیے ذوالفقار خاں کو کہاں تک ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے حالات کے نتیجے میں جو انتظامیہ کی شکست و ریخت ہوئی اس کے لیے صرف ذوالفقار خاں کو ذمہ دار ٹھہرانا تاریخی حقائق کے خلاف ہوگا اس کے سامنے مالیات کی نازک صورت حال تھی اور اس نے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سب سے زیادہ سہل اور بدیہی طریقہ اختیار کر لیا۔ سیاسی حالات کی بہتری کے بعد اپنی قوت کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے بعد شاید وہ مناسب انتظامی اصلاحات کے لیے ضرور موقع نکال لیتا۔ وقتی طور پر اس نے مالی انتظامات کو اپنے سابق دیوان سبھا چند کے ہاتھوں میں دینے پر ہی اکتفا کیا۔[74] سبھا چند اپنے منصب کے لیے نامناسب نہ تھا لیکن مالگزاری کے سلسلے میں سختی، رشوت ستانی اور بدزبانی کی بنا پر وہ نہایت قابل نفرت سمجھا جاتا تھا۔ دکن میں داؤد خاں یعنی ذوالفقار خاں کا نائب مکمل طور پر صاحب اختیار تھا لیکن اس نے بھی تمام اختیارات دکنی برہمنوں کو سونپ دیئے تھے اور خود عیش و عشرت کی زندگی گزارتا تھا۔[75] جہاندار شاہ کے دور حکومت میں غلہ کی قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ غلہ کے بیوپاریوں اور شاہی بازار کے اہل کاروں کو سزا دے کر قیمت گرانے کی متعدد

کوششیں بھی بار آور نہ ہو سکیں اور اسی سبب سے نئے دور حکومت میں پایۂ تخت کے شہریوں کی پریشانی اور بے اطمینانی میں زبردست اضافہ ہو گیا۔[76]

جہاں دار شاہ اور ذوالفقار خاں کی شکست اور ان کا زوال

ذوالفقار خاں ابھی اپنی طاقت کو مجتمع کرنے اور عموماً ہندوؤں کا اعتماد اور ان کی مفاہمت حاصل کرنے اور خصوصاً راجپوتوں اور مرہٹوں کو خوش کرنے اور ان کا دل جیتنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ مشرق میں ایک زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ عظیم الشان کے دوسرے فرزند فرخ سیر کی بغاوت تھی جیسا کہ اس کے بعد بھی بیان کیا جائے گا۔ اپنے والد کی وفات کی خبر سنتے ہی فرخ سیر نے پٹنہ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔ اپنی طرف بہار کے صوبہ دار سید حسین علی بارہہ اور اس کے بھائی، الہ آباد کے صوبہ دار سید عبداللہ خاں کو ملانے سے فرخ سیر ایک فوج مجتمع کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ آگرہ کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس علاقے کے متعدد امرا اور لاہور سے جان بچا کر بھاگے ہوئے عظیم الشان کے بہت سے ہم نوا بھی اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔

جہاندار شاہ کے دہلی پہنچنے سے قبل ہی فرخ سیر کا مقابلہ کرنے کے لیے عزالدین کی سرکردگی میں ایک شاہی فوج روانہ ہو چکی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس کو ایک کثیر رقم دے دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم ۹ کروڑ روپے تھی۔ چونکہ شاہزادہ کے متعلق خیال تھا کہ وہ ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار ہے اس لیے اسے خواجہ حسن خاں دوراں اور شاہزادہ کے دیوان لطف اللہ خاں صادق کی اتالیقی میں دے دیا گیا تھا۔ ان دونوں امرائیں سے کسی ایک کو بھی میدان جنگ کا عملی تجربہ نہ تھا۔ اور یہ تقرر وزیر کی خواہشات کے خلاف کئے گئے تھے جیسا کہ ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ جب فرخ سیر کے اردگرد امرا کی تعداد بڑھتی گئی تو دربار میں بے چینی پھیل گئی۔ عزالدین کو آگرہ سے آلہ آباد پہنچنے کا حکم ملا اور خاں کے منصب میں اضافہ کر کے (سات ہزار کا منصب دے کر) اس کو شاہزادہ کے ساتھ جانے کے لیے رضامند کیا گیا خاں دوراں اور لطف اللہ خاں کی ناتجربہ کاری اور بزدلی اور شاہزادہ عزالدین اور خان دوراں کے درمیان نااتفاقی یہ امور شروع ہی سے کمزوری کا ایک سبب بن چکے تھے۔ سپاہ بھی شکستہ دل تھی کیونکہ ایک مدت سے ان میں سے بہت سوں کی تنخواہیں

واجب الادا چلی آتی تھیں۔ مزید براں یہ کہ شاہزادہ عزالدین لال کنور سے سخت نفرت کرتا تھا اور اس کی طرف سے اسے سازشوں کا خطرہ ہر وقت لاحق رہتا تھا۔ شاہزادہ عزالدین اور خان دوران کا عین جنگ کے وقت کھجواہ سے فرار ہو جانے کا سبب یہی اندرونی اختلافات ہو سکتے تھے۔ ان کے خیمے ساز و سامان وغیرہ پر دشمن کی سپاہ نے لوٹ مار مچائی اور بہت کچھ سامان جنگ فرخ سیر اور سید برادران کے ہاتھ آگیا۔ اس سے فرخ سیر کے ساتھ آگر مل جانے کی رغبت وہاں کے ان منصب داروں کو بھی ہوئی جو ابھی تک کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ خود شاہزادہ عزالدین کے اپنے امرائیں سے بھی کچھ فرخ سیر سے جا ملے ان میں شاہزادہ کا دیوان لطف اللہ خان صادق بھی شامل تھا۔[77]

عزالدین کے فرار ہونے کی خبر سے جہاندار شاہ پہلی بار سنجیدہ طور پر اس خطرے کی طرف متوجہ ہوا۔ فوراً ایک زبردست فوج جمع کرنے اور پایۂ تخت سے چل کر دشمن سے مقابلہ کرنے کوششیں رونما ہونے لگیں۔ اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ روپے پیسے کی کمی تھی تمام جمع شدہ خزانوں کو بہادر شاہ پہلے ہی خرچ کر چکا تھا جو باقی بچا تھا وہ لاہور کی خانہ جنگی کی نذر ہو چکا تھا جہاندار شاہ کو ورثہ میں ایک خالی خزانہ ملا تھا۔ لیکن اس نے ان حالات کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ کیونکہ وہ خود اور لعل کنور جشن منانے اور چراغاں کرنے کے بہت شوقین تھے اور اس میں بے حد اخراجات ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تخت نشینی کو گیارہ مہینے ہو چکے تھے لیکن اس کی فوج کو ایک حقیر پائی بھی ادا نہیں کی گئی تھی۔

سخت پریشانی کی حالت میں جہاندار شاہ نے جس قدر بھی اس کے پاس سونے چاندی کے برتن تھے ان سب کو توڑ ڈالا اور ہیروں اور جواہرات کو اور جڑاؤ سامان کو فروخت کر دیا یہاں تک کہ اس نے شاہی محلات کی چھتوں میں لگے ہوئے سونے کو بھی اتار لیا۔ گوداموں کے دروازے کھول دیئے گئے اور سپاہیوں کو بجائے نقد کے قیمتی اشیاء بانٹی گئیں۔ اس پر بھی فوج کے واجبات ادا نہ ہو سکے۔[78]

اس طرح بابر کے زمانے سے جو قیمتی اشیاء جمع ہو گئی تھیں وہ سب کی سب ختم ہو گئیں۔ حکومت کا دیوالیہ پن مکمل ہو چکا تھا۔ اس طرح لوٹ مار کا کام دہلی کے دروازے پر جاٹوں اور مرہٹوں کے پہنچنے سے بہت پہلے خود تیموری حکمرانوں کے ہاتھوں شروع ہو چکا تھا۔ بڑی جدوجہد اور دشواری کے بعد بالآخر فوج جمع کی گئی اور ۹ دسمبر کو جہاندار آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ راجپوت

راجاؤں سے کمک مانگنے کے لیے خطوط لکھے گئے۔ لیکن اس بات کا بھی یقین تھا کہ ان لوگوں کی آمد سے قبل ہی جو ہونا ہے وہ ہو چکے گا۔[79] اس پر بھی جہاندار کی فوج فرخ سیر کی سپاہ سے بہتر تھی توپ خانے کے لحاظ سے بھی اور تعداد کے لحاظ سے بھی۔ جہاندار کے پاس 70 یا 80 ہزار گھوڑ سوار اور لاتعداد پیدل فوج تھی جبکہ فرخ سیر کے پاس "اس کا ایک تہائی بھی ۔تھا" لیکن جہاندار کی فوج پست حوصلہ اور مختلف الرائے تھی ۔ ذوالفقار اور کوکل تاش جنگ کی حکمت عملی پر بھی متفق نہ ہو سکے ۔ کوکل تاش خاں کے مشورہ پر تحفظی اقدام کرنے کے لیے جمنا کے کنارے ٹھہرنا قرار پایا اور فرخ سیر کی فوج کو پار اترنے سے روکنے کے لیے اس کی تمام کشتیوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن سید برادران نے ندی کا ایک ایسا اتھلا کنارا ڈھونڈ نکالا جس پر کوئی پہرہ نہ تھا۔ مجبوراً ایک رات کے سفر کے بعد انھوں نے ندی کو پار کیا اور جہاندار شاہ کی حالت کو دگرگوں کر دیا 10 جنوری 1713 کو جنگ ہوئی اور مقابلہ نہایت ہی سخت ہوا ذوالفقار اور کوکل تاش کے درمیان عدم مفاہمت، اس نازک وقت پر محمد امین اور چین قلیچ کی عدم توجہی اور نتیجہ رونما ہونے سے قبل ہی میدان جنگ سے جہاندار کے فرار ہو جانے سے فرخ سیر اور سید برادران کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔[80]

اس طرح جہاندار شاہ کا دور حکومت اختتام پذیر ہوا اور اسی کے ساتھ ذوالفقار خاں کی وزارت کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ اگرچہ یہ حکومت کم مدت تک ہی رہی تاہم جہاندار کا دور حکومت بہت سے اہم رجحانات کو وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ اولاً اس سے یہ ظاہر ہوا کہ کسی مطلق العنان حکمراں کے کمزور ہو جانے کی حالت میں ایک خود مختار وزیر کے وجود میں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ اگر بادشاہ میں قوت عمل اور صلاحیت و قابلیت کا فقدان ہو تو وزیر ہی ایک ایسا صاحب منصب حاکم رہ جاتا ہے جو وسیع اختیارات اور اہمیت کے پیش نظر حکومت کا لائحہ عمل متعین کر سکتا تھا اور انتظامیہ کو چلا سکتا تھا اور امرا کو زیر اثر رکھ سکتا تھا۔ لیکن ایسے حالات میں جو دشواریاں پیدا ہوتیں وہ بھی ظہور پذیر ہوئیں ۔ ایک بہت زیادہ با اختیار وزیر قدرتی طور پر بادشاہ کی نظر میں مشتبہ اور امرا کے لیے رشک و حسد کا سبب بن سکتا تھا۔ ایسی صورت میں وزیر اپنا مقام تب ہی قائم رکھ سکتا تھا جبکہ اس کا اپنا کوئی ایسا با اثر طبقہ موجود ہو تو جو کسی حریف یا حریفوں کے کسی گروہ کا مقابلہ کر سکتا ہو اور جو دربار کے باہر یعنی مرہٹوں اور راجپوتوں جیسے آزاد عناصر کی مدد حاصل کر سکتا ہو۔ اس کے نتیجہ میں وزیر کے شخصی اقتدار اور تسلط بڑھنے کا اندیشہ تھا

اور اس سے شاہی خاندان کے اور قدیم امرائیں اس خاندان کے مددگاروں سے محروم ہوجانے کا خطرہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک نئے خاندان کا عروج تھا اور لیسے امرأ کا جو بلا واسطہ محمود وزیر سے متعلق ہوتے یا پھر اس وزیر کی برطرفی اور زوال جس سے پھر وہی صورت حال پیدا ہو جاتی جو پہلے تھی جہاندا کے دورِ حکومت میں صورت حال اتنی خراب تو نہیں ہوئی جو ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔ لیکن ایسی صورت حال کے لیے جس قسم کے عوامل کی ضرورت تھی وہ تمام حالات پیدا ہو چکے تھے۔

دوسرے یہ کہ جہاندار شاہ کے دورِ حکومت میں اورنگ زیب کی پالیسی سے تیزی کے ساتھ انحراف کیا گیا جبکہ بہادر شاہ کے زمانے میں یہ پالیسیاں کسی حد تک ضرور موجود تھیں۔ چنانچہ جزیہ ختم کر دیا گیا۔ راجپوتوں کو وافر رعایتیں دی گئیں اور مرہٹوں سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے اور ان کو برقرار رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ذوالفقار خاں اکبر کے زمانے کی روایات کو زندہ کر رہا تھا اور ملک میں ایک مشترک حکمراں طبقہ کی بنیاد ڈال رہا تھا اور جس کا لازمی نتیجہ ایک قومی حکومت ہوتی جو ہندو اور مسلمانوں دونوں اقوام کے اعتماد اور امداد پر قائم ہوتی اس طرح ذوالفقار خاں نے اورنگ زیب کی اس کوشش کی ناکامی کو واضح کر دیا کہ حکومت کی سالمیت اسلام پر زور دینے اور حکمراں طبقہ کے اسلامی رجحانات کی بنیاد پر ہی قائم کی جا سکتی تھی۔

حاشیہ

باب سوم

1- مزید تفصیل کے لیے مصنف ترپاٹھی کی مسلم نظام حکومت کے چند پہلو (انگریزی) صفحہ 161، 164-161 دیکھئے۔

2- دیکھئے ترپاٹھی کی مذکورہ بالا تصنیف صفحہ 209-197

3- چنانچہ جہانگیر کے عہد میں آصف خاں اور شاہ جہاں کے عہد میں سعداللہ خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں 7000/7000 ہزار کے اعلیٰ منصبوں سے ممتاز تھے۔

4- احکام - 11

5- ب۔ن۔ صف 104، خ۔خ صف 626، کام در صف 14

6- اورنگ زیب کی وفات کے وقت منعم خاں کا منصب 1500-1000 تک کا تھا۔ لیکن جاجو کی جنگ سے قبل ہی اس کو 5000/5000 کے منصب پر ترقی دی جا چکی تھی۔ خ خ صفحہ 575۔

7- ارادت۔ صفحہ 51

8- وزیر (منعم خاں) نے بڑی کوشش کے بعد اپنے آقا کو یہ یقین دلایا تھا کہ قدیم امراء سلطنت کے ستون تھے اور نظام حکومت کی خیر و خوبی انجام دہی انھیں کے ذریعہ ممکن ہو سکتی تھی۔ ان کے مورث عظیم عہدوں پر فائز تھے اور عوام میں بااثر اور ہر دل عزیز ہو چکے تھے اس لیے مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ان سے کام لیا جائے۔ ارادت صفحہ 53-54

9- ریاض السلاطین مصنفہ غلام حسین صفحہ 246 خفی خاں جلد 2 صفحہ 686 وِ اس کے اس عمل پر اورنگ زیب نے اس کو سخت سرزنش بھی کی تھی۔

10- عبرت نامہ 9 الف مصنفہ مرزا محمد، خفی خاں صفحہ 685۔

11. ان صاحب کا نام اس عہد کے "وکیل" کے صفحات میں بار بار آتا ہے اور اس کو اس قدر بااثر بتایا جاتا ہے کہ خود منعم خاں کے صاحبزادگان اسی کے توسط سے اپنی ترجمانی کرتے

تھے۔ اسی کو 1711 میں ذوالفقار خاں کو وزارت سے علیحدگی کا سبب بتایا جاتا ہے۔ دیکھئے عبرت نامہ

29 ب۔ دیکھئے صفحات از 943 تا 946 اور 952

12۔ دیکھئے تذکرہ ارادت خاں صفحہ 76

13۔ دیکھئے۔ نورالدین۔ 9 الف

14۔ دیکھئے قاسم لاہوری کا مصنف عبرت نامہ صفحہ 42۔43، معاصر الامرا از شاہنواز خاں جلد 2 صفحہ 99، مرآۃ واردات یا تاریخ محمد شاہی از۔ محمد وارد تہرانی صفحہ 195، 217 وارد کے بقول یہ بھی طے پایا تھا کہ جہاندار ایک لاکھ اسپ، رفیع الشان اسی ہزار اسپ اور جہان شاہ ساٹھ ہزار اسپ رکھتا۔ نورالدین (14۔ الف) نے بہرحال یہ بھی لکھا ہے کہ حکومت کے یہ تمام تقسیم شدہ حصے آزادانہ طور پر ان حکمرانوں کے ذریعہ چلائے جاتے اور ان سب حکمرانوں کو بادشاہ کا خطاب ہی دیا جاتا۔

15۔ دیکھئے انشاء مادھو رام صفحہ 73 خفی خاں جلد 2 صفحہ 685۔ لیکن ملاحظہ ہو ایک معاصر خواجہ خلیل کا یہ خیال کہ ذوالفقار خاں ہی نے اس جنگ کو ہوا دی تاکہ وزارت اس کے ہاتھ آجائے (تزک شہنشاہی)

16۔ دیکھئے عبرت نامہ از مرزا محمد (9 الف) و عبرت نامہ از قاسم لاہوری صفحہ 44۔

17۔ ویلن ٹائن نے جلد 4 صفحہ 294 پر جنگ آزما افواج کا مندرجہ ذیل اندازہ پیش کیا ہے

(i) جہاندار شاہ 20 ہزار سوار 30 ہزار پیادہ فوج (ii) رفیع الشان 8 ہزار سوار 8 ہزار پیادہ (iii) جہان شاہ 25 ہزار سوار 30 ہزار پیادہ۔ 53 ہزار سوار 68 ہزار پیادہ افواج۔ (iv) عظیم الشان 30 ہزار سوار 30 ہزار پیادہ فوج۔

18۔ دیکھئے اصل کتاب ہذا کا صفحہ 76 سے آگے۔

19۔ دیکھئے ارادت صفحہ 72، قاسم صفحہ 176

کام ور صفحہ 116 تا 117 اور مرزا محمد (10 ب) یہ تمام مصنفین و مبصرین ارادت کی مندرجہ بالا رائے سے متفق ہیں۔

20۔ ویلن ٹائن (جے۔ یو۔ پی۔ ایچ۔ ایس 2.11) لیکن یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ ڈچ لوگ جہاندار کی کامیابی میں خود ہی دلچسپی رکھتے تھے۔

21۔ اخبارات سنہ اپریل 12، 1712 لیکن ہر چرن نے صفحہ 24، وارد نے صفحہ 218 اور

بی۔ ایم نے صفحہ 169 (جس کا حوالہ اردن نے جے۔ اے۔ ایس۔ بی مورخہ 1896 نمبر 161 پر دیا ہے) پر اس کا منصب بارہ ہزار کا بتایا ہے۔ کام ور صفحہ 393 نورالدین نمبر 34 ب اور یحییٰ اس کو آٹھ ہزار کا منصب بتاتے ہیں اور جوہر (اے۔ ایس۔ بی۔ ایم۔ ایس میں ف 35 کے حوالے ہے) اس کو 10 ہزار کا منصب لکھتے ہیں۔

22 ۔ اخبارات (مورخہ اپریل 3 و 7 1712 کے حوالے سے) اس کو بطور انعام کے 4 کروڑ دام 10 لاکھ ہن بطور سہ بندی کے اور یار وفادار کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔

23 ۔ بحوالہ اخبار مورخہ اپریل 1، 1712 ہرچرن صفحہ 24 ۔ وارد صفحہ 208 اور یحییٰ (118 ب) لیکن بی ایم 1690 (بحوالہ جے۔ اے۔ ایس۔ بی 96 18) کہتا ہے کہ اس کا منصب سولہ ہزار کا تھا۔ خفی خاں اور کام ور کے یہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ جب اسد خاں دربار جاتا تو یہاں جہان دار اس کے ساتھ بڑی تعظیم سے پیش آتا اور اس کو تخت کے قریب جگہ دیتا۔ (بحوالہ جوہر 35 ب)

24 ۔ دیکھئے سیر المتاخرین از غلام حسین صفحہ 392 ۔

25 ۔ عبدالصمد خاں ایک تورانی امیر تھا وہ ایک لمبے عرصہ تک دکن میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ بہادر شاہ کے دور حکومت میں وہ چمکا اور با اثر چین خاندان میں شادی کے سلسلے سے منسلک ہو گیا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ کے بعد وہ عظیم الشان سے کسی بنا پر بد دل ہو گیا جبکہ عظیم الشان ہی اس وقت سب کچھ تھا۔ مؤخرالذکر کے اشارے پر اس کی سخت اہانت کی گئی اس کی ساری املاک ضبط کر لی گئیں اور اس کو مکہ شریف کا عزم سفر کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اسی اثناء میں بہادر شاہ وفات پا گیا۔ عظیم الشان کے خلاف اس کو ایک موزوں آلہ کار سمجھتے ہوئے ذوالفقار خاں نے عبدالصمد کو طلب کیا اور اس نے بطور میر آتش کے نمایاں خدمات انجام دیں اور عظیم الشان کے خلاف خوب کام کیا (بحوالہ وارد واردن جلد 1 صفحہ 180۔190 جوہر نے (بحوالہ 36۔الف) اس کا منصب چار ہزاری لکھا ہے۔

26 ۔ بحوالہ اخبارات مورخہ اپریل 6، 1712 اروین ٹائن جلد 4 صفحہ 29 وکام ور۔ وہ ایک کائستھ تھا۔ اور ایک لمبے عرصہ سے ذوالفقار خاں کی خدمت میں رہا تھا۔ ذوالفقار خاں کے وزارت پر ناز ہو جانے پر اس کو بھی 9 سو اور 3 سو کے منصب کی بجائے 2 ہزار اور ایک ہزاری منصب دیا گیا۔ صاحب تاریخ ہندی کہتا ہے کہ وہ جمادہ 1137ھ مطابق جنوری۔ فروری 1725 کو راہی عدم ہو گیا۔ اس کی عمر 70 سال کی ہوئی۔ اس طرح وہ اس وقت 85 برس کی عمر کا ہو گا۔

27 ۔ بحوالہ وارد صفحہ 223 تا 25 خوش حال صفحہ 68، معاصر الامرا از شاہ نواز خاں جلد 2 صفحہ 100 وہ ملتان میں جہاندار کا نائب تھا اور بہادر شاہ کے وقت میں اسے 2 ہزار 5 سو اور دو ہزار دو سو پچاس کا منصب حاصل ہوا۔ اور وہ کوکل تاش کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ (بحوالہ اخبارات مورخہ جنوری 5 ر 1709۔

28 ۔ بحوالہ ارادت صفحہ 97

29 ۔ بحوالہ اخبارات مورخہ اپریل 25 ر 1712 وجوہر 35 ب ۔ معاصر الامرا جلد ا صفحہ 817 (بی۔ ایم 1690 (1896ء کے ۔جے۔ اے۔ ایس۔ بی میں جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) لیکن وارد صفحہ 218 وہر چرن صفحہ 24 پر اس کا منصب 12 ہزاری بتاتے ہیں ۔ یحییٰ صرف سات ہزاری ہی لکھتے ہیں ۔ کوکل تاش کو ملتان اور ٹھٹا کا گورنر بھی مقرر کیا گیا تھا۔ اور وہ بھاکر کا فوجدار بھی تھا (بحوالہ اخبارات نمبر 26 صفحہ مطابق اپریل 14)

30 ۔ بحوالہ اخبارات مورخہ اپریل 25 و اگست 7 ر و 25 1712 کام ور 303 ۔ جوہر 35 ب معاصر الامرا جلد ا صفحہ 817 اور خفی خاں صفحہ 716 ۔ خواجہ خلیل خاں کہتا ہے کہ خواجہ حسن کو بنگال کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس کے فرزند نصرت جنگ کو بہار کی گورنری دی گئی تھی ۔ ایک دوسرے بھائی ظفر خاں کو داروغہ فیل خانہ بنایا گیا تھا اور اسے تین ہزار تین ہزار کا منصب عطا ہوا تھا۔ بحوالہ اخبارات مورخہ اپریل 4)

31 ۔ بحوالہ معاصر الامرا جلد 2 صفحہ 506 اخبارات مورخہ 31 مارچ اور مرزا محمد در عبرت نامہ 66 ۔ الف ۔

32 ۔ دیکھئے تاریخ مظفری از ایم علی خاں انصاری صفحہ 188-89 نور الدین 38 ب ۔ ولیم ثائن اس تقرر کی تاریخ 15 جولائی بتاتا ہے جو اخبارات میں مندرجہ 2 رجب کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے ۔ ایک دوسرا اندراج مورخہ 29 مئی ظاہر کرتا ہے کہ سر بلند خاں کو ذوالفقار خان نے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا اور یہ کہ اسے پانچ ہزاری کے منصبوں کے علاوہ دوسرے تحفے تحائف بھی ملے ۔ کوکل تاش کے اشارے پر گجرات کا گورنر امانت خاں بھی مالوہ بھیج دیا گیا تھا اس پر غصہ میں آکر ذوالفقار خاں نے راجپوتوں کے راجہ کو اس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے اکسایا ۔ بحوالہ حدیقات صفحہ 23 و خفی خاں صفحہ 695 تا 697

33 ۔ "گلہ ہے دو گر بہ تیر نہ زدہ" دیکھئے عبرت نامہ از مرزا محمد 13 ب ۔ ارادت 86 کام 386

34 : - لعل کنور یا لعل کماری ارادت نے صفحہ 95 پر اور قاسم نے صفحہ 55 پر اس کو ایک مغنیہ یعنی گانے والی لڑکی لکھا ہے۔ اردن اس کو جہاندار "داشتہ" کا نام دیتا ہے۔ وہ خصوصیت خاں کی لڑکی تھی جو مشہور مغنی تان سین کی نسل سے ایک کلاونت یعنی مغنی تھا۔ (دیکھئے حقیقت صفحہ 131) ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت اس کا باپ حیات تھا کیونکہ 16 اپریل کو وہ دربار میں پیش کیا گیا تھا اور اس کے اس کے تینوں بیٹے بھی تھے۔ اس کو دربار سے ایک خلعت ایک شاہی نشان، ایک نیمہ آستین، ایک کام دار عمامہ، ایک بالا بند جڑاؤ تلوار اور خنجر۔ ازار بند وغیرہ پیش کئے گئے دیکھئے (اخبارات)۔

35 - بحوالہ اخبارات۔ وسیر صفحہ 386 وخلیل صفحہ 23 وکام ور صفحہ 385 نورالدین 37 الف وخفی خان 689 وارد 219

36 . دیکھئے خفی خاں صفحہ 689 خوش حال نے صفحہ 72 پر نام دار کا نام لکھا ہے اور صاحب سیر نے صفحہ 385 پر نعمت خاں کا نام دیا ہے جو کہ لعل کنور کا چچا تھا۔ وارد صفحہ 222 پر خوش حال خاں کو نعمت خاں کا ہی خطاب بتاتا ہے۔ زیر نظر صوبہ کا نام مختلف طور پر، وارد نے لاہور اور صاحب سیر نے آگرہ اور نورالدین نے ملتان لکھا ہے۔ دیلی ٹائن نے اس واقعہ کا ذرا بدلا ہوا حال لکھا ہے اور وہ اس تاریخ 25 اپریل بتاتا ہے۔ نورالدین کے قول کے مطابق ذوالفقار اور کوکل تاش دونوں ہی اس تقرری کے مخالف تھے۔

37 - دیکھئے سیر صفحہ 386۔ اخبارات۔ مورخہ 18 نومبر و 5 دسمبر 1713 ان میں واقعہ کو ذرا سی تبدیلی سے بیان کیا گیا ہے۔

38 - چنانچہ تمام معاصر مصنفین نے تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح جہاندار اور لال کنور ایک رتھ میں سوار ہو کر نکلے اور وہ شراب نوشی سے بہت زیادہ مدہوش ہو گئے۔ (بحوالہ خوش حال صفحہ 15، ارادت صفحہ 95، 96 خفی خاں 690 نورالدین اور دیلی ٹائن، تھوڑی بہت تبدیلی سے سبھی بیان بیان کرتے ہیں) اور دوسرے قصہ بھی ہیں جو خوش حال اور نورالدین نے قلمبند کئے ہیں۔ دیکھئے اردن جلد ا صفحات 192 تا 196

39 . بحوالہ ارادت صفحہ 95 کام ور صفحہ 385، وارد صفحہ 219 پہ لعل کنور کی منہ بولی بہن (دوگانہ) اور ایک قدیمی دوست تھی اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ کسی وقت بھی جہاندار کی داشتہ رہی ہو۔ اس نے جہاندار کی نظر میں اس بات سے وقار حاصل کیا کہ جبکہ لاہور کی خانہ جنگی میں وہ

روپئے کی طرف سے بہت پریشان تھا تو اس نے جہاندار کو ایک لاکھ روپے پیش کئے تھے۔ (بحوالہ اخبارات مورخہ 4 اپریل 1712)

40۔ دیکھئے جوہر (35 ب) جہاں پر وہ اس کے بھائیوں کے منصب کی تفصیل اس طرح دیتا ہے۔ خصوص خاں - 7000 - 7000 - نام دار خاں 5000 - 5000 - خوش حال خاں 5000 - 5000 - نعمت خاں - 5000 - 5000 - وارد (صفحہ 219) پر لکھتا ہے کہ ان کو سات ہزار سے لے کر نو ہزار تک کے منصب دیئے گئے۔ جوہر نے بھی لکھا ہے کہ لعل کنور کے ذریعہ بہت سے کلاونتوں کو 5 ہزار سے لے کر 7 ہزار تک منصب حاصل ہوئے۔

41- چنانچہ کام ور صفحہ 385 پر لکھتا ہے کہ "لعل کنور کے بھائی جو طبلہ اور ستار بجانے والے تھے دہلی کی سڑکوں پر ہر قسم کی قانون شکنی کرتے پھرتے تھے۔" خفی خاں صفحہ 389 پر لکھتا ہے کہ "یہ وقت گانے بجانے والوں اور بھانڈوں اور رقاصوں کے لیے بڑی ہی عیش و عشرت کا تھا۔" محمد عیش آشوب نے بھی اسی انداز کی رائے کا اظہار کیا ہے دیکھئے تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہی از محمد بخش آشوب۔

42۔ کام ور کے قول کے مطابق (دیکھئے صفحہ 385) نور جہاں کا زمانہ گویا لعل کنور کے لیے دوبارہ واپس آگیا تھا۔ اور اس کے نام کے سکے ڈھالے گئے۔ لیکن اگر ایسے سکے ڈھالے گئے تھے تو وہ ابھی تک ہماری معلومات سے باہر ہیں۔

45- بحوالہ اخبارات مورخہ 7 اپریل 1712 یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ اقدامات جہاندار شاہ کی فتح کے 9 دن بعد ہی کئے گئے اور وہ بھی اورنگ زیب کے وزیر اور مدت العمر کے دوست اسد خاں کے مشورہ کے مطابق۔ ملاحظہ کریں مصنف ہذا کا مضمون بعنوان "اورنگ زیب کے بعد کے زمانے میں جزیہ" بحوالہ انڈین ہسٹری کانگریس کی روداد مورخہ 1940 صفحات 320 - 327 تک۔

46 بحوالہ جے ریکارڈس "مختلف مقالات جلد 2 صفحہ 21. اس فرمان کی تاریخ 3 ربیع 1/10 اپریل 1712 وکیل مذکور کا خط اور رپورٹ مورخہ 5 سودی چیت 69 مطابق 14 اپریل

47. بحوالہ اخبارات مورخہ 25 نومبر، وکیل کی رپورٹ مورخہ 30 نومبر اخبارات کے اندراج پر یہ جادو ناتھ سرکار کا پنسل سے لکھا حاشیہ پر یہ نوٹ موجود ہے: "اگر جہاندار نے یہ تقرر کئے تھے تو یہ محض کاغذی کارروائی تھی۔" صاحب عبرت نامہ مرزا محمد (بحوالہ 59 الف) بہر حال

کہتا ہے کہ جیسے ہی اجیت سنگھ گجرات کے لیے روانہ ہوا۔ اس کو خبر ملی کہ فرخ سیر کی بغاوت نازک موڑ اختیار کر چکی تھی چنانچہ اس نے روانگی کا ارادہ ترک کر دیا۔

48۔ بحوالہ اخبارات مورخہ 7ر ستمبر 1712

49 بحوالہ ریاست (13) شاہو نے درناندی کے جنوب کا علاقہ دینے کی پیش کش کی تھی

50 دیکھئے اصل کتاب کے پچھلے صفحات نمبر 46 تا 49

51 1711 و 1712 میں شاہو اپنی حالت کے نقطۂ زوال کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا تھا۔ مغلوں کی طرف کوچ کرنے والوں کے سبب شکست پر شکست کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا چنانچہ 1710 میں راؤ رمبھا داؤد خاں سے آملا۔ بحوالہ اخبارات مورخہ 12 ر اکتوبر اور 1711 میں چندر سین دفتی طور پر اس تک پہنچا (بحوالہ اخبارات مورخہ جون 28 ۔ 1711)

52 بحوالہ دی۔ دی۔ 9.44

53 بحوالہ ہرچرن (فولیو 145ب) اجیت کو جہاندار کے سامنے 23 مئی 1712 کو پیش کیا گیا۔ (بحوالہ اخبارات)

54 بحوالہ اخبارات مورخہ 29 ر اکتوبر و 8 ر دسمبر۔ چورامن نے فرخ سیر کے خلاف جہاندار کی اعانت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جیسا کہ اس کی عادت تھی اس نے دونوں کو لوٹا اور جنگ کے دوران سخت بدنظمی پیدا کی۔

55 بحوالہ اخبارات مورخہ 26 جمادہ سال دویم۔ مطابق ا ر نومبر 24 ر 1707 اس نے سکھوں کے خلاف مہم میں بھی حصہ لیا تھا۔

56 بحوالۂ عبرت نامہ از مرزا محمد (99ب)

57 بحوالۂ اخبارات مورخہ 21 و 24 جون و مرزا محمد (100الف)

58 بحوالۂ اخبارات مورخہ 6ر اگست۔ اس کی جگہ پر شہادت خاں مالوہ کا گورنر ہوا۔

59 بحوالۂ ارادت صفحہ 83 و سیر صفحہ 386

60 بحوالۂ مرزا محمد 100 الف) و خفی خاں 700، 716

61 بحوالۂ ارادت، صفحات 96 تا 98

62 بحوالۂ ارادت 100 تا 101

63 دیکھئے کام ور 124 الف)، وارد (225 ۔ 26) خفی خاں 733 مرزا 66 الف

64 نظر بند امرا میں یہ امرا بھی تھے۔ مہابت خاں اور خان زماں (منعم خاں کے فرزندان) حکیم الملک (جہاں شاہ کا خاص طبیب اور مشاور) عقیدت خاں (امیر خاں کا بیٹا)۔ ہدایت کیش خاں 1109ھ مطابق 88-1687ء سے لے کر واقعہ نگار کل) محمد علی خاں (جہاں شاہ کا بخشی) اسلام خاں میر آتش، حمید الدین خاں عالمگیری۔ سرفراز خاں بہادر شاہی۔ امین الدین سنبھلی اور ان کے علاوہ بیس کے قریب اور دیگر امرا بھی تھے۔ بحوالہ خضر خاں 688 و اخبارات اندراج مورخہ 23 صفر مطابق 4 مارچ)

65 بحوالہ ارادت صفحہ 19

66 نورالدین (35ب) کہتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں دو ہزار سے تین ہزار تک کی تعداد میں ملازمین بے روزگار ہو گئے تھے۔

67 رستم دل، مخلص خاں اور شاہزادہ محمد کریم کے قتل کا حکم کوکل تاش خاں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بحوالہ آشوب صفحات 125-26) کہا جاتا ہے کہ رستم دل نے لعل کنور پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ فرخ سیر کے سوال کے جواب میں بعد کو ذوالفقار خاں نے ان تمام قتلوں سے خود کو بری الذمہ ٹھہرایا دیکھئے مرزا مرزا محمد (22ب) و خفی خاں (732 - 33) ارادت صفحہ 97 پر کہتا ہے کہ ذوالفقار خاں جسے کوکل تاش کی طرف سے عداوت کا خوف تھا، وہ اس طرح اپنے دشمنوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

68 دیکھئے بہادر شاہ نامہ از نعمت خاں عالی صفحہ 416

69 ملاحظہ کیجئے خفی خاں (جلد 2 صفحہ 684) بہادر شاہ کے زمانے میں حکومت کی آمدنی اخراجات کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ اس لیے سرکاری دفاتر میں سخت کفایت شعاری سے کام لیا جاتا تھا اور خاص کر شاہی گھرانے کا تو یہ حال تھا کہ روزانہ روپیہ عظیم الشان کے خزانے سے منگایا جاتا تھا تاکہ کام چل سکے۔

70 دیکھئے اصل کتاب کا صفحہ 58

71 بحوالہ اخبارات مورخہ 22 صفر و 16 جمادی الاول مطابق مارچ 31 و جون 21-

72 بحوالہ اخبارات۔ مورخہ 2 ربیع الاول و 29 صفر مطابق اپریل 9، و اپریل 7

73 دیکھئے وارد - (6) کہا جاتا ہے کہ وزیر اور دوسرے شاہی اہل کار بھی رشوت ستانی کے

عادی ہو گئے تھے۔ دیکھئے معاصرالامرا جلد 3 صفحہ 127۔

74 دیکھئے کام ور دخفی خاں 689

75 دیکھئے مرآۃ احمدی از احمد علی خاں 403 دخفی خاں 964 و 748۔

76 دیکھئے اخبارات مورخہ 22 صفر 17 جمادی الاول 19 جمادی الثانی 13 رمضان (غلہ پر ابواب کا امتناع۔ غلہ کے چودھریوں کو پابستہ دربار میں پیش کیا گیا) مورخہ 31 مارچ 22۔ جون 24 رجولائی 14 راکتوبر۔ دیکھئے خوش حال صفحہ 91 و 218

77 دیکھئے۔ خفی خاں صفحہ 717 دکام ور

78 بحوالہٗ وارد 48۔ 247 وا ردن 21۔ 220

79 بحوالہٗ اخبارات جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو فرمان 3 ربیع الاول مطابق 10 اپریل ہی بھیج دیئے گئے تھے جن کی مدد سے ان کو دربار میں طلب کیا گیا تھا اور ا ربیع الثانی مطابق 8 مئی ان کو قانونی طور پر شاہزادہ عزالدین کی فوج کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا اور شاہی فرمان بردار ان کو دربار تک لانے کے لیے روانہ کر دیئے گئے تھے۔ لیکن راجاؤں نے حاضر ہونے میں دیر لگائی۔

80 بحوالہ مرزا محمد 15 الف) د وارد 259 - 255 دخفی خان 700 و 24-718 و ایجاد 188 ب و 91 الف) نیز ملاحظہ ہو اردن 236 - 219

باب چہارم

سید برادران کی نئی وزارت کے لیے جدوجہد

سید برادران کے تعاون سے فرخ سیّر 1713 میں بادشاہ بنا۔ 1713 سے 1721 تک کی مدت کو سید برادران کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ کے شروع میں سید برادران اور فرخ سیّر کے بیچ تناؤ کی وجہ سے حکومت میں کئی بار سنکٹ کے حالات پیدا ہوئے اس تناؤ کے نتیجہ میں 1719 میں فرخ سیر کو تخت سے ہٹا دیا گیا اور کچھ دنوں بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ شہنشاہت کی پوری طاقت اب ان بھائیوں کے ہاتھ میں مرکوز ہو گئی لیکن اس وقت خاص اہمیت وزیر اور میر بخش کی شکل میں سید برادران کا فرخ سیّر کی مخالفت میں حکومت کے اوپر اپنا قبضہ جمانا نہیں ہے بلکہ اس تنازعہ میں حکمراں طبقہ کے کردار اور مغل حکومت کی شکل اور اس کی بنیادی پالیسیوں کو طے کرنے کے مسائل پوشیدہ ہیں۔

سید برادران عبداللہ خاں اور حسین علی خاں اپنے خاندان کی پیدائش موسو پٹامیا کے قدیم سید خاندان سے جوڑتے تھے۔ مغلوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے ابوالعزم نام کا آدمی ہندوستان آیا۔ اور میرٹھ و سہارنپور کے علاقے میں اپنے خاندان کے ساتھ بس گیا کہا جاتا ہے کہ بارہ گاؤں بسانے کی بنیاد پر انھیں بارہا سید کہا جانے لگا۔ اکبر کے دور حکومت سے ہی بارہا کے سید بہادر اور جنگجو سمجھے جاتے تھے اور مغلیہ فوج کے ہراول دستہ کی کمان انھیں وراثتاً حاصل تھی۔ ان کے زیادہ تر ازدواجی تعلقات ہندوستانی امیروں کے ساتھ تھے اور ان کا رہن سہن اور طور طریقہ ہندوستانی تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں عبداللہ خاں بارہا

جو سید میاں کے نام سے مشہور تھا بیجاپور اور اس کے بعد اجمیر کے صوبہ دار کے عہدہ پر فائز رہا تھا۔ مگر اورنگ زیب کا خیال تھا کہ بارہا سیدوں کے ساتھ حکومت میں ڈھیل دینا اپنی بربادی کرنا ہے کیونکہ یہ لوگ ذرا سی ڈھیل پر مغرور ہو جاتے ہیں اور "ہمچو ما دیگرے نیست" ہمارے جیسا دوسرا نہیں کہاوت پر عمل کرتے ہوئے حکم ماننے کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں اور سازشیں کرنے لگتے ہیں۔

سید میاں کے دونوں بڑے بیٹے حسین علی اور عبداللہ خاں اپنی بہادری کی وجہ سے اورنگ زیب کے دور حکومت میں ہی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ 1700 میں سید عبداللہ خاں نے مراٹھا سردار ہنومنت کے خلاف جنگ میں ہمت اور جنگی مشاقی کا ثبوت دیا تھا اس نے ہنومنت کے پڑاؤ کو لوٹ کر اس کے بھانجے جانوجی کو قیدی بنا لیا تھا اور اسے مسلمان ہونے کے لیے مجبور کیا تھا اس جرات کے نتیجہ میں اورنگ زیب نے انھیں دو خلعت اور کٹاریں بھیجیں لیکن ان کے منصب میں ترقی کی تجویز کو نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد عبداللہ خاں شاہ عالم کے بڑے بیٹے جہاندار شاہ کی خدمت میں ملتان میں رہا لیکن 1703 میں جھگڑا کر کے وہ لاہور چلا آیا اور وہاں کئی سال تک بیکار بیٹھا رہا۔ اس کا چھوٹا بھائی حسین علی خاں ابتدا میں فتحپور اور بعد میں ہنڈون و بیانہ کا فوجدار رہا۔

جاجوں کی جنگ میں دونوں بھائیوں نے بہادر شاہ کی طرفداری میں جنگ کی۔ بہادر شاہ نے عبداللہ خاں کو سہ ہزاری اور حسین علی کو دو ہزاری منصب عطا کیا۔ جاجوں میں سید برادران بڑی جرات اور دلیری سے لڑے۔ اور ان کے ایک بھائی نورالدین علی خاں نے جنگ میں شہادت پائی اور حسین علی خاں زخمی ہوا لیکن بہادر شاہ کے دربار میں انھیں خاص ترقی نہیں ملی۔ 1708 میں عظیم الشان نے حسین علی کو بہار میں اپنا نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ عبداللہ خاں مزید کئی سال بیکار رہا۔ راجپوتوں کے ساتھ لڑائی کے وقت بہادر خاں نے اسے اجمیر کی صوبہ داری دینے کی تجویز رکھی لیکن عبداللہ خاں کی بڑھی چڑھی مانگوں کی وجہ سے اس نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ 1710 میں سکھوں کے خلاف آمنت پور کی جنگ میں عبداللہ خاں نے پھر بہادری اور جرات کا ثبوت دیا۔ آخر میں 1711 میں عظیم الشان نے

وراثت کی ممکنہ جنگ کے لیے اپنا ہاتھ مضبوط کرنے کے مقصد سے عبداللہ خاں کو الہ آباد کا نائب صوبہ دار مقرر کیا۔

اس طرح سید عبداللہ خاں اور سید حسن علی خاں دونوں ہی کو عظیم الشان کی مہربانی سے اپنے عہدے حاصل ہوئے۔ لاہور کی خانہ جنگی میں عظیم الشان کی وفات کے بعد اس کے دوسرے بیٹے فرخ سیر نے جب بغاوت کا علم بلند کیا تو وہاں کے نائب صوبہ دار حسین علی کو اس سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا پس منظر یہ بھی تھا کہ فرخ سیر جو لاہور کی جنگ سے دو ماہ قبل پٹنہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ حسین علی کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں تھے۔ جنوری فروری 1712 میں فرخ سیر کے رہتاس کے قلعہ پر دغا بازی سے قبضہ جمانے سے حسین علی ناراض تھا۔ 15 مارچ 1712 میں بہادر شاہ کی موت کی خبر پاتے ہی اور خانہ جنگی کے نتائج سے پہلے ہی فرخ سیر نے اپنے باپ عظیم الشان کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت حسین علی کچھ باغیوں کے خلاف راج گیر کی طرف گیا ہوا تھا اس کے ساتھ صلاح ومشورہ کیے بغیر فرخ سیر کے اس اعلان کی وجہ سے حسین علی اور فرخ سیر میں اختلاف بڑھ گیا ایک ہم عصر مورخ کے مطابق حسین علی کا ارادہ تھا کہ فرخ سیر کو جس کے پاس سپاہیوں کی تعداد کم تھی قیدی بنائے لیکن فرخ سیر کے بخشی احمد بیگ نے جلدی ہی ایک بڑی فوج تیار کر لی دوسری طرف فرخ سیر نے بھی حسین علی کو بڑے عاجزانہ اور انکسارانہ خطوط لکھے۔ آخر میں حسین علی نے اس کا ساتھ دینا منظور کر لیا۔

لاہور کی جنگ میں عظیم الشان کی موت کی خبر سننے کے بعد حسین علی نے اپنی جانب داری بدلنا چاہی۔ فرخ سیر بھی مایوس ہو کر خودکشی کرنے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اس کی ماں خود حسین علی کے پاس گئی اور اسے عظیم الشان کے پرانے احسانوں کی یاد دلائی اور اس کے بیٹوں کو حکومت میں سب سے اعلی عہدہ دلانے کی یقین دہانی کی۔ مورخ نورالدین کے مطابق اس نے کہا۔

"اگر وہ ہار جاتے ہیں تو قیامت کے دن تک ان کا نام بہادروں کی صف میں گنا جائے گا اور اگر کامیاب ہوتے ہیں تو سارا ہندوستان ان کے قدموں کے نیچے ہوگا اور ان کے اوپر صرف بادشاہ ہوگا۔"

حسین علی کے ذریعہ فرخ سیر کی طرفداری نہ چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اس بات کا بڑا ملال تھا کہ ذوالفقار خاں نے جہاندار شاہ کے دربار میں ساری قوت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

حسین علی کے فرخ سیر کا ساتھ دینے کے بعد بھی دونوں کا اختلاف ختم نہیں ہوا۔ پٹنہ میں موجود انگریزی کمپنی کے ایجنٹ کے مطابق فرخ سیر اور حسین علی کے درمیان اختلاف اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس وقت دو گروہ ہو گئے۔ اس وقت کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ فرخ سیر پٹنہ کے سبھی ملکی اور غیر ملکی تجاروں سے دولت وصول کرنا چاہتا تھا لیکن حسین علی اس کا مخالف تھا اسی وقت خواجہ عاصم "خان دوراں" لاہور کی جنگ سے بچ کر پٹنہ جا پہنچا۔ اس کی کوششوں اور اثر کی وجہ سے حسین علی اور فرخ سیر کے بیچ کا اختلاف کچھ کم ہو گیا۔

فرخ سیر اور حسین علی کے اختلافات بنیادی طور پر اس وقت ذاتی تھے اور ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حسین علی اس بات سے ناراض تھا کہ فرخ سیر نے بھوج پور کے زمیندار سدھسٹ نارائن کو اپنا دوست بنا لیا جب کہ حسین علی کے ساتھ اس کے تعلقات پہلے سے ہی دشمنانہ تھے اس وقت پالیسی کا سب سے اہم قدم جزیہ کا ختم کرنا تھا حسین علی کی صلاح سے یہ کام فرخ سیر نے پٹنہ ہی میں کیا۔

فرخ سیر کی مستقبل کی پالیسی کے لیے اس ابتدائی اعلان کی ایک خاص اہمیت ہے 18 ستمبر 1712 کو فرخ سیر نے پٹنہ سے کوچ کیا اور نومبر میں وہ الہ آباد پہنچا وہاں پر سید عبداللہ نے بھی ذاتی وجوہات کی بنا پر فرخ سیر کا ساتھ دینا منظور کیا۔ عبداللہ خاں ایک کامیاب منتظم نہیں تھا وہ اپنے سپاہیوں کی پچھلی تنخواہیں نہیں ادا کر سکا تھا بہادر شاہ کی وفات کے وقت بنگال کے دیوان مرشد علی خاں کے ذریعہ بھیجا گیا 28 لاکھ کا خزانہ الہ آباد کی سرحد پر تھا عبداللہ خاں نے اسے ہتھیا لیا اور اس سے اپنے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دیں۔

جہاندار شاہ عبداللہ خاں سے پہلے ہی سے ناراض تھا کیونکہ اس نے اس کی خدمت چھوڑ کر عظیم الشان کی خدمت منظور کی تھی۔ اس لیے جہاندار شاہ نے عبداللہ خاں کو الہ آباد کی نائب صوبہ داری کے عہدہ سے ہٹا دیا ان حالات میں عبداللہ خاں

کے لیے فرخ سیر کی تائید کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ تو یہ عبداللہ خاں نے جہاندار شاہ کو بھی ایک عرضداشت بھیج رکھی تھی۔ مندرجہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہے کہ سید برادران اور فرخ سیر کے درمیان اختلاف کی وجہ خان دوران اور میر جملہ نہیں تھے جن پر بادشاہ مہربان تھے حقیقت تو یہ ہے کہ خان دوراں کا اثر ابتدائی دور میں دونوں گروہوں کے درمیان دوستی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوا لیکن بعد میں بادشاہ کے ان معتمدوں کی آپسی پھوٹ اور پرفریب برتاؤ نے حالات کو اور زیادہ خراب کر دیا سید برادران نے بھی فرخ سیر کی جانبداری اس کے باپ کے احسانوں کے بدلے میں نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کی۔

سید برادران کے اختیارات اور ان کی عام پالیسی

بادشاہ بننے کے بعد فرخ سیر نے عبداللہ خاں کو وزیر اور حسین علی خاں کو میر بخشی کا عہدہ دیا اور دونوں کو ہفت ہزاری منصب عطا کیا۔ عبداللہ خاں کو ملتان اور حسین علی کو بہار کی صوبہ داری پر فائز کیا اور انھیں یہ صلاح دی گئی کہ وہ اپنے صوبوں کا انتظام اپنے نائبوں کے ذریعہ کرائیں۔ ان کے چھوٹے بھائی سید نجم الدین علی خاں اور ان کے دوسرے چھوٹے بھائی، رشتہ داروں کو بھی اعلیٰ منصب دیئے گیے۔ عبداللہ خاں کے ماموں مظفر خاں کو بارہا اجمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ان عہدوں کے علاوہ سید برادران نے اپنے دوسرے عزیزوں کے لیے اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت کو عزت و پائندگی دینے کے لیے پرانے عالمگیری و بہادر شاہی امیروں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اس لیے زیادہ تر پرانے امیروں کو اپنے اپنے عہدوں پر رہنے دیا گیا اگر سید برادران کا بس چلتا تو اسد خاں و ذوالفقار علی خاں کو جنھیں عظیم الشان اور اس کے بیٹے کی موت کے لیے مجرم ٹھہرایا گیا تھا معاف کر دیا جاتا اور انھیں پھر سے اعلیٰ عہدے دیئے جاتے لیکن فرخ سیر اس سے متفق نہیں تھا اس نے ان دونوں خاص امیروں اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو قیدی بنا لیا ذوالفقار خاں کو پھانسی دیدی گئی اور اسد خاں کو ذلیل کیا گیا اس کا منصب چھین لیا گیا۔ حقیقت میں فرخ سیر کا یہ فعل ناعاقبت اندیشانہ تھا اور حکومت و شاہی خاندان دونوں کے حق میں غلط تھا۔ یہ

دونوں تجربہ کار اور با اثر امیر سید برادران کی جاہ طلبی کی خواہش پر روک لگانے میں معاون ہوسکتے تھے۔ بعد میں فرخ سیر نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ سید برادران فرخ سیر کے اس فعل سے خوش نہیں تھے۔ حسین علی نے اس کا نتیجہ نکالتے ہوئے فرخ سیر کے بارے میں کہا: "وہ احسانمندی نہیں جانتا اعتماد کو نہیں جانتا اور اپنے قول و فعل میں صرف غیر مستقل ہی نہیں بلکہ اس کے توڑنے میں اسے کوئی شرم نہیں۔"

دربار میں اب صرف ایک طاقتور گروہ رہ گیا تھا۔ جس میں چن قلیچ خاں، محمد امین خاں اور عبدالصمد خاں شامل تھے۔ عبداللہ خاں اس گروہ کی اہمیت کو اچھی طرح سے سمجھتا تھا اس لیے اس نے چن قلیچ خاں کے توسل سے اس گروہ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عبداللہ خاں کے مشورے سے چن قلیچ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کے منصب کے ساتھ نظام الملک کا خطاب دیا گیا اور اسے دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ دکن کے نائب صوبہ دار داؤد خاں ہی کو گجرات کا نائب صوبہ دار بنا دیا گیا۔ نظام الملک کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے اور اپنے معاونین کے لیے جاگیریں چن لے۔ اور وہاں کے خصوصی زمینداروں کے منصب طے کرنے کے لیے صلاح دے۔ عبداللہ خاں اکثر یہ کہتا کہ وہ نظام الملک کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتا ہے۔ نظام الملک کے دکن کو کوچ کرنے سے پہلے عبداللہ خاں خود اس کی رہائش گاہ پر گیا اور دوستی کی نشانی کے طور پر دونوں نے بیش قیمت تحائف کا تبادلہ کیا۔ محمد امین خاں کو دوم بخشی کا عہدہ اور اعتماد الدولہ کا خطاب دیا گیا۔ حالانکہ عبدالصمد خاں ذوالفقار خاں کا خصوصی معاون تھا لیکن نظام الملک کا رشتہ دار ہونے کے ناطے اسے سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب دیکر لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ عبدالصمد خاں حکومت کے انتظام میں کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے سکھ و افغان باغی عناصر کو کچل کر وہاں پر امن قایم کیا۔ عام طور سے دوسرے صوبوں میں امیر اپنے سابق عہدوں پر قایم رہے۔

بادشاہ کے قابل اعتماد لوگوں کا تقرر جن عہدوں پر ہوا وہ دربار کی نظر میں اس لیے اہم تھے کہ ان سے بادشاہ کی قربت قایم کی جاسکتی تھی۔ ان تقرریوں کی وجہ سے سید برادران اور فرخ سیر کے اختلافات بڑھے۔

خاص عہدوں پر تقرری کے بعد فرخ سیر اور سید برادران کے سامنے راجپوتوں

مرہٹوں سکھوں اور ان سے متعلق دوسرے مسائل کے لیے ایک اعلیٰ پالیسی طے کرنے کا مسئلہ آیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ بہار میں پڑاؤ کے وقت ہی فرخ سیر نے حسین علی کے مشورے سے جزیہ کو ہٹانے کے لیے فرمان جاری کر دیا تھا۔ حصول تخت کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد آگرہ میں فرخ سیر نے دوبارہ اس حکم نامہ کی تائید کی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر صحیح طور پر عمل 2 اپریل 1713 کو کیا گیا جب حسین علی نے بادشاہ کو ایک عرضداشت میں لکھا کہ اس کے متعلق دفتر دیوانی کو پروانہ بھیج دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اودے پور کے مہارانا کے وکیل بہاری داس نے عبداللہ خاں کو مشورہ دیا کہ ہندوؤں کی مخالفت کی وجہ جزیہ ہے اور اگر وہ جزیہ کو ہٹا دے گا تو ان کی جڑیں اور مضبوط ہوں گی۔ عبداللہ خاں نے اس صلاح کو منظور کر لیا اور بادشاہ کو جزیہ ہٹانے کے لیے راضی کر لیا۔ اسی طرح بہت سے مقامات پر سے سفری محصول بھی ہٹا دیا گیا۔

(اخبارات 3 اپریل 1713)

ہندوؤں کے پالکی پر بیٹھنے اور ایرانی و عربی گھوڑوں کے استعمال پر سابقہ پابندی کچھ دنوں تک برقرار رہی۔

جہاں تک راجپوتوں کا تعلق ہے فرخ سیر کے بادشاہ بننے کے بعد جے سنگھ، اجیت سنگھ اور دوسروں نے مبارکباد کے خطوط بھیجے جو بادشاہ کو پیش کیے گئے۔ فرخ سیر نے حسین علی کے مشورہ سے راجہ جے سنگھ، اجیت سنگھ اور دیگر راجاؤں کے پاس خطوط بھیجے کہ وہ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوں۔ ساتھ ہی مہارانا سنگرام سنگھ کو دوستانہ خطوط بھیجے گئے۔ مہارانا کا بیٹا پرتاپ سنگھ 13 مارچ 1713 کو شاہی دربار میں حاضر ہوا اور اسے بہت سے تحائف دیئے گئے۔ سنگرام سنگھ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا اور اسے آٹھ کروڑ دام انعام کی شکل میں دیئے گئے۔ اتنا اونچا منصب راجہ راج سنگھ کے علاوہ میواڑ کے کسی دوسرے رانا کو نہیں دیا گیا تھا۔ مہاراجہ جے سنگھ و اجیت سنگھ نے خوف و شک کی وجہ سے دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن انھوں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ شاہی حکم کے مطابق انھیں جہاں بھی مقرر کیا جائے گا وہاں وہ خدمت کرنے کو تیار رہیں گے۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اعتماد بحال ہونے پر جلد ہی دربار میں حاضری دیں گے۔ دونوں راجاؤں

نے مالوہ و گجرات اور مالوہ و برہانپور کی صوبہ داری کے لیے ذاتی تجویز رکھی۔ اسی طرح کی مانگ یہ دونوں راجہ بہادر شاہ کے وقت سے کر رہے تھے۔ راجپوت راجاؤں کے اس برتاؤ سے فرخ سیر ناراض ہوا۔ فرخ سیر نے حسین علی، میر جملہ و خان دوراں کی موجودگی میں کہا "ہمیں ان کے سلسلہ میں ہوشمندی اور تدبر سے کام لینا چاہئے۔ یہ ممکن نہیں کہ دونوں کو ایک ہی علاقہ کی سمت بھیجا جائے کیونکہ وہ حکومت کے مفادات کے خلاف ہوگا۔" اسی طرح بہادر شاہ کی طرح فرخ سیر نے بھی راجپوت راجاؤں کی باہمی دوستی کو مغل شہنشاہیت کے لیے نقصان دہ سمجھا۔ جے سنگھ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب اور مالوہ کی صوبہ داری عطا کی گئی۔ اجیت سنگھ کو بھی سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا لیکن اسے ٹھٹھہ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ اس کا واضح مقصد دونوں راجاؤں کے درمیان مخالفت پیدا کرنا اور انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا تھا۔ جس میں کافی حد تک کامیابی ملی۔ جے سنگھ نے مالوہ کی صوبہ داری کی تجویز کو قبول کر لیا لیکن اجیت سنگھ نے جس کی نگاہیں گجرات پر لگی تھیں ٹھٹھہ جانے سے انکار کر دیا۔ اسی وقت ناگور پر قبضہ کرنے کی خواہش سے اور پرانی دشمنی کے تحت اجیت سنگھ نے اندر سنگھ کے لڑکے محکم سنگھ و موہن سنگھ کو دلی میں قتل کرا دیا جو کہ شاہی منصب دار تھے۔ اجیت سنگھ کی ان حرکتوں سے فرخ سیر بہت ناراض ہو گیا اس لیے اجیت سنگھ کے خلاف خود فرخ سیر کی کمان میں ایک شاہی فوج بھیجنا طے کیا گیا لیکن بعد میں اس کی کمان میر بخشی حسین علی کو سونپ دی گئی۔ 6 جنوری 1714 کو حسین علی نے ایک بڑی فوج کے ساتھ یہ مہم شروع کی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے مارواڑ کے خلاف اس شاہی مہم کا ایک اہم مقام ہے۔ سب سے پہلے یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ راجپوت راجاؤں کے سلسلہ میں پالیسی سے متعلق فرخ سیر اور سید برادران کی رائے مختلف تھیں۔ سید حسین علی راجپوت راجاؤں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ابتدا ہی سے پھرامیر کے وکیل جگ جیون رام سے پوشیدہ طور پر صلاح مشورہ کر۔ ہاتھا میواڑ کا وکیل بہاری داس بھی سیدوں کا گہرا دوست تھا۔ دوسری طرف فرخ سیر کا منصوبہ تھا کہ سید برادران میں اختلاف پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے سے الگ کر دیں اور اس طرح انھیں برباد کر دیں۔ اس لیے حسین علی کی کوچ کے فوراً بعد بادشاہ

نے اجیت سنگھ کو اس قسم کا ایک خط لکھا کہ اگر وہ حسین علی کو جنگ میں ہرا کر مار ڈالنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے بادشاہ کا پورا اعتماد مل جائے گا۔ لیکن اس پوشیدہ پرفریب منصوبہ کا نتیجہ فرخ سیر کی امید کے خلاف ہوا۔ حسین علی کو بادشاہ کے اس منصوبہ کا راز معلوم ہو گیا۔ ممکن ہے بادشاہ کا یہ خط اس کے ہاتھ لگ گیا ہو یا حسین علی سے صلح کرنے کے مقصد سے اجیت سنگھ نے اس راز کو افشا کر دیا۔ عبداللہ خاں نے بھی حسین علی کو خطوط لکھے جن میں اسے جلد ہی دربار میں واپس آنے کے لیے اصرار کیا کیونکہ بادشاہ کے مقربین کی وجہ سے وہ خود پریشان تھا۔ حسین علی اب تک اپنے خلاف فرخ سیر کے کاموں سے پوری طرح واقف ہو گیا تھا ان حالات کے تحت مارچ 1714 میں حسین علی اور اجیت سنگھ کے مابین ایک سمجھوتہ ہوا۔ سمجھوتہ کے مطابق اجیت سنگھ نے اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر کے ساتھ کرنے اور اپنے بیٹے ابھے سنگھ کو میر بخشی کے ساتھ دربار میں بھیجنے و ضرورت پڑنے پر خود دربار میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ اجیت سنگھ نے پیش کش دینا اور ٹھٹھہ کی صوبہ داری بھی منظور کر لی لیکن اس سمجھوتہ کا سب سے اہم حصہ وہ تھا جو پوشیدہ طریقہ سے اجیت سنگھ و حسین علی کے مابین ہوا اس میں یہ طے کیا گیا کہ اجیت سنگھ بادشاہ کا حکم مان کر ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہو جائے گا لیکن جیسے ہی وہ کچھ منزلیں طے کرلے گا اسے گجرات کی صوبہ داری کی تقرری کا پروانہ دیدیا جائے گا۔

حسین علی کی کارروائی واضح طور پر اس پالیسی کے خلاف تھی جس پر عمل درآمد کرنے کے مقصد سے مارواڑ بھیجا گیا تھا اس نے دونوں راجاؤں کو الگ الگ صوبوں میں مقرر کرنے کی بنسبت انھیں مالوہ اور گجرات میں مقرر کرنے کا وعدہ کیا اور اس طرح راجاؤں کی وہ مانگ پوری ہو گئی جو وہ بہادر شاہ کے دور حکومت سے کرتے آرہے تھے اس طرح یہ سمجھوتہ سید برادران اور راجپوتوں کے درمیان دوستی اور تعاون کی شروعات تھی۔

مندرجہ بالا واقعات نے 1714 کے آخر میں فرخ سیر اور سید برادران کے اختلافات کو پھر سے پیدا کر دیا۔ دونوں گروہوں میں ٹکراؤ کی خاص وجہ یہ تھی کہ سید برادران حقیقی شاہی طاقت اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے خفی خاں

لکھا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ جاگیر دینا منصب اور عہدہ دینا یا اس میں ترقی دینا وغیرہ کوئی بھی کام ان کی ماقبل صلاح کے بغیر نہ ہو اس کے خلاف فرخ سیر حالانکہ شاہی عہدہ کے لیے نااہل تھا مگر وہ اپنے ذاتی اختیارات کو خود استعمال کرنے کی خواہش رکھتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ سید برادران کی خواہشات کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وزیر اور بخشی کے روایتی اختیارات بہت بڑھ جائیں گے اور ایسی حالت میں بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہ جائے گا۔ فرخ سیر چاہتا تھا کہ وزیر بادشاہ کے صلاح کار کی حیثیت سے ہی کام کرے وہ محکمہ مالگذاری کا حاکم بنا رہے لیکن آزادانہ طور پر اپنے اختیارات کا استعمال نہ کرے۔ ذوالفقار خاں کی طرح سید برادران وزیر کے عہدہ کو سب سے زیادہ طاقتور بنانا چاہتے تھے جس سے انھیں نئی پالیسیاں وضع کرنے کا موقع ملے۔ اختیارات کے بارے میں یہ دونوں مختلف نظریہ شروع ہی سے دکھائی دیتے ہیں۔ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ حکومت کے خاص عہدوں پر تقرری کے سوال پر وزیر اور بادشاہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف بنے رہے۔ بادشاہ نے اپنے آپ کو بااثر بنانے کے لیے جملہ کو داروغہ خواہان' داروغہ غسل خانہ کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور خان دوراں کو داروغہ دیوان خاص و والاشاہیوں کے بخشی کے عہدے عطا کیے دونوں کو سات ہزار ذات اور سات ہزار سوار کے منصب دیئے گیے۔ ان دونوں امیروں کے تعاون سے سید برادران کے خلاف ایک گروہ ترتیب دیا گیا فرخ سیر کے ان دونوں معتمدین ومقربین نے انتظامیہ کے کاموں میں بھی مداخلت کرنا شروع کر دی میر جملہ کو بادشاہ نے اپنی جانب سے حکم ناموں پر شاہی مہر لگانے کا اختیار دیدیا تھا فرخ سیر نے بابار یہ بات دہرائی کہ میر جملہ کا دستخط اور قول میرا دستخط اور قول ہے۔ میر جملہ نے اس اختیار کا فائدہ اٹھا کر تقرریوں اور منصب میں ترقی وغیرہ کے کاغذوں کو بغیر دیوان وزارت کے پاس بھیجے شاہی مہر لگانا شروع کر دیا۔ یہ کام روایتی اصول کے خلاف تھا اور وزیر کی عزت پر سیدھی چوٹ تھی۔ ایسی تقرریوں میں وزیر کو تحائف یا پیش کش کی شکل میں کافی دولت ملتی تھی اس لیے میر جملہ کے طریقہ عمل سے وزیر کو اقتصادی نقصان بھی ہوا ان سب وجوہات سے سیدوں کو اپنی حالت کی طرف زیادہ چوکس ہونا پڑا۔

مشکل یہ تھی کہ خود عبداللہ خاں حکومت کے کاموں کی طرف سے عدم دلچسپی رکھتا تھا وہ صرف ایک سپاہی تھا اسے حکومت کے انتظام اور مالیات کے کاموں میں دلچسپی کم تھی اسی لیے یہ سب۔ کام اس نے اپنے دیوان رتن چند کو سونپ دیئے تھے۔ حالانکہ رتن چند مالیاتی کاموں میں ہوشیار تھا وہ بہت زیادہ لالچی اور مغرور تھا اپنے وزیر کے لیے مناسب پیش کش حاصل کیے بغیر وہ کوئی بھی کام پورا نہیں کرتا تھا۔ میر جملہ نے ان غیر قانونی کارروائیوں کو روکنے کی کوشش کی وہ خود منصب اور عہدہ کی تقرری کے لیے پیش کش نہیں لیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رتن چند کی شکایت پر عبداللہ خاں نے اسے یہ حکم دیا کہ وہ ایسے کسی بھی تقرر کو منظور نہ کرے جس میں میر جملہ کا ہاتھ ہونے کا شک ہو۔ ان کارروائیوں سے انتظامیہ کا کام رک گیا اور بادشاہ اور اس کے معتمدین اور سید برادران کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی فرخ سیر کی سیدوں کے خلاف شکایت صحیح تھی رتن چند کی وجہ سے اجارہ کا رواج عام ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ خالصہ زمین کو بھی اجارہ پر دیا جانے لگا تھا جب کبھی بھی کسی عامل کا تقرر ہونا تھا رتن چند اس سے ایک قول لکھوا لیتا تھا اور اس بنیاد پر پیشگی روپیہ مہاجنوں سے لیتا تھا۔ فرخ سیر اجارہ کو کسانوں اور حکومت دونوں کے لیے تباہ کن سمجھتا تھا اور اسے روکنے کے لیے اس نے فرمان جاری کیا تھا۔

اس حالت میں سید برادران کی طاقت کم کر کے اور اس امید پر کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا عہدہ چھوڑ دیں فرخ سیر نے اپنے معتمدین کی فوجی طاقت بڑھانی شروع کر دی میر جملہ کو پانچ ہزار سوار ... رکھنے کی اجازت دی گئی جن کی تنخواہ شاہی خزانہ سے دی جاتی تھی۔ اس کو لاہور صوبہ میں جو بڑا دولتمند اور زرخیز تھا جاگیریں دی گئیں۔ اس سے پہلے میر جملہ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب اور بنگال کی صوبداری دی گئی تھی اور ان کے لیے دہلی و آگرہ صوبوں میں جاگیریں دی گئیں۔ اسے بھی سات ہزار کا منصب دیا گیا۔ ان دونوں کے دوسرے متعلقین کے عہدوں میں بھی غیر معمولی ترقی کی گئی۔ انھیں وجوہات سے عبداللہ خاں نے حسین علی کو مارواڑ سے جلد لوٹنے کے لیے خط بھیجے تھے۔

مارواڑ سے لوٹنے کے بعد اس دور کے حالات کو دیکھ کر سید برادران نے یہ نتیجہ نکالا کہ دربار میں اپنی حیثیت کو بنائے رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی دوسرے دولتمند صوبہ پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ تاکہ اس کے ذرائع کا استعمال کیا جا سکے۔ اس کے مطابق نظام الملک کو دکن کی صوبہ داری سے ہٹا کر حسین علی نے وہاں کی صوبہ داری اپنے نام لکھوالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ذوالفقار خاں کی طرح وہ دربار میں رہے اور اپنے نائب کے ذریعہ دکن کا انتظام چلائے اس لیے اس نے داؤد خاں کو دکن میں اپنا نائب مقرر کیا اور اس سے مقامی انتظام چلانے اور حسین علی کو سالانہ پیش کش دینے کے بارے میں معاہدہ کر لیا۔ یہ ایک نامناسب انتظام تھا لیکن فرخ سیر اسے آسانی سے نامنظور نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ کچھ دن پہلے اس نے اپنے معتمد میر جملہ کو بنگال کا صوبہ دار بنا کر وہاں کے نائب صوبہ دار مرشد قلی خاں کے ساتھ اسی طرح کے معاہدے کرنے کی منظوری دیدی تھی۔ میر جملہ کے مشورے سے فرخ سیر نے حسین علی کی تجویز نامنظور کر دی اور اسے حکم دیا کہ وہ بذات خود دکن جائے۔

اس حکم سے دربار میں ایک تشویشناک حالت پیدا ہو گئی۔ بہادر شاہ کی طرح فرخ سیر بھی وزیر میر بخشی اور دکن کی صوبہ داری تینوں کے تینوں عہدے ایک ہی خاندان کے لوگوں کو سونپنا شاہی خاندان کے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔ برخلاف اس کے سید برادران ان تینوں میں سے کسی بھی عہدہ کو چھوڑنے کے تیار نہیں تھے۔ اس لیے دکن میں حسین علی کے ذاتی طور پر جانے کے حکم کو فرخ سیر کی سیاسی چال سمجھتے تھے جس سے وہ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے الگ الگ ان سے نمٹ سکے۔ اس لیے فرخ سیر اور میر جملہ کی سیاسی چالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے حسین علی نے اپنے بھائی کو دربار میں اکیلا چھوڑ کر دکن جانے سے انکار کر دیا۔

فرخ سیر نے اجیت سنگھ کے ساتھ حسین علی کے ذاتی معاہدہ کی بھی مخالفت کی اور اجیت سنگھ کے نام گجرات کی صوبہ داری کا فرمان جاری کرنے میں آنا کانی کی۔

جس وقت یہ سب جھگڑے ہو رہے تھے اس وقت حسین علی نے اپنے قتل کرنے کی ایک سازش کا پتہ لگایا۔ سید برادران کو یہ ڈر تھا کہ بادشاہ کے

مددگاروں کے ذریعہ قتل کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لیے انھوں نے دربار میں جانا چھوڑدیا اور اپنی رہائش گاہ کے چاروں طرف سخت پہرہ لگادیا۔ اس طرح سید برادران نے یہ واضح کردیا کہ وہ دھمکیوں سے نہیں ڈریں گے حقیقت میں بادشاہ کے معتمد فوجی نقطہ نظر سے اپنے کو کمزور سمجھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کو محمد امین خاں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا جو ایک تجربہ کار جنگجو تھا لیکن اس کے انعام میں امین خاں خود وزیر بننا چاہتا تھا۔ بادشاہ کے صلاح کار اسے اور بھی خطرناک سمجھتے تھے کیونکہ بعد میں محمد امین کو وزیر کے عہدہ سے ہٹانا اور بھی مشکل ہوتا۔ اس سے فرخ سیر کے ہاتھوں میں طاقت نہیں آئی لیکن بادشاہ اور اس کے معتمدین صرف سیاسی چالوں سے سیدوں کو ان کے عہدہ سے ہٹانے میں نااہل تھے۔

حالات کو سمجھتے ہوئے فرخ سیر نے پھر سیدوں کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش کی فرخ سیر کی ماں سیدوں کے پاس گئی اور اپنے بیٹوں کی جانب سے انھیں یقین دلایا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ میر جملہ اور سید حسین علی دونوں اپنے اپنے صوبوں کو چلے جائیں — سیدوں نے یہ واضح کردیا کہ میر جملہ کے چلے جانے کے بعد ہی حسین علی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوگا اس کے دربار میں حاضری کے وقت قلعہ کا کل انتظام سیدوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس سمجھوتہ کے مطابق 16 دسمبر 1712 کو میر جملہ نے بنگال کے لیے کوچ کیا۔ 20 کو حسین علی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اس وقت قلعہ کا سارا نظم و نسق سید برادران کے ہاتھ میں تھا یہ ایک ایسی عجیب بات تھی جس نے سیدوں کے خصوصی اختیارات واضح کردیئے اور یہی بات بعد میں فرخ سیر کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔

20 مئی 1725 کو حسین علی نے دکن کے لیے کوچ کیا۔ جاتے وقت حسین علی نے بادشاہ سے اجازت لی کہ دکن میں زمینداروں کا تقرر اور معزولی قلعہ کے محافظوں کا تقرر و تبادلے وغیرہ پورے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر کو اس بات کے لیے بھی مجبور کیا گیا کہ حسین علی کو شاہی مہر دیدی جائے جس سے جاگیرداروں کے تبادلہ وغیرہ میں بادشاہ کی رسمی اجازت کی ضرورت نہ پڑے جاتے وقت حسین علی نے فرخ سیر کو یہ تنبیہہ کی کہ اگر اس نے میر جملہ کو دربار میں واپس

بلایا تو وہ تین ہفتوں ہی میں دکن سے واپس آ دھمکے گا۔

اس طرح طاقت کے لیے یہ پہلا ٹکراؤ ختم ہوا بظاہر اس کا نتیجہ سیدوں کی فتح تھی کیونکہ بادشاہ سید برادران کو ان کے عہدہ سے ہٹا نہیں سکے۔ بلکہ اس نے سیدوں کی اس ہتک آمیز شرط کو بھی منظور کیا کہ بادشاہ کے دربار میں سیدوں کے حاضر ہونے سے پہلے قلعہ کا سارا انتظام انھیں سونپ دیا جائے گا۔ اس طرح بادشاہ ان کے خصوصی اختیارات قبول کرے۔ اتنا ہونے پر بھی اس چپقلش نے سیدوں کو اپنی کمزوریوں سے آگاہ کرا دیا اور انھیں سمجھوتہ کے لیے مجبور کیا انھیں یہ احساس ہوا کہ بادشاہ کے مددگاروں . . . . . . کے ساتھ ہی دربار کا ایک طاقتور گروہ ان کی مخالفت کر رہا ہے۔ ان کا قائد امین خاں تھا۔ بارہا کے سید تعداد میں کم تھے اور صرف اپنی طاقت پر سید برادران کا اثر بنائے رکھنے میں نااہل تھے جس وقت سید برادران کو ہٹائے جانے کی افواہ پھیلی بہت سے سادات بارہا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا اس لیے انھوں نے ایک بڑے علاقہ پر اپنا اثر جمانا ضروری سمجھا۔ لیکن یہ جب ہی ممکن تھا جب دونوں بھائیوں میں سے ایک ذاتی طور پر اس علاقہ کا انتظام سنبھالے۔ ممکن ہے اس وجہ سے حسین علی دکن کو جانے کے لیے تیار ہو گیا

اس طرح جس مسئلہ کو لے کر جھگڑا شروع ہوا تھا اس پر سیدوں کو جھکنا پڑا۔ وہ بادہ کے معتمد خان دوراں کو نائب میر بخشی کا عہدہ دینے کو رضامند ہو گئے میر جملہ کو دربار چھوڑ کر اپنے صوبہ کی طرف جانا پڑا۔ مگر فرخ سیر نے اس کے ساتھ سات ہزار مغل سپاہی بھیجے جو کسی بھی صوبہ دار کو نہیں دیئے جاتے تھے۔ اس لیے میر جملہ کی جانب سے سیدوں کو پھر بھی خطرہ بنا رہا۔ ساتھ ہی سمجھوتہ کے بعد بھی سیدوں کے لیے بادشاہ کی تلخی کسی بھی طرح کم نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ تھی کہ جیسے ہی حسین علی نے پیٹھ پھیری بادشاہ نے داؤد خاں پنی کو خفیہ حکم بھیجا کہ اس کا گجرات سے برہانپور تبادلہ کر دیا گیا۔ اور یہ کہ وہ حسین علی کو روکے۔ داؤد خاں تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا 13 اگست کو برہانپور پہنچا۔ 6 ستمبر کو حسین علی اور داؤد خاں کی جنگ ہوئی جس میں داؤد خاں کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا، فرخ سیر کے خفیہ خطوط حسین علی کے ہاتھ آ گئے جس سے ان کے سلسلہ میں بادشاہ کی دوہری پالیسی واضح ہو گئی۔

دکن کی صوبہ داری سے ہٹانے کی وجہ سے نظام الملک سیدوں سے ناراض ہوگیا۔ دکن سے دلّی لوٹتے وقت وہ راستہ میں حسین علی کے پڑاؤ سے دو تین میل کے فاصلہ پر نکلا لیکن پرانے اصولوں کے تحت اس نے جاکر حسین علی سے ملاقات نہیں کی۔ محمد امین خاں وزارت کے عہدہ کے لالچ سے سیدوں کی مخالفت کر ہی رہا تھا اس لیے عبد اللہ خاں کو اس با اثر گروہ کا سامنا بھی کرنا تھا۔

اس طرح طاقت کے تجربہ کے اس دور میں کوئی بھی بنیادی مسئلہ حل نہ ہوسکا عبد اللہ خاں سازشی بادشاہ کا سامنا کرنے کے لیے دربار میں کچھ وقت کے لیے اکیلا رہ گیا۔ مسئلہ کا حل تب ہی ہوسکتا تھا جبکہ دونوں میں سے ایک گروہ اتنی طاقت حاصل کرلیتا کہ دوسرا اس کے سامنے نہ لڑ سکے۔

باب پنجم

نئی وزارت کے لیے کشمکش

حسین علی کے دکن کو کوچ کرنے کے بعد کچھ برسوں تک فرخ سیر اور سید برادران اپنے اپنے حمایتی کی تعداد بڑھانے میں مشغول رہے۔ فرخ سیر نے پرانے امیروں خاص کر محمد امین خاں نظام الملک اور اس کے حمایتیوں کا تعاون حاصل کرنے کی جانب غور کیا۔ اس نے جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو بھی اپنی طرف ملانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سید عبداللہ خاں و حسین علی خاں نے پرانے امیروں و راجپوتوں کی حمایت حاصل کرنے اور مراٹھا، جاٹ وغیرہ دوسرے عناصر سے دوستانہ تعلقات قایم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

اس کشمکش کے نتیجہ میں انتظامیہ میں ڈھیل آگئی اور حکومت کی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ عبداللہ خاں نے اپنے دیوان و خاص صلاح کار رتن چند پر انتظام کا سارا بوجھ ڈال دیا۔ اس کے نتیجہ میں انتظامیہ کے سب ہی شعبوں پر اس کا اثر قایم ہو گیا۔ یہاں تک کہ قاضیوں کے تقرر میں بھی اس کا ہاتھ رہتا تھا خاص طور سے مالگذاری کے محکمہ میں اس کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ کسی بھی فرد کو اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی مخالفت کرسکے۔ محکمہ مالگذاری کے دونوں خاص افسر دیوان تن و دیوان خالصہ (شاہی زمینیں) نام نہاد ہو کر رہ گئے رتن چند نے اونچی بولی لگانے والے کو مالگذاری کا ٹھیکہ دینا شروع کر دیا یہاں تک کہ خالصہ زمین بھی ٹھیکہ پر دی جانے لگی۔[1] ان کارروائیوں کے نتیجہ میں خالصہ و جاگیر کی زمین کی مالگذاری گھٹنے لگی لیکن اس طرح رتن چند اپنے آقا کے لیے کافی مقدار میں دولت اکٹھی کرنے میں کامیاب ہوا جب

عبداللہ خاں کبھی بھی کسی عامل کا تقرر کرتا تھا رتن چند اس سے پیشگی روپیہ دینے کا پٹہ لکھا لیتا تھا اور اتنی رقم ساہوکاروں سے وصول کر لیتا تھا۔ فرخ سیر نے ان غیر قانونی کاموں کو روکنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ خاں نے اس کے ان اعتراضات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔[2]

ان حالات میں جاگیرداروں کی حالت اور بھی بگڑنے لگی۔ جاگیروں کی کاغذی آمدنی (جمع) اور حقیقی آمدنی (حاصل) کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق سے ان کے لیے اپنی روزی کمانا مشکل ہو گیا۔ چھوٹے منصب دار کے لیے یہ اور بھی مشکل تھا۔ اس حالت میں دیوان رتن لطف اللہ خاں نے پچاس سے سو ذات تک کے منصب داروں کو جاگیروں کے بدلے نقد روپیہ دینا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم جاگیروں کی نسبت بہت کم تھی اور باقاعدہ بھی نہیں دی جاتی تھی اس کے نتیجہ میں بہت سے امیروں نے جن میں بڑے امیر بھی شامل تھے سوار رکھنا بند کر دیا متصدیوں سے مل کر سواروں کی جھوٹی فہرست بھیجنے لگے۔[3] اس طرح نظام کا پوری طرح زوال ہونے لگا۔

ان کارروائیوں کے پس پردہ نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں مہاجنوں میں ٹھیکیداروں، تعلقداروں وغیرہ کا اثر بڑھنے لگا۔ یہ بات بہت سے پرانے خاندان کے لوگوں اور امیروں کو اکھرنے لگی ان کے جذبات کی جھلک ہمیں خفی خاں کے اس بیان سے ملتی ہے کہ رتن چند کے زمانہ میں بارہا اور بنیوں کے علاوہ کسی پر بھی نظر کرم نہیں کی جاتی تھی اور ہر ایک صوبہ کے امیر بے عزتی اور غیر یقینی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے ایک اور ہم عصر مصنف خوشحال خاں کے مطابق رتن چند نے مالگذاری کے اصول کی جگہ پر دکانداری کے اصول رائج کر دیے یا دوسرے الفاظ میں اس نے ہر ایک چیز کو بکری کے لیے رکھ دیا۔[4]

اس طرح انتظام کمزور ہوتا جا رہا تھا اور شاہی دربار سیاسی کشمکش کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا حالت یہ تھی کہ جب کبھی بھی بادشاہ شکار کے لیے یا کسی دوسری جگہ پر سواری کرنے کی تیاری کرتا تھا تو عام طور سے یہ افواہ پھیل جاتی تھی کہ اس کا مقصد سید عبداللہ پر حملہ کرنا ہے۔ عبداللہ خاں نے اپنی حفاظت کے لیے ایک

مستقل فوج بھرتی کرلی تھی جس کی تعداد 15 سے 20 ہزار تھی۔ دربار میں بہت سے دشمن ہونے کی وجہ سے عبداللہ خاں کی حفاظت کے لیے یہ سپاہی بھی کافی نہیں تھے۔ اس لیے جب کبھی بادشاہ شکار کے لیے یا سواری پر نکلتا، عبداللہ خاں اور سپاہی بھرتی کرلیتا تھا۔[5]

سید برادران اپنی حالت اور اپنی مشکلات سے ٹھیک طرح سے واقف تھے اس لیے اختیارات حاصل کرنے کے سوال کو آخری طور پر حل کرنے کے مقصد سے وہ ضروری ذرائع مہیا کرنے میں لگ گئے۔ واقعات بھی ان کے حق میں ہوتے چلے گئے جس سے انھیں اپنی خواہش کی تکمیل کا مناسب موقع مل گیا۔

جنوری 1716 میں میر جملہ بڑی پریشان حالت میں اچانک دلّی پہنچا اس سے پہلے بہار کو کوچ کرتے وقت اس کے ساتھ سات ہزار زائد مغل سپاہی مقرر کیے گئے تھے۔ سپاہیوں کی زائد تعداد کے خرچ کے لیے اسے نو لاکھ روپے دیے گئے جس میں سے کچھ نقد دیے گئے تھے اور باقی بنگال صوبے کی آمدنی سے دیے گئے تھے لیکن میر جملہ پٹنہ سے آگے نہیں بڑھا۔ پٹنہ میں رہ کر میر جملہ بہار کے زمینداروں پر جو ہمیشہ سے سرکش اور باغی سمجھے جاتے تھے، قابو پانے میں ناکام رہا۔ ساتھ ہی اس نے غلط طریقے سے خرچہ کیا جس کی وجہ سے وہ مغل سپاہیوں کو تنخواہ نہیں دے سکا۔ نتیجتاً غیر مطمئن سپاہیوں نے عوام سے دولت اکٹھی کرنے کے لیے ظالمانہ اور غیر قانونی طریقے اپنائے۔ دوسری طرف میر جملہ نے شاہی اختیارات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے سامنے شیر کی لڑائی کروانا وغیرہ کام شروع کر دیے۔ ان سب کاموں کی اطلاع بادشاہ کے پاس پہنچی۔ اسی وقت میر جملہ نے تیس لاکھ روپے کا خزانہ جو ہر سال دہلی بھیجا جاتا تھا ہتھیا لیا اور غلط طریقہ سے خرچ کر دیا۔[6]

اس کے نتیجے میں نومبر 1715 میں میر جملہ کو بہار کے صوبے دار کے عہدے سے ہٹا لیا گیا اس کی جگہ پر سربلند خاں کو وہاں کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ بنگال کی غیر حاضر صوبے داری سے بھی اسے ہٹا دیا گیا۔ اس طرح میر جملہ ایک کے بعد ایک مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اب اس کے پاس ایک ہی امید بچی تھی کہ وہ اپنے پرانے کرم فرما بادشاہ سے خود گزارش کرے اس لیے وہ بغیر پیشگی اجازت

واطلاع کے دہلی پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی سات آٹھ ہزار مغل سپاہی بھی دارالحکومت میں پہنچے جنھیں گذشتہ بارہ تیرہ مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ ان سپاہیوں نے وہاں پہنچ کر میر جملہ کی رہائش گاہ پر گھیرا ڈالدیا اور دارالحکومت میں ہنگامہ کرنا شروع کر دیا۔ عبداللہ خاں کو شک تھا کہ یہ سب اس کے اوپر حملہ کرنے کا بہانہ ہے اس لیے اس نے اپنے سپاہیوں کی تعداد اور بڑھائی شروع کر دی اور فوجی ٹکراؤ کی تیاری کر لی۔ سید جو عبداللہ خاں کو اپنا رشتے دار سمجھتے تھے اس کی حفاظت کے لیے بڑی تعداد میں دلی پہنچ گیے۔7

فرخ سیر اس ٹکراؤ کے لیے تیار نہیں تھا غصے میں اس نے میر جملہ کا منصب اور جاگیر چھین لی ایسی حالت میں میر جملہ اپنے پرانے دشمن عبداللہ خاں کی پناہ میں آیا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ عبداللہ خاں کے درمیان میں پڑنے سے اسے لاہور کا قاضی مقرر کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوئے بغیر ہی چلا جائے۔ عبداللہ کی سفارش سے سات آٹھ ماہ بعد اسے اس کا پرانا منصب وخطابات بھی دوبارہ عطا کر دیئے گیے۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ کہ عبداللہ خاں کے راستے سے ایک کانٹا ہٹ گیا اور اب وہ اپنے کو نسبتاً زیادہ محفوظ سمجھنے لگا۔ فرخ سیر کی حالت اور بگڑ گئی۔

عبداللہ خاں کی طاقت اور اہلیت کا پتہ سرمن سفارتی وفد کی کارروائیوں سے چلتا ہے۔ یہ سفارتی وفد برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے بادشاہ کے دربار میں بھیجا گیا تھا اس کا مقصد کمپنی کے لیے بنگال بہار اور اڑیسہ میں آزادانہ تجارت کی سہولتیں حاصل کرنا تھا۔ کمپنی کے ذریعے پیش کی گئیں دو درخواستیں اس لیے منظور نہ ہوسکیں کہ وہ خان دوراں کے ذریعہ بھیجی گئی تھیں۔ انگریز سفارتی وفد کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ساری طاقت خان دوراں کے ہاتھوں میں ہے اور وزیر صرف ایک کٹھ پتلی ہے۔ آخر میں عبداللہ خاں کے کہنے سے فرخ سیر نے کمپنی کو ایک مقررہ رقم دینے کے وعدے پر اسے ساری مغل حکومت میں اپنا مال لانے اور بیچنے کا اختیار دیدیا۔ اس فرمان کا انگریز نے جان بوجھ کر یہ مطلب نکالا کہ وہ ملک کی اندرونی تجارت میں بھی بغیر محصول دیئے حصہ بٹا سکتے ہیں۔ حقیقت میں فرخ سیر نے اس

فرمان سے انھیں اسی طرح کے اختیارات دیے جیسے 1656 میں بنگال کے صوبے دار شاہ شجاع کے ذریعے انھیں دیے گئے تھے۔ کمپنی کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب کاموں کے لیے وزیر نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا جبکہ انگریزوں کا یہ مستحکم خیال تھا کہ "دلی میں ہر چیز بکاؤ ہے" 8

مندرجہ بالا واقعات نے وزیر کے اثر اور اختیارات کی افضلیت کو واضح کر دیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مالگذاری و مالیات دونوں معاملوں میں وزیر کی افضلیت کو تسلیم کر لیا گیا۔

فرخ سیر کی تخت سے برطرفی

میر جملہ کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد فرخ سیر نے پھر سے امیروں کے طاقتور گروہ کی تشکیل کرنے اور ان کے ذریعہ طاقت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے اس نے جے سنگھ کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کی۔ مالوہ کے صوبہ دار کی شکل میں 1715 میں جے سنگھ نے مراٹھوں کو نربدا کے پار بھگا کر ان کے خلاف اہم کامیابی حاصل کی تھی۔ اس زمانہ کے اخبارات میں اس کو اورنگ زیب کے بعد سب سے بڑی فتح بتایا گیا۔9

حالانکہ راجہ جے سنگھ کو مالوہ کی صوبے داری دلانے میں سید حسین علی کا خاص ہاتھ تھا لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر جے سنگھ سید برادران سے ناراض تھا۔ کوٹہ بوندی ریاست کی خانہ جنگی میں حسین علی کی مداخلت سے ہی جے سنگھ کے بہنوئی بدھ سنگھ کو حکومت کے حق سے محروم ہونا پڑا تھا۔ جاجوں کی جنگ میں بت سنگھ نے بہادر شاہ کی طرف سے جنگ کی تھی جس کی وجہ سے اسے کوٹہ کے قلعے کے ساتھ چون قلعے دیے گئے۔ رام سنگھ ہاڑا کے بیٹے بھیم سنگھ کو کوٹہ سے ہٹا دیا گیا کیونکہ اس نے اعظم شاہ کی طرفداری کی تھی لیکن بھیم سنگھ نے کوٹہ پر اپنا قبضہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ فرخ سیر کے تخت نشین ہونے پر وہ دلی پہنچا۔ اس نے حسین علی کی عنایات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف بدھ سنگھ نے دربار میں حاضر ہونے کے شاہی حکم کو ٹھکرایا ہی نہیں بلکہ جس وقت حسین علی نے اجیت سنگھ کے خلاف حملہ کیا اس

نے دشمنوں کی طرح کے کام کیے اور کوٹہ پر قبضہ کر لیا لیکن بھیم سنگھ نے جلدی ہی کوٹہ پر پھر اپنا قبضہ قایم کر لیا۔ اس نے حسین علی کے اشارے پر بوندی پر بھی قبضہ کر لیا اور بادشاہ نے رسمی طور سے اس کی اجازت اسے عطا کر دی۔ غصے میں آکر بدھ سنگھ اجین میں جے سنگھ سے ملا اور اس سے بادشاہ سے سفارش کرنے کا وعدہ لیا۔ اسی وقت سے ہی سید برادران اور جے سنگھ کے تعلقات بگڑنے لگے۔ دکن جاتے وقت جب حسین علی مالوہ سے گزر رہا تھا تب جے سنگھ نے اس کا خیر مقدم کرنے سے انکار کر دیا اور ایک باغی زمیندار کو سزا دینے کا بہانہ بنا کر اجین سے بھلسا کی جانب چلا گیا۔[10] اس زمانے کی روایت کے مطابق جے سنگھ کا یہ کام تہذیب کے خلاف تھا۔ حسین علی نے بادشاہ سے اس کی شکایت کی۔ جے سنگھ کی ناراضی کی دوسری وجہ تھی سیدوں کا جاٹوں کو پس پردہ تعاون دینا۔ جے سنگھ اپنی ریاست کی سرحد کے پاس چوڑامن جاٹ کی قیادت میں جاٹ قوت کے بڑھنے سے فکر مند تھا۔ چوڑامن جاٹ کے لوٹ مار کے کاموں سے بےچین ہونے کے علاوہ اورنگ زیب کے وقت سے ہی آمیر گھرانے اور جاٹوں میں دشمنی تھی۔ راجہ رام سنگھ نے راجہ رام کے خلاف بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں۔ راجہ رام کے مرنے کے بعد بھتیجہ کا بیٹا چوڑامن جاٹوں کا قائد بنا۔ کچھ زمانے تک چوڑامن معمولی طور پر لوٹ مار کے کاموں میں لگا رہا لیکن جاجوں کی جنگ کے بعد منام خاں کے توسل سے وہ بہادر شاہ کے روبرو حاضر ہوا۔ اسے پندرہ سو ذات پندرہ سو سوار کا منصب دیکر آگرہ و دہلی کے بیچ کے ماڈی کا محافظ مقرر کیا گیا۔ سکھوں کے خلاف مہم میں اس نے بہادر شاہ کا ساتھ دیا اور سادھورا اور لوہ گڑھ کے محاصرہ کے وقت موجود رہا۔ لاہور کی جنگ میں وہ عظیم الشان کی طرف تھا لیکن اس نے لوٹ مار کے علاوہ کچھ کام نہیں کیا۔ جہاندار شاہ نے اسے معاف کر دیا اور اسے خلعت دی اسے فرخ سیر کے خلاف مہم میں ساتھ دینے کا حکم دیا۔ چوڑامن جہاندار کی جانب سے لڑا لیکن جب جنگ کا رخ جہاندار شاہ کے حق میں نہ رہا تو چوڑامن نے لوٹ مار شروع کر دی اور اس کے جاٹ سپاہیوں نے حرم سرا کے ڈیروں کو لوٹ لیا۔[11]

فرخ سیر کے دور حکومت کے ابتدائی زمانے میں چھبیلا رام کو آگرے کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ باغی جاٹ سرداروں کو کچل دے۔

چھبیلا رام نے جاٹ قوت کو کچلنے کے لیے زائد فوجی گروہوں کا تقرر کیا لیکن وہ اس کام میں ناکام رہا۔ کیونکہ اسے مقامی زمینداروں کی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ لوگوں کو یہ شک تھا کہ چوڑامن کو سیدوں کی حمایت حاصل ہے۔ چھبیلا رام کے ناکام ہونے پر اس کی جگہ پر خان دوراں کی تقرری کی گئی۔ خان دوراں کی کوششوں سے چوڑامن دربار میں حاضر ہوا اور وہاں اس نے آقا سے وفاداری جتائی۔ اس لیے اسے دہلی سے چمبل کے ماڈی کا محافظ مقرر کیا گیا۔ کچھ وقت کے بعد ہی چوڑامن باغی ہو گیا اس نے شاہی علاقے میں موجود بہت سے پرگنوں پر قبضہ کر لیا اور جاگیرداروں کی جاگیروں میں مداخلت کی۔ بادشاہ کے پاس یہ شکایتیں آنے لگی تھیں کہ وہ غیر قانونی طریقے سے راہداری وصول کر رہا ہے اور ہتھیار جمع کر رہا ہے۔ چوڑامن نے تھوٹ میں اپنا گڑھ بنایا جہاں سے وہ اپنی کارروائیاں کرتا تھا۔

ان حالات میں ستمبر 1715 میں فرخ سیر نے جے سنگھ کو اس مطلب کا خط بھیجا کہ وہ راؤ راجہ بدھ سنگھ، چھترسال بندیلہ اور راٹھور درگاداس کے ساتھ دربار میں حاضر ہو۔ بادشاہ نے جاٹوں کے خلاف شاہی فوج کی کمان جے سنگھ کو دینے اور بدھ سنگھ کو بوندی دینے کا وعدہ کیا اسے خصوصی شاہی مراعات کے بارے میں بھی امید دلائی گئی[12]

سیاسی چالوں کی نظر سے فرخ سیر کی یہ پالیسی انتہائی اہم تھی۔ اس سے ایک ساتھ دو مقصد پورے ہوتے تھے۔ اول جاٹوں کی طاقت کو کچلنا دوم جے سنگھ کی حمایت حاصل کرنا۔ جے سنگھ جاٹوں کی طاقت کو کچلنے کا خواہشمند ہوتے ہوئے بھی دربار کی سیاست سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ دربار میں حاضر نہ ہو کر سیدھا امیر چلا گیا۔ جون 1716 میں فرخ سیر کے دوبارہ بلانے پر ہی وہ دربار میں حاضر ہوا بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ بھیم سنگھ کو بوندی سے ہٹا کر اسے خالصہ میں لے لیا جائے اور بعد میں یہ جگہ بدھ سنگھ کو دیدی جائے۔ اس کے بعد جے سنگھ کو جاٹوں کے خلاف مہم کی کمان سونپی گئی یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ ان معاملات کے فیصلے میں عبداللہ خاں سے کوئی صلاح و مشورہ نہیں کیا گیا[13]

جے سنگھ نے پچاس ہزار شاہی سپاہیوں کے ساتھ نومبر 1716 میں جاٹوں

کے مرکز تھون پر حملہ کیا لیکن گھنے جنگل، ٹوٹے ہوئے راستوں، رسد کی کمی اور مقامی زمینداروں کے دشمنانہ رویے کی وجہ سے جے سنگھ کو جلدی کامیابی حاصل نہ ہو سکی ایک سال اور چھ ماہ کے مسلسل ٹکراؤ کے بعد آخر میں فرخ سیر کو صلح کے لیے کوششیں کرنی پڑیں۔ اس کام کے لیے عبداللہ خاں کے چچا خان جہاں کو ظاہری طور پر جے سنگھ کی مدد لیکن حقیقت میں اس کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے بھیجا گیا۔ عبداللہ خاں کا مقصد جے سنگھ کو نیچا دکھانا تھا۔ خان جہاں کی کوششوں سے جاٹوں کے ساتھ صلح ہو گئی۔ اس صلح کے مطابق چوڑامن نے بادشاہ کو پچاس لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحایف دینا اور وزیر کو ذاتی ملاقات کے وقت 20 لاکھ روپیہ دینا منظور کر لیا۔ اس نے تھون، ڈیل وغیرہ مقامات پر سے اپنا قبضہ چھوڑ دیا اور وعدہ کیا کہ جہاں کہیں بھی اسے مقرر کیا جائے گا وہ خدمت کرنے کو تیار رہے گا۔14

یہ صلح جے سنگھ کی ذاتی طور پر بے عزتی اور سیدوں کی سیاسی جیت سمجھنا چاہئے جاٹوں کی جنگ نے سیدوں اور فرخ سیر کے تعلقات میں اور بھی زیادہ الجھن پیدا کر دی۔ اسی وقت سید برادران نے حکومت کے ایک باغی دشمن کے ساتھ سمجھوتہ کر کے دربار کی گروہ بندی کو ایک نیا موڑ دیا۔

جاٹوں کی جنگ کا خاتمہ ہوتے ہوتے سید برادران و فرخ سیر کی کشمکش میں کچھ اہم خصوصیات دکھائی دیتی ہیں۔ فرخ سیر نے اب یہ مان لیا۔ پرانے تجربہ کار امیروں کی بربادی اس کے لیے فائدہ مند نہیں تھی۔ بلکہ ان امیروں کا سیدوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اورنگ زیب کے زمانے کے امرا کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ فرخ سیر کے دور حکومت کے شروع میں عنایت اللہ خاں جو اپنے بیٹے کو پھانسی دیئے جانے کے بعد مکہ چلا گیا تھا 1717 کے شروع میں لوٹ آیا۔ عنایت اللہ اورنگ زیب کے ماتحت کام کر چکا تھا اور اس پر اورنگ زیب کی خصوصی مہربانیاں تھیں۔ اسے انتظامیہ کے کا تجربہ تھا اور وہ کفایت شعاری کے لیے مشہور تھا۔ فرخ سیر نے اپنے حمایتیوں کے مشورے سے اسے دیوان تن و خالصہ کے عہدے پر مقرر کیا اور اپریل 1717 میں اسے چار ہزار کا منصب دیکر کشمیر کے غائبانہ صوبے دار کا عہدہ دیا۔

اس زمانے کے انتظامیہ کے ڈھانچے میں مالگذاری کے معاملات میں عبد اللہ خاں کے اختیار و اثر کو دھیان میں رکھتے ہوئے عنایت اللہ نے وزیر کے مشورے کے بغیر دیوان تن کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کچھ دنوں بعد اخلاص خاں کی کوششوں سے یہ سمجھوتہ ہوا کہ عنایت اللہ خاں مالگذاری کے معاملات میں وزیر عبد اللہ خاں کے صلاح و مشورے کے بغیر کسی بھی تجویز کو منظور نہیں کرے گا وزیر بھی اس بات کے لیے متفق ہوگیا کہ وہ ہفتہ میں ایک یا دو بار دیوان خاص میں بیٹھے گا اور وزارت کا سارا کام رتن چند پر نہیں چھوڑے گا اس سے پہلے عبد اللہ خاں قلعے کے دیوان خاص میں چار پانچ ماہ سے نہیں گیا تھا۔

حقیقت میں سمجھوتہ صرف دکھاوا تھا جو حالات کو سدھارنے میں کامیاب نہ ہوا کچھ وقت کے بعد پالیسی سے متعلق متضاد خیالات کی وجہ سے کشمکش پھر شروع ہوگئی۔ اورنگ زیب کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے عنایت اللہ خاں نے مکہ کے شریف کا ایک خط پیش کیا جس میں جزیہ کو شرع کے مطابق واجب بتایا گیا تھا۔

اس کے بعد جاگیروں اور منصبوں کی آمدنی کی جانچ پڑتال کر کے عنایت اللہ خاں نے کچھ لوگوں کے منصب اور جاگیریں چھیننے یا کم کرنے کی تجویز رکھی اس نے یہ الزام لگایا کہ ہندو، ہجڑے اور کشمیری زور زبردستی و چالاکی سے اپنی اوقات سے زیادہ منصب حاصل کیے ہوئے ہیں اور سیر حاصل جاگیروں پر قبضہ کیے ہوئے ہیں کتنے لوگ، چاہے وہ دیوانی اور بخشی کے دفتر سے متعلق ہوں یا خان ساماں کے دفتر سے، منصب دار بن گئے ہیں اور انھوں نے جاگیریں حاصل کرلی ہیں اور پرانے خاندان کے لوگوں کے سر پر خاک پڑ گئی ہے۔

ممکن ہے ان تجاویز کے پیچھے عنایت اللہ خاں کا مقصد انتظام میں غیر اصولی اور بد انتظامی کو ختم کرنا تھا لیکن اس کا نتیجہ دوسرا ہی ہوا جزیہ دوبارہ لگانے کی تجویز سے ہندو ناراض ہوگئے دوسری تجویز بھی درمیانی طبقے کے عہدیداروں کے خلاف تھی جن میں ہندوؤں اور ہندستانی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے ان لوگوں نے ان دونوں تجاویز کی مخالفت کی رتن چند کی مخالفت کی وجہ سے عبد اللہ خاں نے بھی ان اصلاحات کی منظوری نہیں دی اس طرح عنایت اللہ خاں ،

کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ خفی خاں لکھتا ہے کہ اس کے بعد ہندو عنایت اللہ خاں کے دشمن ہو گئے اور ہر طرح سے اس کی مخالفت کرنے لگے[15]

عنایت اللہ خاں کی تجاویز کی مخالفت کرنے سے عبد اللہ خاں کو دفتروں کے حاکموں اور ہندوؤں کی حمایت حاصل ہوئی اس وقت سے ہی سید برادران ہندوؤں اور ہندستانیوں کے حمایتی گنے جانے لگے پھر بھی یہ کہنا مشکل نہیں کہ یہ کشمکش ہندستانیوں اور مغلوں کے مابین تھی یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ سیدوں نے اعلیٰ عہدوں پر اپنی یا کسی خاص طبقے یا گروہ کی اجارہ داری قایم کرنے کی کوشش نہیں کی اس کے برخلاف انھوں نے پرانے امیروں کا تعاون حاصل کرنے اور انھیں خوش رکھنے کے لیے اعلیٰ عہدے دیئے۔ ذاتی مفادات کی حفاظت کے لیے کی گئی دربار کی گروہ بندی نے اب آگے بڑھ کر ایک سیاسی کشمکش کی شکل اختیار کر لی۔ یہ گروہ ذات یا مذہب کی بنیاد پر نہیں تھے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اہم سوال یہ تھا کہ راجپوتوں کے برابر جاٹوں اور مراٹھوں کو اعلیٰ منصب وغیرہ دیکر حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش بہتر ہے یا نہیں۔ یہ سوال کوئی نیا نہیں تھا اورنگ زیب کے سامنے بھی یہ سوال تھا اورنگ زیب کے دور حکومت میں اور اس کی وفات کے بعد شاہی فوجوں کے عزت و احترام کو کافی ٹھیس پہنچی تھی کیونکہ مراٹھوں اور کچھ حد تک جاٹ اور سکھوں نے بھی گوریلا طریقہ جنگ کو اپنا لیا تھا جس سے فیصلہ کن جنگ ناممکن ہو گئی تھی۔ مغل شہنشاہیت کی اتحاد و استحکام میں بھی گراوٹ آ گئی تھی ان حالات میں اور دربار میں مخالف گروہوں کی کارروائیوں کی وجہ سے سید برادران نے مراٹھا اور جاٹوں کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش شروع کر دی سیدوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوؤں کی تائید حاصل کرنے کے لیے مذہبی خیر سگالی ضروری ہے انتہا پسند اور دقیانوسی پالیسیوں کے حمایتی گروہ نے سیدوں کی ان پالیسیوں کی مخالفت کی۔ ان پر شرع کے مطابق کام نہ کرنے اور ہندوؤں کے حق میں ہونے کا الزام لگایا اور اس طرح "مذہب خطرے میں ہے" کے نعرے کو پھر سے بلند کیا اس گروہ نے اورنگ زیب کی پالیسی کی دقیانوسیت کو صحیح و مناسب مانا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیدوں کی پالیسی حقیقت میں اکبر کی آزاد خیالی اور خیر سگالی

کی پالیسی پر قایم تھی۔ وہ ایک ایسی حکومت کا تصور کرتے تھے جس میں تمام عناصر کا تعاون ہو برخلاف اس کے ان کے مخالفین اورنگ زیب کی دقیانوسی پالیسی کو واپس لانا چاہتے تھے اور مغلوں اور مسلمانوں کے خصوصی اختیارات کو بنائے رکھنا چاہتے تھے اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسئلے کے بنیادی پہلو اور اس کی گہرائی کو ان دونوں نے اچھی طرح سے پرکھ لیا تھا دونوں کے لیے اختیارات حاصل کرنے کا سوال اہم اور اس دور کا اصل معاملہ تھا۔ حصول اختیار کے لیے دونوں اپنے اپنے اصولوں کو اپنے مقصد کے مطابق تبدیل کرنے کو تیار تھے جو آگے آنے والے صفحات میں اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

سید و مرہٹا معاہدہ

دربار کی گروہ بندی اور حصول اختیارات کی کشمکش نے مراٹھوں سے متعلق سیدوں کی پالیسی کو واضح طور پر متاثر کیا۔ 1715 میں حسین علی جب دکن میں صوبے دار ہو کر پہنچا اس وقت حکومت کی مخالفانہ کارروائیوں سے دکن میں بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ابتداءً حسین علی خاں نے نظام الملک کی پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے مراٹھوں کی چوتھ اور سردیش مکھی کے مطالبے کو نامنظور کر دیا۔ مغل سلطنت میں مراٹھوں کے حملوں اور لوٹ مار کو روکنے کے لیے حسین علی نے فوجی مہمات شروع کیں۔ لیکن وہ مراٹھوں کی کارروائیوں کو روکنے میں ناکام رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ مراٹھا سپاہی ہمیشہ چھاپہ مار جنگ کرتے تھے شاہی حملے کے وقت وہ اپنے علاقوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور شاہی افواج کے لوٹتے ہی دوبارہ ان پر اپنا تسلط قایم کر لیتے تھے فرخ سیر کی پالیسی کی وجہ سے حالت اور بھی نازک ہو گئی بادشاہ نے مراٹھہ سرداروں اور جاگیرداروں کو اس مطلب کے خطوط لکھے کہ وہ دکن کے صوبے دار حسین علی کی مخالفت کریں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیجاپور، حیدر آباد اور کرناٹک میں حسین علی کا تسلط عام طور سے نہیں کے برابر رہ گیا۔[16]

اس حالت میں حسین علی خاں نے شنکراجی ملہار کی مدد سے مراٹھوں کے ساتھ صلح کی بات چیت شروع کی فروری 1718 میں حسین علی خاں اور ساہو کے مابین معاہدہ ہوا مغلوں اور مراٹھوں کے تعلقات کے بڑھنے میں اور مراٹھوں کے

عروج میں یہ معاہدہ اہم ہے۔ اس معاہدہ میں حسین علی کا خاص مقصد مراٹھوں کا فوجی تعاون حاصل کرنا تھا۔ اس لیے مراٹھوں کو دکن کی چوتھ وسردیش مکھی دینے کے ساتھ ہی ساتھ یہ طے کیا گیا کہ 15000 مراٹھے گھوڑسوار دکن کے صوبے دار کی خدمت کریں گے۔ کچھ بیواؤں کے ساتھ ساہو کو شیواجی کی آزاد حکومت دیدی گئی۔ دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ وسردیش مکھی وصول کرنے کے مطالبے کو بھی مان لیا گیا۔ برار، گونڈوانہ و کرناٹک میں مراٹھوں کے ذریعہ مفتوحہ علاقے بھی ساہو کو دیدیے گیے۔ ان کے بدلے میں ساہو نے دس لاکھ روپئے پیش کش کی شکل میں دینا منظور کیا لیکن سمجھوتہ کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ ساہو نے پندرہ ہزار 1500 گھوڑسوار مغل صوبہ دار کے کنٹرول میں رکھنا منظور کر لیا۔ اس نے صوبے کو پھر سے بسانے اور مجرموں کو سزا دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی منظور شدہ محصولات کے علاوہ دوسرے کسی بھی قسم کے نئے محصول کو وصول کرنے پر روک لگادی گئی خاص کر راہداری وصول کرنے پر پابندی لگادی گئی[17]

معاہدے کی کچھ شرطیں واضح طور پر حکومت کے مفاد کے خلاف تھیں حسین علی نے مراٹھوں کی چوتھ وسردیش مکھی کے مطالبے ہی کو منظور نہیں کیا' جسے منظور کرنا لازمی ہو گیا تھا' بلکہ انھیں اپنے عاملوں کے ذریعہ خود محصول اکٹھا کرنے کا اختیار دیکر سلطنت میں دوعملی قائم کردی۔

معاہدے کی شرطیں حسین علی نے رسمی منظوری کے لیے بادشاہ کو بھیجیں لیکن فرخ سیر اپنے ہی خلاف کیے گئے اس معاہدے کو منظوری دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ ہی اس سے یہ امید کی جاسکتی تھی۔ حکومت کے بہت سے خیرخواہوں نے بھی بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ مالگذاری و انتظام میں اپنے بدترین دشمن کو حصے دار مان لینا ٹھیک نہیں۔ اس لیے فرخ سیر نے اس معاہدے کو نامنظور کر دیا لیکن ساہو نے بادشاہ کی منظوری کا انتظار کیے بغیر ہی اپنے عاملوں کے ذریعہ چوتھ وسردیش مکھی وصول کرنا شروع کر دیا۔ معاہدے کے مطابق اس نے سنتوجی، پرساجی بھونسلے او بالاجی پیشوا کی قیادت میں دس ہزار مراٹھا سوار حسین علی خاں کے پاس بھیجدیئے[18]

مراٹھا اور حسین علی کے مابین ہوئے معاہدے نے فرخ سیر کی حالت کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ سید مراٹھا سمجھوتے سے پیدا ہونے والی حالت پر قابو پانے کے مقصد سے 17 17 میں فرخ سیر نے محمد امین خاں کو مالوہ کا صوبہ دار مقرر کیا اس کارروائی کا خاص مقصد حسین علی کا شمالی ہندستان کی جانب آنے سے روکنا تھا اسی طرح دکنی ہندستان میں حسین علی کے اثر کو کمزور بنانے کے لیے فرخ سیر نے اس کے شمالی صوبے (برہانپور وغیرہ) میں بہت سے نئے تقرر کیے جاں نثار خاں کو برہان پور کا صوبہ دار اور ضیاء الدین خاں ایرانی کو دیوان مقرر کیا۔ جلال الدین کو برہان پور کا دیوان اور فضل اللہ خاں کو برہان پور کا بخشی تعینات کیا گیا۔ فرخ سیر کی ان کارروائیوں کی وجہ سے دکن میں یہ افواہ کافی پھیل گئی کہ بادشاہ نے حسین علی کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے جاں نثار خاں نے حسین علی کے باپ کے ساتھ پگڑی بدلی تھی اس لیے اس نے حسین علی سے سمجھوتہ کر لیا۔ ضیاء الدین ایک قابل آدمی تھا۔ حسین علی نے اسے دکن کے دیوان کا عہدہ تو دیدیا لیکن حقیقت میں اسے کوئی اختیار نہیں دیا۔ دوسرے لوگوں کو ان کے عہدوں پر تعینات کرنے سے اس نے صاف انکار کر دیا اس لیے فرخ سیر کا یہ منصوبہ بھی ناکام رہا

اس کے بعد فرخ سیر نے کچھ پرانے امیروں کو متحد کرنے کی ٹھانی جن کے تعاون سے سیدوں پر نگرانی رکھی جا سکے۔ اس نے 1718 کے اگست وستمبر میں جودھپور سے اپنے خسر اجیت سنگھ کو مراد آباد کی فوجداری سے نظام الملک کو اور بہار کی صوبہ داری سے سر بلند خاں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا ان میں سے ہر ایک کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے ساتھ بڑی تعداد میں اپنی فوجیں لائیں اس کے پیچھے اس کا مقصد ایک عظیم لشکر اکٹھا کرنا تھا لیکن فرخ سیر اس منصوبہ میں بھی کامیاب نہ ہو سکا اسے اور اس کے مصاحبوں کو اس بات کا ڈر تھا کہ اگر ان طاقتور امیروں کے تعاون سے سیدوں کو ہٹا دیا جائے تو ان امیروں کے اثر سے آزاد ہونا اور بھی مشکل ہو جائے گا اس لیے فرخ سیر نے اپنے نئے معتمد محمد مراد کشمیری کو وزیر کے عہدہ کے لیے منتخب کیا۔ اس ترقی سے دوسرے امیر بادشاہ سے بہت زیادہ ناراض ہوئے۔ بغیر سوچے سمجھے بادشاہ نے نظام الملک و سربلند خاں کو اور بھی ناخوش کر دیا۔ اس نے سربلند خاں کو بہار کی صوبے داری سے ہٹا دیا اور اس کے بدلے کوئی مناسب

عہدہ بھی نہیں دیا۔ مراد آباد کی فوجداری بھی نظام الملک سے چھین لی گئی اور اسے ایک صوبے میں تبدیل کر کے محمد مراد کشمیری کو دیدیا گیا۔ عبداللہ خاں نے اس حالت کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے سربلند خاں کو کابل اور نظام الملک کو بہار کی صوبہ داری دینے کا وعدہ کیا اور اس طرح انھیں اپنا طرفدار بنالیا۔ اسی درمیان مالوہ میں حسین علی خاں کو روکنے میں اپنے کو نااہل سمجھ کر محمد امین خاں مالوہ سے دلی لوٹ آیا۔ بادشاہ نے غصے میں آکر اس کا منصب چھین لیا اور اسے برطرف کر دیا لیکن عبداللہ خاں کی مداخلت سے اس کا منصب لوٹا دیا گیا۔ اس طرح ایسے لوگوں کو جو اعلیٰ عہدوں کے خواہش مند تھے، عبداللہ خاں نے لالچ دیکر اپنی طرف ملا لیا۔ اجیت سنگھ پہلے ہی سے سیدوں کا طرفدار تھا۔ گجرات میں غاصبانہ وظالمانہ کاموں کا الزام لگا کر فرخ سیر نے اسے گجرات کی صوبہ داری سے ہٹا دیا تھا جس سے وہ بادشاہ سے اور بھی ناراض ہو گیا تھا۔[19]

اس لیے 1718 کے اواخر تک فرخ سیر تقریباً اکیلا رہ گیا۔ اب صرف جے سنگھ اس کا حامی تھا۔ پرانے امیروں میں سے زیادہ تر با اثر لوگ جیسے امین خاں نظام الملک اور سربلند خاں وغیرہ کا یقین بادشاہ کی جانب سے ختم ہو گیا تھا اور انھوں نے یا تو سیدوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا یا غیر جانبدار رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

موجودہ حالات میں سیدوں کے سامنے تین ہی راستے تھے اول فرخ سیر کو ہٹا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دینا جیسا کہ سلطنت کے دور میں ہوتا تھا۔ دوسرے فرخ سیر کو ہٹا کر خاندان تیمور کے کسی دوسرے شاہزادے کو تخت نشین کرنا جو ان کی خواہشات کے مطابق کام کرے۔ سوم فرخ سیر کو گدی پر بنائے رکھنا لیکن اس کے سارے اختیارات چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لینا۔ پہلے راستے کے بارے میں سیدوں نے شاید کبھی سوچا نہیں تھا اور اگر کبھی سوچا بھی ہو تو اسے عملی طور پر نہیں سوچا۔ ایک ہوشیار سیاست داں ہونے کے ناطے عبداللہ خاں نے تیسرے راستے کے حق میں ہی کام کیا۔ ایک ہم عصر مورخ کے مطابق وہ فرخ سیر کے ساتھ ویسا ہی تعلق رکھنا چاہتا تھا جیسا مہابت خاں نے جہانگیر کے ساتھ قائم کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسے اپنے پورے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اس طرح قانونی

حکمرانوں کو ہٹائے بغیر ہی وہ مکمل حکمرانہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتا تھا۔

عبداللہ خاں نے 1718 کے شروع میں حسین علی کو عجلت کے ساتھ فوراً شمالی ہندستان آنے کو لکھا ستمبر 1718 کے شروع میں فرخ سیر نے میر جملہ کو لاہور سے بلا لیا فرخ سیر کی کارروائی حسین علی کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے خلاف تھی اس طرح حسین علی کو دلی آنے کا بہانہ مل گیا۔ اکتوبر 1718 میں حسین علی دلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ برہان پور پہنچنے پر پیشوا بالاجی وشوناتھ دس ہزار 10000 گھوڑ سواروں کے ساتھ حسین کے ساتھ مل گیا اس طرح دونوں کی مشترکہ افواج کی تعداد پچیس ہزار 25000 گھوڑ سواروں اور دس ہزار 10000 پیادہ ہو گئی۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر دلّی جانے کے لیے حسین علی نے یہ بہانہ نکالا کہ اسے شاہزادہ اکبر کے اس لڑکے کو جسے سمبھاجی کے دربار میں چھوڑ دیا گیا تھا اور جسے ساہو نے لوٹا دیا ہے از خود دلی پہنچانا ضروری ہے۔[20]

اپنی عجلت پسند اور جذباتی عادت کی وجہ سے حسین علی نے شروع سے ہی فرخ سیر کو گدی سے ہٹانے کی ٹھان لی تھی۔ دلی پہنچنے تک اس نے یہ فیصلہ اپنے قریبی لوگوں تک ہی محدود رکھا حسین علی ایک آزاد حکمراں کی طرح نقارہ بجاتے ہوئے دلی میں داخل ہوا اس کا یہ برتاؤ شاہی شان کے خلاف تھا حسین علی نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب وہ بادشاہ کے خدمتگاروں میں نہیں ہے اس کا کہنا تھا "مجھے شاہی ناراضی اور اپنے منصب کے خاتمے کی پرواہ نہیں میں اپنے خاندان و قوم کی عزت قایم رکھوں گا"۔[21]

فرخ سیر کے لیے کیا پالیسی اپنانی چاہئے اس معاملے کو لے کر حسین علی اور عبداللہ خاں میں اختلاف رائے شروع ہو گیا۔ 19 فروری کو حسین علی، اجیت سنگھ اور بھیم سنگھ ہاڑا کے درمیان صلاح و مشورہ ہوا یہ طے کیا گیا کہ حسین علی کے دربار میں پہنچنے اور قیدی شہزادے کو اسے سپرد کرنے سے پہلے سید داروغہ، دیوان خاص و میر آتش ان دونوں عہدوں کا مطالبہ کریں اس کے علاوہ سیدوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ جے سنگھ کو آمیر چلے جانے کی اجازت دی جائے، قلعہ کے اعلیٰ عہدوں پر جیسے داروغہ خواصان وغیرہ ان کے ذریعہ تجویز کیے گئے لوگوں کو مقرر کیا جائے اور بادشاہ

کے روبرو حاضر ہونے کے وقت قلعہ پر سیدوں کے سپاہیوں کا کنٹرول ہو۔ فرخ سیر نے سیدوں کے ان سب مطالبوں کو منظور کر لیا جے سنگھ کو امیر جانے کی اجازت دیدی گئی داروغہ دیوان خاص، میر آتش، داروغہ خواصان، داروغہ جلو اور ناظر حرم وغیرہ سب عہدوں پر سیدوں کے ذریعہ نامزد کیے گئے لوگوں کو مقرر کر دیا گیا لیکن فرخ سیر نے یہ شرط رکھی کہ پرانے عہدیدار جشنِ نوروز تک جو ایک ماہ بعد تھا اپنے عہدوں پر قایم رہیں گے۔

22 فروری کو حسین علی نے بادشاہ کے روبرو حاضری دی اس وقت قلعہ کی سبھی خاص جگہوں پر سیدوں کے سپاہی تعینات تھے لیکن اُس حاضری سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور کشیدگی کا خلا پہلے جیسا بنا رہا ساتھ ہی خصوصی عہدوں پر سیدوں کے ذریعے نامزد کیے گئے لوگوں کے تقرر میں ایک ماہ کی تاخیر کرنے کی تجویز سے بادشاہ کی جانب شک وشبہ اور بھی بڑھ گیا اِس لیے سیدوں نے معاہدے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ 26 فروری 1719 کو عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان کشیدہ ماحول میں بات چیت ہوئی۔ مذاکرات کے دوران فرخ سیر نے عبداللہ خاں کو گالیاں دیں اس کے بعد وہ اپنے حرم میں چلا گیا اس کے بعد عبداللہ نے بادشاہ کے طرفدار شاہی محافظوں کی ٹکڑی کے سپاہیوں کو قلعہ سے نکال دیا اور قلعہ پر اپنا قبضہ اور مضبوط کر لیا۔

ان حالات کے بعد بھی عبداللہ خاں اس بات کے حق میں تھا کہ فرخ سیر کو تخت سے نہیں ہٹایا جانا چاہئے اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی وقت تک سبھی اہم عہدوں پر سیدوں کے ذریعہ نامزد کیے گیے لوگوں کا قبضہ عام طور سے قایم ہو چکا تھا اس لیے عبداللہ خاں نے فرخ سیر کو بار بار یہ پیغام بھیجا کہ وہ ان کے مخالفین کو قلعہ سے نکال دے لیکن فرخ سیر نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اسی وقت شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اجیت سنگھ اور محمد امین خاں وغیرہ امیروں نے مل کر سید برادران کو قتل کر دیا ہے نتیجے میں بہت سے امیر بادشاہ کی طرفداری کرنے کے لیے جمع ہونے لگے حسین خاں کے مراٹھا سپاہی امین خاں کے سپاہیوں سے بھڑ گیے جس سے شہر میں حالت کافی کشیدہ ہو گئی دلی میں مراٹھوں کے لیے شہری عوام

نے بغاوت کردی حالانکہ اس کے بارے میں فارسی مصنفین نے مراٹھا سپاہیو ں کی بڑی ہنسی اڑائی ہے حقیقت یہ ہے کہ دلی کی گلیوں میں کسی فوج کا عوام کی بغاوت کو دبانا آسان نہیں تھا آخر میں پندرہ سو 1500 یا دو ہزار 2000 مراٹھا سپاہیوں کے مارے جانے اور سنتاجی وغیرہ ان کے کئی سرداروں کے قتل کے بعد مراٹھا سپاہیوں کو شہر چھوڑنے کے لیے مجبور ہونا پڑا فوجی نقطہ نظر سے یہ مظاہرہ اہم نہیں تھا تو بھی اس سے شاہی خاندان کے لیے عوام کا انعقاد واضح ہو گیا اس لیے سید آخری فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں کر سکتے تھے انھیں خاص طور سے یہ خوف تھا کہ جے سنگھ جو دہلی سے صرف 40 کوس کے فاصلے پر 2000 دو ہزار گھوڑسواروں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا واپس نہ لوٹ آئے[22]

ہاشم علی خاں، اخلاص خاں اور محمد امین خاں نے حسین علی کے ساتھ صلاح مشورے میں فرخ سیر کو تخت سے ہٹا دینے کی رائے دی۔ محمد امین یہ رائے کئی دن پہلے ظاہر کر چکا تھا دوسرے امیر خاص طور سے خان دوراں اور فرخ سیر کے خسر اجیت سنگھ نے بھی یہی مشورہ دیا[23] اس لیے حسین علی نے عبد اللہ کو خط لکھ کر مطلع کیا کہ وہ خود قلعہ سے باہر آجائے اور قلعہ کا انتظام اسے (حسین علی) کے حوالے کر دے۔ اس وقت تک فرخ سیر نے حرم سے باہر نکلنے اور اپنے حمایتیوں کو عہدوں سے برخاست کرنے کی تجویز کو منظور نہیں کیا تھا اس لیے عبد اللہ خاں کے سامنے حسین علی کے مشورے کو قبول کرنے کے بجائے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اس لیے افغان سپاہیوں کا ایک دستہ حرم میں بھیجا گیا فرخ سیر کو گھسیٹ کر حرم سے باہر لایا گیا اور اسے اندھا کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ رفیع الدرجات جس کی عمر 20 سال کی تھی اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا کچھ دن بعد 29 اپریل 1719 کو فرخ سیر کا بہیمانہ قتل کر دیا گیا اور اسے ہمایوں کے مقبرے کے تہہ خانے میں دفن کر دیا گیا۔

عبد اللہ خاں نے حسین علی کے ان اقدامات کو نامناسب بتایا اور جلد بازی کے لیے اپنے بھائی کو الزام دیا فرخ سیر خوشامدی اور کمینے لوگوں کو پسند کرتا تھا جس کی وجہ سے پرانے امیروں نے سیدوں کو ان کے عہدوں سے ہٹانے میں

فرخ سیر کا ساتھ نہیں دیا۔ فرخ سیر کو عہدے سے برطرف کر کے سیدوں نے پرانے امیروں کے خلاف اپنی حفاظتی تدابیر کو ختم کر دیا۔ سیاسی، اقتصادی و انتظامی مسائل جو گذشتہ کچھ زمانے سے چلے آرہے تھے گروہ بندی و انتظامی گڑبڑ کی وجہ سے اور بھی خطرناک ہو گئے تھے۔ سیدوں کو ان سبھی مسائل کا حل تلاش کرنا تھا۔ سیدوں کا اپنے اثر کو قائم رکھنا اس بات پر منحصر تھا کہ وہ پرانے امیروں کا تعاون حاصل کریں اور مراٹھا، راجپوت، جاٹ وغیرہ کے مختلف مسائل کا جو پہلے سے چلے آرہے تھے مناسب حل تلاش کر سکیں۔

اس طرح سید برادران کو فرخ سیر کو تخت سے برطرف کرنے کے بعد اور بھی مشکل مسائل کا سامنا کرنا تھا۔

باب ششم

سید برادران اور نئی وزارت

فرّخ سیر کو معذول کرنے اور دوسرے شہنشاہ کو تخت نشین کرنے کے بعد سید برادران نے ان تمام عہدوں پر اپنے نامزد کردہ افراد کو متعین کیا جن کے وسیلہ سے شاہ کا قرب حاصل ہو سکتا تھا۔ دروغہ۔ دیوان خاص، دروغہ غسل خانہ ناظر حرم اور حتیٰ کہ خواجہ سرا اور شہنشاہ کے ملازم خاص بھی سید برادران کے منتخب شدہ تھے۔ سید ہمت خان بارہ کو شہنشاہ کا اتالیق مقرر کیا گیا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے حکم کے بغیر شہنشاہ کو کھانا تک بھی پیش نہیں کیا جا سکتا تھا شہنشاہ کسی امیر سے اس وقت تک نہیں مل سکتا تھا جب تک اس کا اتالیق یا سید برادران میں سے کوئی موجود نہ ہو۔ جب کبھی شہنشاہ نماز عوامی دعا، یا شکار کے لیے جاتا تو سادات بارہ کی ایک نمائندہ جماعت اسے نرغہ میں لیے رہتی۔ اس طرح شہنشاہ کی شخصی آزادی ختم ہو چکی تھی اور شہنشاہ تک پہنچنا بغیر سید برادران کے توسط کے ممکن نہ تھا۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے تھی کہ سید برادران کی طاقت کا انحصار صرف اس پر تھا کہ شہنشاہ کی ذات پر ان کا تصرف قایم رہے۔

یہ صورت حال 11 جون 1719 تک قایم رہی جب تک کہ رفیع الدولہ رفیع الدرجات کے دق کی بیماری سے فوت ہو جانے کے بعد منصب پر فائز ہوا۔ لیکن رفیع الدولہ بھی اسی بیماری کا شکار ہوا اور 28 ستمبر 1719 کو سید برادران نے بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے جہاں شاہ کے بیٹے محمد شاہ کو تخت نشین کیا۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد ان کے اقتدار میں معمولی سی کمی آئی اور خاندانی دربان اور ملازمین خاص کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کر دیا گیا۔ لیکن اب بھی مصالح ملکی میں شہنشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

ان عہدوں میں تبدیلی کے علاوہ جن کے ذریعہ شاہ کا قرب حاصل ہو سکتا تھا سید برادران عملاً حکومت کے ردوبدل کی پالیسی سے تقریباً دست کش ہو گئے۔ صوبوں میں گورنر اور دوسرے عمال حکومت کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کر دیا۔ پالیسی کی یہ تبدیلی نظم ونسق بحال کرنے کے لیے ضروری تھی تاکہ قدیم امرا سید برادران کے اقتدار کو انگیز کر لیں اور پھر سہولت کے ساتھ مرکزی طاقت ان کے ہاتھوں میں آ جائے۔

دربار میں فرخ سیر کے مقربین مثلاً محمد مراد کشمیری، امین الدین سنبھلی غازی الدین احمد بیگ اور شہنشاہ کے اقربا جیسے سعادت خاں اور شائستہ خاں وغیرہ کی جائیداد اور منصب ضبط کر لیے گئے لیکن بہت سے دوسرے امراء کی جائیدادوں کو ضبط نہیں کیا گیا۔ کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ بلکہ شہنشاہ کے مقرب مصاحبین مثلاً خانِ دوران اور میر جملہ کی جاگیر اور منصب برقرار رہے اور انھیں عہدے بھی دیے گئے۔ عام طور سے سید برادران نے ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر اپنی اجارہ داری قایم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امین خاں بخشی دوم کے عہدہ پر برقرار رہے ایک دوسرے تورانی روشن الدولہ ظفر خان کو بخشی سوم کے عہدہ سے سرفراز کیا گیا یہاں تک کہ کفایت اللہ خاں جس کی پالیسی سے سید برادران کو سخت اختلاف تھا خان سمن اور (خدمات معاف) کشمیر کے گورنر کے عہدہ پر برقرار رہنے دیا۔ صدر کا عہدہ ایک قدیم عالمگیری امیر امیر خاں کو اور پھر میر جملہ کو دیا گیا۔ حکومت کے دو سب سے بڑے عہدے اور دکن کے وائسرائے کے عہدہ کے علاوہ جو سید برادران کے پاس 1715 سے تھے یا ان جگہوں کے علاوہ جن سے شہنشاہ کا قرب حاصل ہو سکتا تھا اہل بارہ یا سید برادران کے ذاتی ملازمین یا متوسلین کو صرف آگرہ یا الہ آباد کی صوبہ داری یا مراد آباد کی فوج داری دی گئی۔

سید برادران کو ابھی اپنی قوت کو مستحکم کرنا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری تھا کہ سلطنت کے ہر حلقہ پر اپنا اقتدار قایم کر لیا جائے تاکہ مخالفین ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوت کو برقرار رکھنے اور امراء کی متوقع مخالفت کا مقابلہ

کرنے کے لیے ایک ایسا مضبوط حلقہ قایم کیا جائے جو ان کا معاون و مددگار ہو۔

سید برادران کے خلاف بغاوتوں کا آغاز

سیدوں کی مصالحانہ پالیسی کے باوجود ان کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت جلد دو مرکز قائم ہو گئے۔ ایک آگرہ میں اور دوسرا الہ آباد میں۔ آگرہ میں متر سین نامی ایک زمانہ ساز شخص نے علم بغاوت بلند کیا جس کا بنیادی مقصد سلطنت کی بگڑی ہوئی حالت سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا تھا اس کے حصول کے لیے انھوں نے تیمور خاندان کے ایک شریف نوجوان نیکو سیر کو جو آگرہ کے قلعہ میں مقید تھا، شہنشاہ بنا دیا۔ خود ان باغیوں کے پاس نہ طاقت تھی اور نہ ان کی کوئی اہمیت تھی۔ لیکن سیدوں کو اس کا خوف تھا کہ مخالف قوتیں نیکو سیر کے گرد جمع نہ ہو جائیں۔ یہ افواہ بھی تھی کہ نظام الملک، جے سنگھ اور الہ آباد کا گورنر چھبیلا رام ناگر نیکو سیر کی امداد کو آ رہے ہیں۔ نیکو سیر کے اعوان و انصار نے امرار، افغانوں اور مقامی زمینداروں سے مدد کی درخواست کی۔ جے سنگھ حقیقت میں امیر سے کئی منزل آگے آ گیا تھا اور آگرہ سے 80 کوس پر ٹوڈا ٹنک کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ فرخ سیر کی معزولی کے بعد بہت سے امرار مثلاً تقریب خاں شائستہ خاں وغیرہ نے جے سنگھ کے دربار میں پناہ لی تھی اور انقلاب زمانہ کے منتظر تھے۔ اس طرح سیدوں کے خلاف حزب اختلاف کا مرکز امیر بن گیا تھا اس کا بھی خوف تھا کہ بہت سے دوسرے امرار جنھوں نے بالکل آخر وقت میں سیدوں کا ساتھ دیا تھا، جے سنگھ کے معاون و مددگار نہ ہو جائیں۔

لیکن بغاوت آگرہ سے آگے نہ بڑھ سکی اور راو نیچے طبقہ سے کسی قسم کا تعاون نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ نظام الملک نے جو مالوہ جاتے ہوئے آگرہ سے گزرا اس نے بھی کسی قسم کی امداد نہ کی۔ متر سین نے سید برادران اور دوسرے مشہور امرار سے درخواست کی کہ وہ نیکو سیر کو شہنشاہ تسلیم کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ خاں اس تجویز کو قبول کرنے کے حق میں تھا لیکن حسین علی نے اسے اپنی ہتک سمجھتے ہوئے انکار کر دیا اور سخت اقدامات کا تہیہ کر لیا۔

الہ آباد کی بغاوت فرخ سیر کے قدیم خادم الہ آباد کے گورنر چھبیلا رام کی ذاتی فراست

کا نتیجہ تھی۔ وہ سید برادران کے منصوبوں کی طرف سے مشکوک تھا۔ اس شک کو اس وقت اور تقویت پہنچی جب سید برادران نے اسے الہ آباد سے منتقل کرنا چاہا۔ اور شاہ علی خاں کی سربراہی میں ایک فوج روانہ کی جس کو یہ ہدایت تھی کہ قلعہ پر قبضہ کرے حقیقت میں سید برادران کا چھبیلا رام کا اقتدار ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ الہ آباد کا مستحکم قلعہ اس کے قبضہ میں رہنا بھی ان کے خیال میں نہ تھا خاص طور سے اس لیے کہ یہ قلعہ بنگال سے دہلی آنے والے خزانہ کے راستہ کے خلاف پڑتا تھا۔ وہ چھبیلا رام کو الہ آباد کی صوبہ داری کے عوض میں اودھ دینے . . . کو تیار تھے لیکن چھبیلا رام نے ان کے کسی قول پر اعتبار نہ کیا اور (اگست 1719) کو اعلانیہ علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی چھبیلا رام کا انتقال ہو گیا لیکن اس بغاوت کو اس کے بھتیجے گردھر بہادر نے جاری رکھا۔ ان کے اقتدار کے شروع کے چودہ ماہ میں سید برادران کی تمام قوت اور صلاحیتیں ان دو بغاوتوں کی نذر ہو گئیں۔ بھوک اور غداری کے نتیجہ میں تین مہینہ کے محاصرے، محاصرین کی فاقہ کشی اور بعض کی غداری کے نتیجہ میں 12 اگست 1719ء کو آگرہ فتح ہوا۔ مزید 9 ماہ بعد گردھر بہادر کے ساتھ جنگ میں اور مصالحت کی گفتگو میں صرف ہوئے تب 11 مئی 1720 کو الہ آباد کے انخلا پر رضامند ہوا۔ قلعہ فتح ہونے کے بعد گردھر بہادر کو جو مراعات دی گئیں وہ نہ صرف معقول تھیں بلکہ تقریباً وہی تھیں جو اس کی مخاصمانہ سرگرمیوں سے پہلے پیش کی گئی تھیں۔ اسے اودھ کی گورنری مع متعلقہ جاگیروں کے پیش کی گئی۔ اس کے علاوہ دو یا تین اہم فوجداریاں جن کی اس نے خواہش کی اس کو عطا کی گئیں۔ اس کے علاوہ تیس لاکھ روپیہ بطور انعام مزید دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ ان مطالبات کی پیش کش کے باوجود گردھر بہادر نے سید برادران کے قول پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے معاہدے میں صاف صراحت کی کہ رتن چند کو ضامن بنایا جائے اور وہی اس معاہدے پر عمل درآمد کی ذمہ داری لے۔

سید برادران کے سیاسی مسائل

یہ صورت حال سیدوں کی فوجی طاقت پر منفی طور پر اثر انداز ہوئی۔ سید برادران میں اتنی قدرت نہ تھی کہ وہ طویل فوجی اقدامات برقرار رکھتے انھیں اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ ہر قدم احتیاط سے اٹھائیں تاکہ فرخ سیر کی معزولی کے لیے جو مشترک قوت رونما ہوئی تھی وہ برقرار رہے اور مستحکم ہو۔ اس کے لیے دو امور کی ضرورت تھی اول مرہٹوں اور راجپوتوں کے ساتھ اتحاد کی توسیع اور استحکام اور دوسرے عالمگیری امرا کے پیدا کردہ مسائل کا حل۔

سید برادران نے راجپوت اور مرہٹوں کے ساتھ اتحاد کو مضبوط کرنے اور ہندو رائے عامہ کو عام طور پر ہموار و ہم نوا کرنے کی سرگرم کوشش کی۔ فرخ سیر کی معزولی کے فوراً بعد راجہ اجیت سنگھ کی خواہش پر جزیہ کو ایک مرتبہ پھر ختم کر دیا گیا۔ مزید خیر خواہی کے اظہار کے لیے اجیت سنگھ کی لڑکی کو جس نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کے بعد فرخ سیر کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے نئے مذہب کو ترک کر دے اور اپنی تمام دولت املاک لے کر اپنے باپ کے ساتھ گھر واپس چلی جائے۔ یہ حادثہ جس کو خفی خان نے "نادر الوجود" کہا ہے دارالحکومت کے مسلمانوں اور خصوصاً ان قاضیوں کو سخت ناگوار گزرا جنھوں نے اسلام کو ترک کرنا غیر قانونی قرار دیا۔ لیکن سید برادران نے اس کی کوئی بھی پرواہ نہیں کی۔

جے سنگھ سوائی سید برادران سے ہمیشہ سے مخاصمت رکھتا تھا۔ وہ آگرہ کی بغاوت میں شرکت کے لیے امیر سے باہر آگیا تھا۔ اس نے ان چند امرا کو جو بغاوت کے ارادہ سے دہلی سے فرار ہو کر آئے تھے پناہ بھی دی۔ اس کے باوجود اجیت سنگھ کی معرفت سید برادران نے اس سے مصالحت کی گفتگو شروع کی۔ آخر کار آگرہ کی فتح کے بعد اور حسین علی کے حملہ کے خوف سے جے سنگھ ٹوڈا ٹانک سے واپس ہو گیا۔ سید برادران نے جے سنگھ کے ساتھ مراعات برتیں اور علاقہ احمد آباد میں سورناتھ کی فوجداری سے سرفراز کیا۔ اور ایک خطیر رقم عطا کی۔ اجمیر جیسے س—

سے اہم صوبہ سمجھا جاتا تھا اور جسے ایک مذہبی حیثیت حاصل تھی اس لیے اس کی صوبہ داری صرف اعلیٰ طبقہ کے امرا کو تفویض کی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود یہ عہدہ بھی اجیت سنگھ کو عطا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ گجرات کا صوبہ بھی اس کے تصرف میں دے دیا گیا۔ راجہ کو دوسرے اعزازات سے بھی نوازا گیا اور اس طرح وہ پوری سلطنت میں اہم اور طاقتور امرا میں شمار کیا جانے لگا۔ دونوں راجپوت راجہ متحد ہو کر سلطنت کا سب سے زیادہ بااثر عنصر بن گئے۔ اس سے ہندوؤں میں جو خود اعتمادی کی فضا پیدا ہوئی اس کا اندازہ خفی خاں کی اس شکایت سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا "دارالحکومت کے نواح سے نربدا کے کنارے تک کافرمند روں کی مرمت کرا رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ ذبیحہ گاؤ بند ہو جائے۔"

سید برادران نے اجیت سنگھ کی معرفت اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ جے سنگھ عملی طور پر ان کے ساتھ شامل ہو جائے! اس کی ایما پر اجیت سنگھ تنویر پور کے مقام پر جے سنگھ سے ملا اور اس کو اپنے ساتھ جودھپور لے گیا۔ جہاں اس کی آمد پر جشن منایا گیا اور دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد اجیت سنگھ نے اپنی ایک بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ ان اقدامات کے اثرات واضح اور بہتر ہوتے اگر سید برادران کچھ دنوں اور برسر اقتدار رہتے! اسی زمانہ میں جے سنگھ نے سید برادران کے خلاف نظام الملک کی متحدہ اقدام کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سید برادران کے ساتھ بھی تعاون کے لیے تیار نہ ہوا اس طرح راجپوتوں کے ساتھ سید برادران کا معاہدہ صرف اجیت سنگھ تک محدود رہا۔

سید برادران نے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کی اسناد شاہی دستخطوں سے مرہٹوں کو عطا کیں۔ جس کی وجہ سے مرہٹوں کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا. وہ اور مستحکم ہو گیا۔ دکن سے حسین علی کی سرکردگی میں جو مرہٹہ فوجیں دہلی آئی تھیں۔ وہ اسناد لے کر ساہو خاندان کے ساتھ واپس ہو گئیں۔ اس لشکر کے سپاہیوں کی تنخواہیں اگرچہ نسبتاً کم تھیں لیکن شمالی ہندوستان کے لوگ اور خصوصاً اہلیان دہلی ان کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے سید برادران اس لشکر کو ضرورت

سے زیادہ نہیں روکنا چاہتے تھے۔ اگرچہ شمالی ہندوستان میں کوئی مرہٹہ فوجی باقی نہ تھا لیکن دکن میں سید برادران کی ساری طاقت کا انحصار ان ہی پر تھا۔ عالم علی اور حسین علی جو دکن میں علی کے نائب تھے شنکرجی بلہار کی سرپرستی میں تھے۔ شنکرجی بلہار ایک زمانہ میں راجہ رام کا وزیر تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ حسین علی نے عالم علی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کل معاملات میں شنکرجی سے مشورہ کرتا رہے اور چونکہ آخر الذکر کا ستارا کے دربار سے خاص تعلق تھا اس وجہ سے یہ شاہو سے اور بھی اچھے تعلقات کی ضمانت تھی۔

سید برادران نے صرف راجپوتوں اور مرہٹوں ہی سے اپنے تعلقات استوار نہیں کیے بلکہ مزید مراعات دے کر چورامن جاٹ کو بھی مقرب اور باپند بنالیا۔ دہلی سے گوالیار تک کی شاہراہ اس کے سپرد کی گئی۔ اور آگرہ کے محاصرہ میں حصہ لیا اور اس خدمت کے سلسلے میں مزید مراعات دی گئیں۔

مکمل سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے سید برادران نے کسی قسم کی مذہبی یا قومی تفریق روا نہیں رکھی۔ نہ صرف مندرجہ بالا مثالوں سے ثابت ہے بلکہ عالمگیر اور بہادرشاہ کے دور کے امرا کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی اس کا مظہر ہے۔ اپنے ساتھ ملانے کے لیے اور نظم ونسق میں ان کا تعلق حاصل کرنے کے لیے ان کے مراتب میں اضافہ کیا۔ انھیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح تقریباً تمام قدیم عہدہ داران کو ان کے قدیم عہدوں پر برقرار رکھا گیا۔ نظام الملک کے نام اپنے ایک خط میں عبداللہ خان نے اپنی عام پالیسی کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے "ہندوستان جیسے عظیم ملک کا نظم ونسق بغیر امرا اور ریاست کے عہدہ داران کے تعاون کے ممکن نہیں یہ ایک فرد واحد کا کام نہیں۔ کیا موجودہ حالات میں میرے لیے یہ بہتر ہوگا کہ میں نئے افراد کو (غیر آزمودہ) مختلف منصب پر مامور کروں اور ان پر بھروسہ کروں یا آپ جیسی ہستی کا تعاون حاصل کروں جو ہمیشہ میرے دوست رہے ہیں؟"

اس پالیسی پر عمل پیرا ہونے میں سید برادران کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مثلاً فرخ سیر کی معزولی سے پیدا شدہ خوف وشک کی فضا، کچھ قدیم امرا کا حسد جنھیں یہ ناگوار تھا کہ سید برادران نے جو نئے امرا میں سے تھے اتنی طاقت کیوں

حاصل کی، محمد امین خاں اور نظام الملک جیسے افراد کی جاہ کی ہوس جو اپنا اقتدار اور اثر قائم کرنے کے خواہش مند تھے، مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی جاہ کی ہوس اور دونوں بھائیوں کے درمیان ذاتی اور سیاسی معاملات میں بڑھتے ہوئے اختلافات۔

دونوں بھائیوں کے درمیان اختلاف کی بنیاد سیاسی قوت اور فتوحات کی تقسیم تھی۔ ان میں اس پر بھی اختلاف تھا کہ قدیم امرا اور خصوصاً نظام الملک کے ساتھ کس قسم کا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ حسین علی نے یہ الزام لگایا کہ عبداللہ خاں نے اپنے محل سے تعلق کا ناجائز فائدہ اٹھا کر فرخ سیر کے دفن شدہ خزانہ اور خاندانی جواہر پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اس پر بھی اعتراض کیا کہ عبداللہ خاں نے 200 سے زائد فرخ شاہی اور دوسرے امرا کی جاگیروں کو حاصل کر کے اپنے اعوان و انصار میں تقسیم کر دیا۔ کچھ عرصہ تک تو دونوں کے درمیان اس حد تک کشیدگی رہی کہ کبھی کبھی جنگ کی بات بھی زبان پر آجاتی لیکن رتن چند نے دونوں کو تورانی خطرہ سے متنبہ کر کے صلح کرا دی۔

آگرہ کی تسخیر کے بعد مال غنیمت کا زیادہ حصہ حسین علی کو ملا۔ عبداللہ خاں نے دہلی چھوڑنے کے لیے یہ عذر کیا کہ وہ جے سنگھ کی امبر کی طرف پیش قدمی کو روکے گا لیکن اس کا اصل مقصد اس مال غنیمت میں حصہ لینا تھا۔ ایک مرتبہ پھر رتن چند نے مصالحت کرا دی۔ لیکن عبداللہ خاں مالِ غنیمت میں اپنے حصہ سے مطمئن نہ تھا۔ اسی بناء پر دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک ذاتی طور پر الہ آباد کی مہم کی سربراہی کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار مصالحت اس طرح ہوئی کہ مہم کی کمان رتن چند ہی کے سپرد کی جائے۔

ان تمام اختلافات کے پس پردہ دونوں بھائیوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش تھی۔ حسین علی عبداللہ خاں سے زیادہ مستعد تھا اور اس نے بہت جلد حقیقی طور پر اقتدار کے معاملہ میں برتری حاصل کر لی۔ لیکن وہ گرم مزاج اور عاجلانہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قبل صورت حاصل کو پوری طرح پرکھنے میں ناکام رہتا۔ اور کسی بھی مسئلہ کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ جیسا کہ خفی خاں کہتا ہے "حسین علی خود کو حکومت کے انتظامی اور دفاعی معاملات میں اپنے بھائی سے برتر سمجھتا تھا حالانکہ نہ وہ معاملہ کی حقیقت کو سمجھ سکتا تھا اور نہ مصلحت اندیش تھا۔"

اس کا قیاس یہ تھا کہ اس کے اور اس کے بھائی کے مقربین اور متوسلین میں بہت عمدہ منتظمین ہیں۔ اس کا بیٹا عالم علی جو دکن کا صوبہ دار ہے ایک مستحکم لشکر رکھتا ہے اس لیے نظام الملک کو مالوہ کا صوبہ دار بنانا اقرین مصلحت ہے کیونکہ مالوہ، دہلی اور دکن کے درمیان واقع ہے۔

اس طرح حسین علی نے اپنی قوت اور استحکام کا غلط اندازہ لگایا اور عبداللہ خاں کی اعتدال پسندانہ پالیسی اور دانش مندی کی قدر کرنے میں بھی ناکام رہا۔ سید برادران کو آئندہ جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کی ذمہ داری بڑی حد تک حسین علی کی اپنے طاقتور مخالفین کو مغلوب کرنے میں جلد بازی تھی جو ان کے تحکمانہ رویے اور غیر دانش مندانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ عبداللہ خاں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ نظام الملک کو بہار کا گورنر بنایا جائے جو شرارت پسند اور سرکش زمینداروں کا صوبہ تھا۔ اس صوبہ کے محاصل بہت کم تھے۔ اس طرح عبداللہ خاں نظام الملک کو دربار سے دور رکھنا چاہتا تھا اور ایسی جگہ تقرر کرنا چاہتا تھا جہاں وہ روپیہ اور وسائل کی کمی سے پریشان رہے۔ اس کے بعد اس سے صورت حال کے مطابق اچھی طرح نمٹا جا سکتا تھا لیکن حسین علی کے ایماء پر یہ تقرر منسوخ کیا گیا اور اس کی بجائے نظام الملک کا تقرر مالوہ میں ہوا۔ نظام الملک نے اس کو سید برادران کے اس وعدہ پر قبول کیا کہ اس صوبہ کو کم از کم طویل عرصہ کے لیے اس سے کسی حالت میں کبھی بھی واپس نہیں لیا جائے گا۔ مارچ 1719ء کو وہ دہلی سے روانہ ہوا اس کے ساتھ اس کا بیٹا مغل خاں اور ایک ہزار سے زائد منصب دار تھے جنھوں نے اس کے ایماء پر اپنے خاندان کے افراد کو بھی ساتھ لے لیا تھا اس نے سید برادران کے بار بار اصرار کرنے کے باوجود اپنے بیٹے کو اپنے وکیل کی حیثیت سے دربار میں چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

یہ بات بالکل صاف ہے کہ نظام الملک سید برادران پر اتنا ہی کم اعتماد کرتا تھا جتنا سید برادران اس پر بھروسہ کرتے تھے۔ اور جلد یا بدیر دونوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش ناگزیر تھی۔ کیونکہ سید برادران کے لیے نظام الملک کے معاملہ کی حیثیت انفرادی مسئلہ نہ تھی بلکہ کسی حد تک یہ عالمگیری اور بہادر

شاہی دور کے قدیم امراء کا مسئلہ تھا۔ ان امراء میں سے بہت سے اپنے ایرانی اور تورانی نسب پر فخر کرتے تھے حالانکہ ان میں سے زیادہ تر ہندوستان میں کئی نسلوں سے سکونت پذیر تھے اور ہندوستانیوں اور ہندوستانی نژاد مسلمانوں کے مقابلہ میں احساس برتری رکھتے تھے یہ امراء اور خاص طور سے تورانی اپنے آپ کو مغل شہنشاہیت سے منسلک کرنے کی کوشش کرتے تھے اور سیاسی تدبر کے ساتھ اقتدار حاصل کرنے کو اپنا حق جانتے تھے لیکن یہ طرز عمل جو مغل روایت کے خلاف تھا یہ ان مغرور امراء اس میں اپنی تضحیک محسوس کرتے تھے کہ حقیر ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ان پر غلبہ حاصل کرے۔ ان میں سے اکثر نے راجپوتوں اور مرہٹوں سے سید برادران کے بڑھتے ہوئے اشتراک کی مخالفت کی انھوں نے ان کوششوں کی بھی مخالفت کی جو ہندو رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے جزیہ کو ختم کر کے کی گئیں۔

اس کے علاوہ ایسے امراء بھی تھے جنھوں نے سید برادران کے اقتدار کو ذاتی جاہ طلبی میں رکاوٹ محسوس کیا۔ ان مختلف فرقوں نے سید برادران کے اقتدار کے سامنے ابھی تک سر تسلیم خم نہیں کیا تھا بلکہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ ان کے خلاف بھرپور قدم اٹھانے کے لیے موقع کے منتظر تھے۔ ان حالات میں سید برادران کے لیے نظام الملک کے خلاف سخت اقدام کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ قدیم امراء ایسے اقدام کو اپنی بیخ کنی کی پالیسی کا ایک جزو نہ سمجھیں۔ سید برادران خود یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسرا راستہ صرف یہ تھا کہ نئے اور غیر تربیت یافتہ افراد کو اقتدار سونپا جائے جس سے نہ صرف نظم و نسق کی ابتری کا اندیشہ تھا بلکہ راجپوتوں مرہٹوں اور جاٹوں وغیرہ کو اپنی قوت کو استوار کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔

بدقسمتی سے حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ سید برادران کو نظام الملک کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ انھوں نے اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

نظام الملک کی بغاوت اور سید برادران کا زوال

جس وقت سے نظام الملک نے مالوہ کا انتظام سنبھالا تھا برابر یہ خبریں آرہی تھیں کہ وہ ایک گورنر کی .... ضرورت سے بہت زیادہ لشکر اور سامانِ جنگ جمع کر رہا ہے اور یہ کہ دکن پر برابر اس کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ سید برادران کے استفسار پر نظام الملک نے یہ جواب دیا کہ مرہٹے پچاس ہزار سواروں کے ساتھ پورے صوبہ میں جو تباہی مچائے ہوئے ہیں اس کو روکنے کے لیے یہ اقدام ضروری ہے۔ اس کے باوجود سید برادران نظام الملک کے عزائم کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے یہ شبہات بے بنیاد بھی نہ تھے کیونکہ مالوہ سے نظام الملک نے اپنے بیٹے مغل خاں کو جے سنگھ سورتی کے پاس بھیجا تھا تاکہ سید برادران کے خلاف اقدام کے لیے مشورہ کرے۔ سید برادرن کو نظام الملک کے خلاف دوسری شکایات بھی تھیں مثلاً نظام الملک نے مرحمت خاں کو ملازمت دی تھی جسے حسین علی نے مانڈو کی قلعہ داری سے اس لیے برطرف کر دیا تھا کہ 1719ء میں جب وہ دہلی جاتے ہوئے ادھر سے گذرا تھا تو اس کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا تھا۔ نظام الملک کا مرحمت خاں کو ملازمت دینا سید برادران نے اپنی نافرمانی پر محمول کیا۔ ان کے علاوہ سید برادران کو نظام الملک سے کچھ دیہات کو تباہ کرنے اور کچھ پرگنہ نیلم کے زمینداروں کو ان کی مرضی کے خلاف منتقل کر دینے کی بھی شکایات تھیں۔ انھیں یہ بھی شبہ تھا کہ نیکو سیر کی بغاوت میں بھی نظام الملک کا ہاتھ تھا۔

اس کے باوجود یہ شکایات نظام الملک سے اعلانیہ تصادم کا سبب نہ بنتیں اگر دوسری اہم مصلحتیں درمیان میں پیدا نہ ہو جاتیں۔ دراصل حسین علی دکن کے ساتھ ساتھ مالوہ گجرات، اجمیر اور آگرہ پر بھی حکو- ت کرنا چاہتا تھا اس کے کے حصول کے لیے وہ مالوہ کو اپنا صدر مقام بنانا چاہتا تھا۔ اس کے دو اسباب تھے اوّل سید برادران کو مرہٹوں سے خطرہ تھا اور اس لیے دکن کے معاملات پوری طرح اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ دہلی میں بیٹھ

کرممکن نہ تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ 1719ء میں اس کے دہلی کے دورہ کے موقع پر بالا جی وشوناتھ کو ساہو نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ دولت آباد اور چاندہ کے قلعوں کا ٹیکس وصول کرے، برار میں پارسو جی بھونسلے کی فتوحات کی توثیق اور چوتھ وصول کرنے کا اختیار حاصل کرے۔ کچھ عرصہ سے مرہٹوں نے گجرات اور مالوہ سے چوتھ وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ساہو کا استدلال یہ تھا کہ اگر اسے یہ اختیار دیا گیا تو وہ ان سرداروں پر قابو حاصل کر سکتا ہے جنھوں نے خود ٹیکس عاید کرنا شروع کر دیا تھا تارا بھائی نے نظام الملک کے پاس خفیہ طور پر قاصد بھیجے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے دکن کو خفیہ طور پر فتح کرنے کا اور اس زمین کو جو خزانہ اور لشکر سے معمور تھی۔ آزاد کرانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔"

سید برادران کو ستارا خاندان کی بڑھتی ہوئی جاہ کی ہوس اور نظام الملک کی فتنہ پردازی سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں دکن کا مسئلہ از سر نو تازہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطنت کو اقتدار کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ شمالی اور جنوبی حصوں پر یکساں توجہ دی جا سکے۔ سلطنت کی اس طرح تقسیم کا مشورہ بھی دونوں بھائیوں میں روز افزوں اختلافات کے پیش نظر تھا۔ سید برادران کا پہلا قدم نظام الملک کو مالوہ سے ہٹانا تھا۔ حسین علی نے نظام الملک کو آگرہ، الہ آباد، برہان پور یا ملتان میں سے کسی اقطاع کی بھی صوبہ داری قبول کرنے کی پیش کش کی اور اسے یہ یقین دلایا کہ وہ جس صوبہ کو پسند کرے گا اس کی سند اسے بھیج دی جائے گی لیکن مالوہ کی صوبہ داری سے اس قدر جلدی علیحدہ ہو جانے پر اسے اعتراض تھا خصوصاً ان حالات میں کہ فصلیں تیار تھیں اور وہ نہ لگان کا روپیہ وصول کر سکا تھا اور نہ وہ رقم جو اس نے زراعت میں لگائی تھی۔ اس پیش کش کے جواب میں اس نے یہ احتجاج کیا کہ اس نے مالوہ کی صوبہ داری اس محکم وعدہ پر قبول کی تھی کہ اسے اس عہدے سے جلد نہیں ہٹایا جائے گا۔ اسی لیے وہ تبادلے کے اس حکم کو وعدہ خلافی کے مترادف سمجھتا تھا۔ نومبر 1719 کے قریب حسین علی نے اپنے بخشی دلاور علی خاں کی کمان میں ایک طاقتور فوج کو بلوندی کے ایک تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے

روانہ کی تھی لیکن اس کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ اس کام کو ختم کرنے کے بعد مالوہ کی سرحد پر نظر رکھے دلاور علی... بوندی میں اپنا کام ختم کر کے مالوہ کی سرحد کی نگرانی کرنے لگا۔ اسے ہوشیار رہنے کی ہدایت دی گئی تھی عالم علی کو خطوط بھیجے گئے کہ دکن کی حفاظت سے بے خبر نہ رہے۔ ان تمام پیش بندیوں کے بعد سید برادران نے نظام الملک کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دے کر شاہی نامہ بردار بھیجا۔ نظام الملک کے لیے یہ اقدام خلاف توقع نہ تھا کیونکہ محمد امین اور دیانت خاں بار بار اسے متنبہ کر چکے تھے کہ گردھر بہادر (الہ آباد میں) کے معاملات سے عہدہ برار ہونے کے بعد سید برادران اس کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسے شہنشاہ اور اس کی والدہ کے خاص بیانات بھی ملے تھے جس میں انھیں سید برادران کی گرفت سے آزاد کرانے کی خواہش کی گئی تھی اس لیے اس نے دربار میں واپسی کے احکامات کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس نے دربار... میں حاضری کے لیے اجین کو خیر باد کہا لیکن جنوب کی جانب مڑ گیا اور نربدا عبور کر کے دکن میں داخل ہو گیا۔

دکن میں فوراً ابرار اور خاندیش کے گورنر نظام الملک کے معاون ہو گئے اسیر گڈھ کا مضبوط قلعہ بغیر ایک قطرہ خون گرائے تسخیر ہو گیا۔ جو امرا اب اس کے ساتھ مل گئے تھے[1] مثلاً اسیر گڈھ کا صوبہ دار طاہر خاں اور برہان پور کے انوار اللہ خاں اور نور اللہ خاں[2] وہ سب سید برادران کے پروردہ اور معتمد تھے ان لوگوں کی سید برادران سے روگردانی نہ صرف ان کی سیاسی کمزوری کا مظہر تھی بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سید برادران کو عام مقبولیت حاصل نہ تھی۔ سید برادران نے پرانے امرا کو ان کے قدیم عہدوں پر بحال کر دیا تھا لیکن ان میں سے بیشتر نئی حکومت کو نامعقول اور سید برادران کو نمک حرام سمجھتے تھے۔ نظام الملک نے امرا کے ان جذبات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے پوری کوشش کی اور یہ بات ذہن نشین کرا دی۔

(ا) وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ شاہی خاندان کی عزت و وقار کے لیے کر رہا ہے جب کہ سید برادران تیموری خاندان کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔

(ii) سید برادران تمام ایرانی اور تورانی خاندانوں کو ذلیل و تباہ کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور اس کی اپنی تباہی اس سمت میں پہلا قدم ہے اور آخر میں یہ کہ
(iii) سید برادران نے ہندوؤں سے ساز باز کر لی ہے اور غیر اسلامی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، جو سلطنت کے مفاد کے خلاف ہے نظام الملک کی سید برادران کے خلاف تحریک کے لیے مندرجہ بالا الزامات اور خصوصیت کے ساتھ یہ اعلان کہ شہنشاہ بہت خطرہ میں ہے بہت موثر ثابت ہوئے اور بہت لوگ اس کے ہم نوا ہو گئے۔

حالات کے اس رخ نے سید برادران کو خوف زدہ کر دیا اور ان کے مشیروں میں افتراق پیدا ہو گیا۔ نظام الملک نے نسل اور مذہب کے معاملہ میں جو عصبیت اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم امراء کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا جائے اس میں دونوں بھائیوں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک مرتبہ نظام الملک نے اپنے آپ کو کردار کے اعتبار سے ایک سپاہی بتایا تھا جو ناساعد حالات میں غصہ سے مغلوب ہو کر اپنے مخالف کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ مغل امراء اور خصوصاً تورانیوں پر مزید اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے پہلا اقدام یہ تجویز کیا کہ محمد امین خان کو جو نظام الملک کا چچیرہ بھائی تھا اور بخشی دوم کے عہدہ پر فائز تھا قتل کر دیا جائے۔ عبد اللہ خاں اس قسم کے اقدام کو نہ صرف خطرناک سمجھتا تھا بلکہ بے محل اور بد دیانتی پر محمول کرتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظام الملک کی بغاوت کو انفرادی اقدام سمجھ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ بغاوت مغل امراء کے پورے طبقہ کی ناراضی کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ اس پر آمادہ تھا کہ نظام الملک کو دکن تفویض کر کے اس سے مصالحت کر لے۔ اس نے بڑے طنز سے کہا کہ نظام الملک کی بغاوت فرخ سیر کی معزولی کا پہلا ثمر ہے اس نے حسین علی پر یہ الزام لگایا کہ حسین علی نے قبل از وقت نظام الملک کو اپنا مخالف بنا لیا۔ خان دوراں اور رتن چند نے عبد اللہ خاں کی تجویز کی حمایت کی اور یہ رائے دی کہ اب جنگ سید برادران کی موت کے بعد ہی ختم ہو گی۔"

عبد اللہ خاں کے اصرار پر حسین علی نے محمد امین خاں کو معزول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مغلوں کی دل جوئی کے طور پر ایک تورانی امیر حیدر علی خاں کو

میر آتش کے اہم منصب پر فائز کیا گیا۔ لیکن حسین علی نے مصالحت کی اس تجویز کو یہ کہہ کر منظور کرنے سے انکار کیا کہ یہ شکست کے مترادف ہے نیز خود نظام الملک بھی اسے منظور نہیں کرے گا۔ اس نے اپنے بھائی پر جرأت کی کمی اور پیش قدمی نہ کرنے کا الزام لگایا۔ بالآخر اس کے ایما پر دلاور علی کو نظام الملک کے خلاف شمال کی طرف سے پیش قدمی کرنے اور عالم علی کو جو دکن میں حسین علی کا نائب تھا جنوب کی جانب سے لشکر کشی کا حکم دیا گیا۔ تاکہ اس طرح نظام الملک کو دونوں فوجوں کے درمیان پسپا کر دیا جائے۔ بالاجی وشوناتھ اور ساہو کو خطوط بھیجے گئے اور درخواست کی گئی کہ وہ عالم علی کی مدد کریں۔

نظام الملک نے سید برادران کے سپہ سالاروں سے زیادہ چستی کا مظاہرہ کیا اس سے پہلے کہ عالم علی کی فوجیں دلاور علی کی کمک سے قوت حاصل کرسکیں، نظام الملک نے دلاور علی کی افواج پر حملہ کر کے 29 جون 1720ء کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے عالم علی کی طرف رخ کیا جس کے ساتھ پیشوا باجی راؤ کی سرکردگی میں مرہٹہ سواروں کی فوج شامل ہو چکی تھی۔

اس غیر متوقع ضرب نے سید برادران کو سراسیمہ کر دیا۔ عبداللہ خاں نے ایک مرتبہ پھر نظام الملک سے صلح کی کوشش کی تاکہ سانس لینے کا موقع مل سکے۔ سید برادران کے بہی خواہوں میں بعض نے (جیسے دیانت خاں عضی یا دیوان تن وخالصہ) اس طرف توجہ دلائی کہ حسین علی کے خاندان کے افراد ابھی تک دکن میں مقیم ہیں اور ان کو نظام الملک کی دست برد سے بچانے کے لیے محتاط پالیسی کی ضرورت ہے۔ نظام الملک کا چچا زاد بھائی محمد امین خاں حالات کے اس بدلتے ہوئے رخ سے دل ہی دل میں خوش تھا اس نے نظام الملک سے مصالحت کے لیے مدد کی پیش کش کی۔

آخر کار دورخی پالیسی اختیار کرنا طے ہوا۔ نظام الملک کو فرمان اور خطوط بھیجے گئے جن کا لب و لہجہ ریاکارانہ تھا۔ اسے دکن کی صوبہ داری عنایت کی گئی ساتھ ہی دلاور خاں کے اقدام کی ملامت کی گئی۔ نظام الملک سے کہا گیا کہ عالم علی اور میر بخشی کے خاندان کو دکن چھوڑنے کی اجازت دے دے۔ اسی کے ساتھ

ساتھ دکن کے لیے بڑے پیمانہ پر فوج تیار کی گئی اور عالم علی کو اس فوج کی آمد کے انتظار کی ہدایت کی گئی۔

لیکن نظام الملک اتنا زیرک اور ہوشیار تھا کہ وہ اس طرح کی بدیہی سازش کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے مخالفین کے دام فریب میں خود ان کو پھنسا دیا ان کے خطوط و زبان کو اس طرح استعمال کیا جس کا کسی کو تصور بھی نہ تھا اس نے اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی اور اس طرح اپنے آپ کو ہر ایک کی نگاہ میں دکن کا قانونی صوبہ دار ظاہر کیا اور عالم علی کو باغی ٹھہرایا جو شاہی حکم کی خلاف ورزی کر کے دکن کی حکومت اس کے سپرد کرنے میں مانع تھا۔ اس طرح عالم علی نہ صرف اخلاقی حق سے محروم ہو گیا بلکہ بہت سے غیر مستقل مزاج افراد نے اپنی قسمت نظام الملک سے وابستہ کر لی۔

ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ سید برادران کی شکست اور زوال کی مزید تفصیل بیان کریں بلکہ صرف یہ بتانا کافی ہے کہ 10 اگست 1720ء کو شکر کھیرا کی جنگ میں نظام الملک کے ہاتھوں عالم علی اور اس کے معاونین مرہٹے بالکل تباہ و برباد ہو گئے اس کے فوراً بعد ہی حسین علی کو جبکہ وہ شہنشاہ کے ساتھ دکن کی طرف آ رہا تھا قتل کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ایک سازش کے ماتحت ہوا جو محمد امین خاں بخشی دوم، حیدر قلی خاں، میر آتش اور چند دوسرے امراء جیسے سعادت خاں (جو بعد کو برہان الملک ہوئے) اور میر جملہ نے تیار کی تھی۔ اس وقت عبداللہ خاں دہلی کے راستے میں تھا اس نے جب یہ خبر سنی تو دارالسلطنت کو واپس لوٹ گیا اور ابراہیم خاں نام کے ایک شخص کو شہنشاہ بنا کر تخت پر بیٹھا دیا اور اپنے معاونین کو جمع کرنا شروع کیا۔ سادات بارہ اور چورامن جاٹ نے آخر تک اس کا ساتھ دیا۔ بہت سے افغان بھی مطلب براری کے لیے ساتھ ہو گئے۔ اگرچہ اس وقت کے امرا میں سب سے مشہور افغان امیر محمد خان بنگش محمد امین خان اور شہنشاہ محمد شاہ کے ساتھ ہو گیا۔ فرخ سیر کے دور کے کچھ قدیم امراء جیسے غازی الدین احمد بیگ، محمد مراد کشمیری وغیرہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی میں سکونت پذیر تھے۔ عبداللہ خاں کا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے

خفی خاں لکھتا ہے "کوئی قصائی یا ورچی یا دھنیا جس نے ایک خستہ حال ٹٹو پر چڑھ کر اپنے آپ کو پیش کر دیا لشکر میں شامل کر لیا گیا اور اسی روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر کر دیا گیا۔ عجلت کے ساتھ مرتب کی ہوئی عبداللہ خاں کی یہ فوج محمد امین خاں، محمد خاں ٹنکش اور شہنشاہ محمد شاہ کی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ 13 نومبر 1720ء کو آگرہ کے قریب حسن پور کے مقام پر عبداللہ خاں کو شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا۔

اس طرح سید برادران کی نئی وزارت کا خاتمہ ہوا۔ اپنی طاقت کو مستحکم کرنے میں سید برادران کی ناکامی کا خاص سبب اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے زمانہ کے مقتدر امراء کی مخالفت تھی۔ یہ قدیم امراء سید برادران کو کم ظرف سمجھتے تھے اور اسی لیے سلطنت کے انتظام میں ان کی بالادستی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سید برادران کی عام پالیسی اور مملکت کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ بھی انھیں پسند نہ تھا۔

سید برادران کی مخالفت میں سب سے بڑھ کر اس چھوٹے مگر مضبوط گروہ نے حصہ لیا جو نظام الملک اور محمد امین خاں کے ساتھ تھا۔ یہ لائق اور حوصلہ مند امراء سلطنت میں اعلیٰ اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ طبقہ سید برادران کی راجپوت اور مرہٹوں کو مراعات دینے اور ہندو رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی پالیسی کے بھی خلاف تھا۔ اور اس اقدام کو اورنگ زیب کی پالیسی سے انحراف سمجھتے تھے اور یہ ان کے نزدیک نہ صرف ریاست کے اسلامی کردار کے منافی تھا بلکہ سلطنت اور شہنشاہیت کے مفاد کے بھی خلاف تھا۔

اپنے آپ کو اسلام اور شہنشاہیت کے نجات دہندہ کے علاوہ سید برادران کے مخالفین نے ان کو مغلوں سے برگشتہ کر کے امراء کے ایک چھوٹے طبقہ کے محدود مفاد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا اور سید برادران پر الزام لگایا کہ وہ خود اور اپنے متوسلین کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سید برادران کی پالیسی اور عمل اور اس دور کی فرقہ بندی کا تجزیہ اس قسم کی توضیح کی تصدیق نہیں کرتے۔ سید برادران نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ کوشش کی کہ بلند مرتبہ امراء میں ہر فرقہ اور ہر نسل کے افراد کو حتی کہ اورنگ

زیب اور بہادر شاہ کے عہد کے امرا اور راجپوت و مرہٹوں وغیرہ کو مجلس مشاورت میں شامل کر لیں لیکن سید برادران کی پالیسی کو غلط طریقہ سے پیش کرنا اور مغل اور سید برادران کی مخالفت کو ہندوستانیوں کی کشمکش ظاہر کرنا ہی ان مخالفین کے مفاد میں تھا۔

سیاسی اعتبار سے سید برادران کی سب سے بڑی غلطی فرخ سیر کی معزولی تھی۔ اس سوال پر اخلاقی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ کیا سید برادران شہنشاہ کے وفادار نہ تھے۔ یا وہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اس سے برتاؤ کرتے تھے۔ ارون کا خیال تھا کہ فرخ سیر کی معزولی شاید ناگزیر تھی لیکن اس ناگزیر اقدام کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا وہ غیر ضروری طور پر درشت تھا اور اس قیدی کی جان لے لینا ایسا اقدام تھا جس کا کوئی جواز نہ تھا۔

زیر بحث موضوع کی سچائی کو جاننا بہت ضروری ہے فرخ سیر کا قتل حالانکہ غیر ضروری ظالمانہ طریقہ سے کیا گیا لیکن یہ فعل بھی اس کی معزولی کا ناگزیر اور منطقی ردعمل تھا۔ جب تک وہ زندہ رہتا سید برادران اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سید برادران کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ اپنے مقصد میں فرخ سیر کی معزولی کے بغیر کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں؛ عبداللہ خاں کا خیال یہ تھا کہ بغیر اس کے بھی کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ خطبہ اور سکّے پر فرخ سیر کا نام باقی رہنے میں اس وقت کوئی نقصان نہیں ہے جب تک کہ تمام اہم عہدوں پر ان کا قبضہ رہے اور ان کے نامزد افرادان پر فائز کیے جاتے رہیں۔ معزولی نے جس کی تمام تر ذمہ داری حسین علی پر عاید ہوتی ہے امرا کے دلوں میں شبہات پیدا کر دیے تھے۔ وہ سید برادران کے ارادوں کو بھانپ گئے تھے اور اسی خیال نے ان کے تمام معاون افراد کو جو اس غیر معمولی اقدام کے حق میں نہ تھے متحد کر دیا۔

اگر انھیں ایسے بہادر افراد کی نظر سے دیکھا جائے جو اپنے ناشکر گزار حاکم کے خلاف اپنی جان اور عزت کے لیے لڑ رہے تھے تو معزولی کے بعد سید برادران کو ظالم تک حرام سمجھا جائے گا جو اپنے خاندان کی ناموس پر ایک بدنما داغ تھے۔ تمام ہم عصر مصنفین یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو سید برادران کے ہم نوا ہیں اس سلسلے

یں ان کو ملامت کرنے پر متحد ہیں اور معزولی کے فعل کو قابل مزمت ولفرت سمجھتے ہیں۔ ان کی سیاسی قوت کی کمزوری پر نظر کرتے ہوئے ملک کی مصلحت کے پیش نظر بھی یہ ایک فاش غلطی تھی کیونکہ اس نے ان کے مخالفین کو خاص طور سے چین فرقہ کو تیموری شہنشاہیت کی بقا کا علمبردار بنا دیا اور انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مفاد کے لیے عوام کو برگشتہ کیا۔

دوسرے سید برادران نے اپنے وسائل اور طاقت کا مبالغہ آمیز اندازہ لگایا۔ وہ طاقتور فرقہ کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے۔ اس مسئلہ پر آپس میں دست و گریباں رہے۔ آخر کار انھوں نے قبل از وقت طاقت آزمائی مظاہرہ کر ہی دیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ خان نے اپنی قوت کی کمزوری کا اندازہ حسین علی سے بہتر لگایا تھا تحمل اور حکمت عملی کے ساتھ وہ محمد امین خاں، نظام الملک، سربلند خاں کو فرخ سیر سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ان امرار سے نہ صرف تعلقات برقرار رکھے جائیں بلکہ اگر ممکن ہو تو زیادہ مستحکم کیے جائیں اس لیے وہ ان کے ساتھ احتیاط اور مصلحت کا حامی تھا۔ اس کے برخلاف حسین علی مغلوب الغضب اور خود پسند تھا۔ اور بظاہر یہ سمجھتا تھا کہ یہ حکمت عملی ناقابل عمل ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ نظام الملک، محمد امین خاں وغیرہ کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے یا کم از کم ایسا معذور کر دیا جائے کہ وہ نیش زنی نہ کر سکیں۔ نظریاتی اختلاف اور طریقہ عمل کے اس تضاد نے جو اقتدار کی ہوس اور مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں سامنے آچکے تھے دونوں بھائیوں کے درمیان اختلافات کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

سید برادران کا اقتدار اتنی مدت تک نہ رہا کہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔ فرخ سیر کی معزولی کے فوراً بعد پارٹی میں بڑھتے ہوئے اختلافات نے انتظامیہ کو مفلوج کر دیا تھا اور ہر جگہ زمیندار اور شورش پسند سر اٹھا رہے تھے جہانداری کے سلسلہ قوانین کو نظر انداز کیا جا رہا تھا رتن چند جیسے نائبین کی دست نگری نے سید برادران کو نہ صرف غیر مقبول بنا دیا تھا بلکہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ مال گزاری وصولیابی کے سلسلہ میں سخت گیری اور رشوت کی گرم بازاری بھی انھیں افسروں کے سبب سے تھی۔ اس

کے برخلاف وہ مصنفین بھی جو سید برادران کے بدترین مخالف ہیں اس سے انکار نہیں کرتے کہ سید برادران نے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی پوری کوشش کی لیکن ان میں جنگی لیاقت اور انتظامی صلاحیتوں کی کمی انتظامیہ پر آخری ضرب لگانے میں سربراہ رہی۔

اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر سید برادران نے مغل سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جب کہ ایک ناکارہ اور کمزور بادشاہ کی معزولی کا لازمی نتیجہ سلطنت کا پارہ پارہ ہوناتھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ اگر کچھ عرصہ اور اس پر عمل کیا جاتا تو آپ ایسے حکمراں طبقہ کے قیام میں مددگار ہوتی جس میں ہر طبقہ کے مغل امرا، راجپوت اور مرہٹے شامل ہوتے۔ آخری تجزیہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغلوں نے جو سیاسی حکمت عملی اختیار کی تھی وہ صرف اسی طرح استوار اور مستحکم ہوسکتی تھی کہ ملک میں ایسا حکمراں طبقہ پیدا کر دیا جائے۔

اس پر عمل پیرا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ سید برادران کے علاوہ نہ کوئی طاقتور طبقہ دربار میں یا دربار کے علاوہ ایسا تھا جو اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے میں دلچسپی لیتا۔ عالمگیری امرا یا وہ طبقہ جو مغل کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اقتدار میں دوسروں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تھا اور صرف اپنے آپ کو حکمرانی کا اہل سمجھتا تھا۔ مرہٹہ سردار صرف دکن پر اپنا اقتدار قایم رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور انھیں مغل سلطنت کی استواری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ عارضی طور پر شاہو کا مفاد سید برادران کے مفاد سے وابستہ تھا لیکن وہ مغل سلطنت کے احیاء اور استحکام کے خلاف تھے اور انھیں سید برادران کی اس خواہش سے کوئی ہمدردی نہ تھی کہ ایک مخلوط اور متحد حکمراں طبقہ کا قیام عمل میں آئے۔ سید برادران مرہٹوں کا تعاون کسی حد تک بھی حاصل نہ کر سکے۔ دکن میں حسین علی کے نائب عالم علی نے باجی راؤ کے اس مشورہ کو بھی منظور نہیں کیا کہ مرہٹوں کو نظام الملک کو خوف زدہ کرنے سے روکا جائے اور شمالی ہندوستان سے کمک آنے تک فیصلہ کن جنگ سے پہلوتہی کی جائے۔ مغل سلطنت کے استحکام اور استقرار میں مرہٹوں سے زیادہ راجپوتوں کا مفاد تھا کیونکہ انھیں اپنی قوت میں اضافہ کرنے اور سلطنت میں بڑے عہدہ؛

حاصل کرنے کے زیادہ مواقع حاصل تھے۔ ان سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ سید برادران کی پوری طرح مدد کرتے کیونکہ ان کی پالیسی ان کی اپنی خواہشات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتی۔ اجیت سنگھ اور جے سنگھ سید برادران کے مرہون منت تھے کیونکہ انھوں نے ان کو بہت مراعات دی تھیں لیکن ان راجاؤں میں سے کسی نے بھی سید برادران کو بروقت فوجی مدد بہم نہیں پہنچائی بلکہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے حصول کو ترجیح دیتے رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید برادران ایسے مسئلہ میں جس کا کوئی حل نہ تھا الجھے رہے سیاسی اتحاد کے امکانات نہایت کمزور تھے اور صرف ایک مضبوط اور طاقتور مرکزی حکومت ہی سلطنت کو انتشار سے محفوظ رکھ سکتی تھی ایک تجربہ کار اور باصلاحیت حکمراں کی غیر موجودگی میں طاقتور مرکزی حکومت کے قیام کا انحصار صرف ایک ایسے وزیر پر تھا جس کو یا تو امراء کے طبقہ کی حمایت حاصل ہوتی یا پھر خود سلطنت کو استحکام حاصل ہوتا۔

ان وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے سید برادران مضبوط مرکزی حکومت برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ سید برادران تیموری شہنشاہیت کو اتحاد کی ایک علامت کے طور پر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن بادشاہ اور ایک طاقتور وزیر کے درمیان جو روایاتی بدگمانیاں تھیں ان کی وجہ سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور وزیر اور بادشاہ کبھی بھی متحد الخیال نہ ہو سکے۔ اختلافات کی خلیج کو ذاتی مفادات نے اور وسیع کر دیا۔

اگرچہ ان وجوہ کی بنا پر جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں سید برادران کا تجربہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن انھوں نے جو "نئی وزارت" قایم کی اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سید برادران نے نسلی عصبیت اور تنگ نظری کو ختم کر کے ایک سیکولر اور قومی حکومت قایم کرنے کی کوشش کی۔

ان کے زوال سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کرنا چاہیئے کہ ان کی حکمت عملی اور نظریہ حکومت یکسر ناکام رہا بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے نظریات آنے والے دور کی سیاست اور معاشرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

باب ہفتم

نظام الملک اور وزارت کی کشمکش کا خاتمہ

ا۔ محمد امین خاں کی وزارت

سیدوں کے زوال ان کی شکست اور نظام الملک کے عہدۂ وزارت سنبھالنے کے درمیان ایک سال تین مہینہ کا عرصہ ہے۔ اس مدت کے پہلے تین مہینوں میں نظام الملک کا برادر عم زاد محمد امین خاں کرسی وزارت پر مسند نشین تھا۔ محمد امین خاں کو آٹھ آٹھ ہزاری منصب دو اسپہ سہ اسپہ دیا گیا۔ اور اسی کے ساتھ ملتان کی غائبانہ صوبہ داری بھی بخشی گئی۔ اس کے بیٹے قمرالدین خاں کو بخشی دوم مقرر کیا گیا اور اسے سات ہزاری منصب مراد آباد کی فوجداری اور داروغۂ احدی اور داروغۂ نسل خانہ کے عہدے بھی دیئے گئے۔ یہ عہدے اس لحاظ سے نہایت اہم تھے کہ شہنشاہ تک کی رسائی انھیں عہدے داروں کے ذریعہ ممکن تھی۔ دوسرے ان لوگوں کو بھی نوازا گیا جنھوں نے سید برادران کے خلاف سازش میں حصہ لیا تھا۔ سعادت خاں کو اودھ کا صوبہ دار اور حیدر قلی کو گجرات کا گورنر بمع عہدۂ میر آتش بنایا گیا۔ میر جملہ کے پاس عہدۂ صدر اور خان دوراں کے پاس بخشی کا قلمدان باقی رہا۔ نظام الملک کے پاس دکن اور مالوہ کی صوبہ داری برقرار رہی۔ عبدالصمد خاں کے پاس لاہور رہا اور کشمیر کا اضافہ اس کے بیٹے ذکریا خاں کے نام سے کردیا گیا۔ دوسرے صوبوں میں زیادہ تبدیلیاں نہیں لائی گئیں۔[1]

پہلے دن سے ہی نیا وزیر سیدوں کے خلاف تحریک کے مقصد کو پورا کرنے میں بہت کم دلچسپی لے رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ "شہنشاہ کو اس کے پورے اختیارات پر دوبارہ فائز کردیا جائے۔" وہ اگر کچھ تھا تو اتنا ضرور تھا کہ سیدوں سے زیادہ با اختیار تھا اور کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ تخت پر تاج پہن کر جلوہ گر رہے۔[2] شہنشاہ وزیر سے خائف تھا اور اس نے تمام اختیارات اسی کو سونپ

دیئے تھے۔ وہ عوام کی شکایات پر کوئی دھیان دے رہا تھا۔" دوسرے امرا محسوس کرتے تھے کہ شہنشاہ بالکل بے بس تھا اسی لیے وہ بھی وزیر سے خائف رہتے تھے۔[3] سیدوں کے زوال سے شہنشاہ کو جو کچھ ملا وہ اتنا تھا کہ اب اسے کچھ شخصی آزادی حاصل ہو گئی تھی لیکن حکومت کے معاملات میں اس کے کچھ اختیارات نہ تھے۔

محمد امین سیدوں کی عام پالیسی سے انحراف کر کے نئی راہ اختیار نہ کر سکا اس نے جزیہ کو دوبارہ نافذ کر دینے کا منصوبہ بنایا لیکن جے سنگھ اور گردھر بہادر کی مخالفت کے سبب اس کو اس ارادہ سے باز رہنا پڑا۔ تاہم وزیر کے حکم کی عزت رکھنے اور متعصب عناصر کو خوش کرنے کی غرض سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس ٹیکس کو صرف اس وقت کے لیے ملتوی کر دیا گیا جب تک کہ رعیت کی خوش حالی اور ملک میں امن و امان کی بحالی نہ ہو جائے۔[4]

مرہٹوں کے معاملہ میں نئی سندوں کے ذریعہ[5] چوتھ اور سردیش مکھی کی ادائگی کا معاہدہ جو سیدوں نے کیا تھا تسلیم کر لیا گیا اپنی طرف سے نظام الملک شاہو کو چوتھ اور دیش مکھی دینے کے لیے پہلے ہی راضی ہو چکا تھا اور اس معاہدہ کی ۸ جنوری کی خفیہ ملاقات میں توثیق کر دی[6]۔ یہ ملاقات ان دو اہم شخصیتوں کے درمیان طویل ملاقاتوں کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

اس طرح محمد امین خاں اور نظام الملک وغیرہ کی فتح سے سیدوں کی پالیسی میں کوئی فوری تبدیلی نہ آسکی اگرچہ سیدوں کو ان کی تمام ہندوستان نواز پالیسی کے لیے سخت بدنام کیا گیا تھا۔ اجے سنگھ ہمیشہ سے سیدوں کا زبردست مددگار رہا تھا اس کو "بدانتظامی" کے سبب ہٹا دیا گیا لیکن اس معاملے میں بھی محمد امین اس کا صوبہ اسے بحال کرنے کے لیے نصف حد تک ضرور تیار تھا۔[7]

نظام الملک کی آمد اور اس کی ابتدائی دشواریاں

محمد امین خاں ایک مختصر سی علالت کے بعد 27 جنوری 1721ء کو وفات پا گیا۔ کچھ مشوروں کے بعد شہنشاہ نے دکن سے نظام الملک کو طلب کیا کہ وہ آئے اور قلمدان وزارت سنبھالے۔ نظام الملک سیدوں کے زوال کے بعد سے اس عہدہ

کا متمنی تھا اور جب اس کو محمد امین خاں کے عہدۂ وزارت پر مقرر ہونے کی اطلاع ملی تو وہ شمالی ہندوستان کے لیے درحقیقت روانہ بھی ہو گیا تھا لیکن اپنے برادر عم زاد سے تنازعہ نہ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور کرناٹک کا رخ کیا جہاں پر مرہٹوں کے حملے ہو رہے تھے۔[8]

جب نظام الملک کو شاہی احکام پہنچے تو اس کو کرناٹک کے معاملات درست کرنے میں کچھ وقت لگا اور اس لیے وہ دربار میں 20 فروری 1722ء سے قبل حاضر نہ ہو سکا۔ اس وقفہ میں محمد امین کو اپنی حکمرانی کے جوہر دکھلانے کا پورا موقع ملا لیکن اس نے اپنے آپ کو ایک کمزور اور عیش پسند انسان ثابت کیا۔ انتظامی معاملات کی طرف سے بے پرواہ اور پوری طرح اپنے مقربین کے زیر اثر۔ وہ کبھی بھی استقامت کے ساتھ کسی ایک ارادہ پر قایم نہ رہ سکتا تھا بقول ایک مرہٹہ وکیل کے "وہ فطرۃً متبدل مزاج انسان تھا۔"[9]

اس عرصہ میں مقربین میں سے جو سب سے پیش پیش تھے وہ حیدر علی خاں اور کوکی جیو تھے۔ حیدر قلی خاں (محمد رضا) اصفرین کا باشندہ تھا اور وہ عظیم الشان کا ہمنوا رہ چکا تھا۔ جب فرخ سیر تخت نشین ہوا تو اس کو میر جملہ کے ذریعہ حیدر قلی کا خطاب حاصل ہوا۔ دکن کا دیوان بنایا گیا اور وہ تمام شاہی زمینوں اور متعدد دوسری شاہی املاک کا محافظ تھا اور اسے تمام ماتحتوں کی تقرری اور برطرفی کا اختیار تھا۔ نظام الملک کی اس کے ساتھ نبھ نہ سکی اور اس نے اس کو خود اپنے حکم سے دلی بھیج دیا تب اس کو گجرات کا دیوان اور سورت کا متصدی بنایا گیا۔ جس عہدہ سے اس نے دولت کے انبار جمع کر ڈالے۔ عبداللہ خاں اسے ناپسند کرتا تھا اور اس نے اس کو 1718ء میں عبدالحیٔ پسر عبدالغفور بوہرہ کی شکایت پر برطرف کر دیا جس کی 85 لاکھ کی املاک کو حیدر قلی نے اس بہانے سے ضبط کر لیا تھا کہ وہ لاولد مرا۔[10] دربار پہنچ کر حیدر قلی نے کسی نہ کسی طرح رتن چند کا تقرب حاصل کر لیا اور اسے آگرہ اور الہ آباد کے خلاف بھیجی گئی فوج پر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی میر آتش بنا دیا گیا۔ اس سے حیدر قلی کو سیدوں کے خلاف سازش کرنے کا موقعہ ملا اور حسین علی کو قتل کرنے کے سلسلے میں اس کو چھ ہزاری منصب پر ترقی دے دی

گئی۔ وہ ہر روز شہنشاہ کے تقرب کی وجہ سے ترقی کرتا گیا اور نظام الملک کے قلمدان وزارت سنبھالنے تک وہ آٹھ ہزاری اور سات ہزاری منصب تک ترقی کر چکا تھا۔10 الف کوکی جیو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی حسین وجمیل اور بہت عاقل وذہین عورت تھی اور شہنشاہ کی والدہ کی سہیلی تھی۔ خواجہ خدمت گار کے ساتھ جو شہنشاہ کا مقرب ہمنشین تھا، مل کر وہ ملازمتوں کے خواہشمندوں سے پیش کش کے طور پر بڑی بڑی رقوم حاصل کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود شہنشاہ بھی اس غیر قانونی آمدنی میں حصہ دار تھا۔ کوکی اس قدر با اثر ہوگئی تھی کہ یہ افواہ مشہور ہوگئی تھی کہ شاہی مہر اس کے قبضہ میں رہتی تھی۔11 شاہی مقربین کی انتظامی امور میں دخل اندازی، اور بخشی خاص خان دوراں صمصام الدولہ کی بے پناہ حسد نے نئے وزیر کی راہ میں بہت دشواریاں پیدا کیں۔ اس نے یہ دیکھا کہ آئین حکمرانی بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا، قدیم امراء کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی تھی آمدنی زوال پذیر تھی اور حکومت تیزی سے قبر میں دھنستی چلی جا رہی تھی۔

جب نظام الملک نے حیدر قلی کی انتظامیہ امور میں دخل اندازی کی شکایت کی تو شہنشاہ نے حیدر قلی کو گجرات واپس چلے جانے کی ہدایت کی۔ گجرات پہنچ کر حیدر قلی نے ایک متکبرانہ اور مغرورانہ انداز اختیار کرنا شروع کرنا اور ایک خود مختار حکمران جیسا طور طریق اپنانے لگا۔ اس نے شاہی امراء کو دی گئیں جاگیریں ضبط کرنا شروع کر دیں اور عربی حبشیوں اور فرانسیسیوں (یوروپیول) کو اپنے توپ خانے کی تقویت کے لیے مقرر کر لیا۔ سامان کو بغیر اجازت اپنی تحویل میں لینے لگا۔ وہ اونچے چبوترے پر بیٹھ کر فریادیں سنتا تھا اور اس طرح شاہی امتیازات کو گویا پامال کرتا تھا۔ جانوروں کی کشتیاں ملاحظہ کرتا اور اپنے ہمنواؤں کو جھالر لگی پالکیاں بخشش میں دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ایسا کرنے کی جسارت اس لیے کرتا تھا کہ اس کو پوشیدہ طور پر شاہی پشت پناہی حاصل تھی۔12

بالآخر نظام الملک نے جسے کچھ ہی عرصہ قبل مالوہ کی گورنری سے برطرف کیا گیا تھا، شہنشاہ کی خوشامد کی کہ گجرات کا صوبہ اس کے بیٹے یعنی غازی الدین

خاں کے نام پر اسی کو دیدیا جاتے۔ دسمبر 1722ء میں وہ حیدر قلی کے حوصلوں کو پست کرنے کے بہانے گجرات روانہ ہو گیا۔ 13 لیکن اس کے اصل مقاصد کچھ اور ہی تھے اس کے دہلی آنے کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ اسے غلط فہمی تھی کہ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نئے شہنشاہ سے کیا امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اور کہاں تک اس سے خطرہ ہے۔ ان میں سے پہلی تمنا تو محض ایک فریب نظر بنتی دکھائی دے رہی تھی یعنی کم از کم جتنا آسان وہ اس کام کو سمجھتا تھا اس سے کہیں زیادہ دشوار نکلا۔ اسی اثنا میں دکن میں اس کی بنی بنائی بات خراب ہوتی نظر آ رہی تھی۔ مبارز الملک نے جس کو اس نے اپنی غیر حاضری میں اپنا نائب مقرر کر دیا تھا، شاہو کے ساتھ چوتھ اور سر دیش مکھی کے سلسلے میں ہونے والے معاہدہ کو کالعدم کر دیا تھا اور اس کے سبب مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہو گیا تھا 1723ء میں پیشوا باجی راؤ ایک زبردست فوج کے ہمراہ مالوہ میں داخل ہوا۔ اہم صوبہ میں جو سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھا مرہٹہ ریشہ دوانیوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔

نظام الملک مالوہ میں جھبوا کے قریب بداکشا (یا بولاشا) کے مقام پر باجی راؤ سے 21 فروری 1723ء کو ملا اور اس کے ساتھ ایک ہفتہ تک مقیم رہا۔ (2 مارچ تک)۔ 15 ہمیں اس گفت وشنید کی عیت اور اس کے نتائج کا کچھ علم نہیں ہے۔ ہم صرف اندازہ لگا سکتے ہیں اور انہیں سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اس ملاقات کے بعد، نواب بھوپال، دوست محمد خاں کے خلاف ایک مشترکہ مہم چلائی گئی کچھ ہی عرصے کے بعد نظام الملک نے مالوہ کے صوبہ کا انتظام سنبھال لیا اور باجی راؤ دکن کو لوٹ گیا۔

مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں کی گفتگو کا رجحان دوستانہ تھا اور اس کے نتیجہ میں آپس میں کوئی مفاہمت ہو گئی تھی۔ نظام الملک کی جانب سے، پیشوا کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے اسباب واضح طور پر موجود تھے۔ ابھی تک اس نے دہلی کا رخ کرنے یا دکن ہی میں رہ جانے کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں اپنے دشمن پیدا کر لینا عقلمندی نہ تھی۔ باجی راؤ کی جانب سے بھی نظام الملک کے ساتھ دوستی قائم کر لینے کے

لیے کافی مضبوط وجوہات موجود تھیں۔ نظام الملک آخر شاہی وزیر تھا وہ پوری حکومت میں سب سے زیادہ بااثر امیر تھا اور دکن کا تو گویا مالک تھا۔ اس وقت تک اس نے مرہٹوں کو ایسا کوئی موقع نہیں دیا تھا جو وہ مخالفت کر سکیں اس نے شاہو کے چوتھ اور سردیش مکھی جمع کرنے کے اختیار کو تسلیم کر ہی لیا تھا اس لیے نوجوان پیشوا ایک ایسے بااثر شخص کی دوستی کا ضرورتمنی تھا۔

لیکن یہ نظام الملک کی سیاسی فہم و فراست کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا کہ پیشوا کی دوستی سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ وہ موخر الذکر کی مملکت کی توسیع کی روک تھام کے لیے بھی اقدامات سے .... قل نہ تھا مالوہ کی صوبہ داری کا جس کے لیے شہنشاہ کی اجازت بعد میں حاصل کی گئی۔ 17۔ اصل مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کی قوت کو جنوب ہی میں محدود رکھا جائے اور شمال میں ان کی توسیع پسندی کو روک دیا جائے۔

اس طرح ہم شروع ہی سے نظام الملک کو اس حکمت عملی پر کاربند پاتے ہیں جس کے مطابق وہ زندگی بھر عمل کرتا رہا یعنی دکن میں اپنا اقتدار قائم رکھنا دلی کے لیے ایک راستہ کھلا رکھنا اور بغیر نا قابل تلافی تصادم مول لیے ہوئے مرہٹوں کی طاقت کو محدود رکھنا۔ اس ملاقات کے بعد نظام الملک نے دوبارہ گجرات کا رخ کیا۔ حیدر قلی جسے کسی طرف سے بھی اعانت نہ مل سکی۔ خوف و ہراس سے نڈھال ہو گیا۔ جنون کا بہانہ کر کے وہ بہت قلیل جماعت کے ساتھ دہلی کے لیے روانہ ہو گیا یہ سن کر نظام الملک نے اپنے چچا زاد بھائی حامد خاں کو گجرات میں نائب مقرر کیا اور جھالور سے دہلی کی طرف لوٹ گیا۔ 18

اس طرح گجرات پر بھی نظام الملک کا تصرف ہو گیا۔

نظام الملک کا اصلاحات کا منصوبہ اور دکن کے لیے اس کی روانگی

3 جولائی 1723ء کو نظام الملک دربار میں واپس آیا۔ اس نے دیکھا کہ کوکی کے زیر اثر رشوت ستانی اور بداعمالی بہت بڑھ گئی تھی درباریوں اور شاہی مقربین نے سیر حاصل جاگیروں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ حد یہ ہے کہ خالصہ بھی منصب داری میں تقسیم کیا جا چکا تھا۔ اجارہ داری جاری ہو چکی تھی اس سے

ایک طرف تو قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف اجارہ داری کے نرخ کا زیادہ ہونے کی وجہ سے کسانوں میں غربت پھیل رہی تھی اور مالگذاری کی وصولیابی میں کمی واقع ہوگئی تھی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک تحفوں اور پیش کش کی صورت میں رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ قدیم امرا بے روزگاری اور افلاس میں وقت گزارتے تھے۔ اور شاہی خزانے میں افواج کو اور منصب داروں کو ادا کرنے کے لیے نقد روپیہ موجود نہ تھا۔ چھوٹے منصب داروں کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ ان کے پاس اپنا معیار زندگی برقرار رکھنے اور اپنے ماتحتوں کو قائم رکھنے کے ذرائع موجود نہ تھے اسی وجہ سے ان میں سے اکثر نے تجارت شروع کر دی تھی۔ 19

نظام حکومت کو بہتر کرنے اور حکومت کے خزانوں کو سیراب کرنے کی غرض سے نظام الملک نے ایک مفصل منصوبہ تیار کر کے شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اس کی خاص خاص تجاویز جنھیں وہ دربار میں پہنچنے کے پہلے ہی روز سے شہنشاہ کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ حسب ذیل تھیں۔ صرف با صلاحیت اور کارگزار امراء اور سپاہی مقرر کیے جائیں جیسا کہ اورنگ زیب کے عہد میں ہوتا تھا، خالصہ زمینوں کی کاشت بندی کی جائے۔ جاگیروں کی دوبارہ تقسیم ہو اور خالصہ زمین (جو جاگیروں میں دے دی گئی تھیں) واپس لے لی جائیں۔ رشوت ستانی ختم کی جائے۔ اور اورنگ زیب کے عہد کی طرح جزیہ بھی نافذ کر دیا جائے۔ 20

یہ تجاویز شہنشاہ کو مطلقاً پسند نہ تھیں۔ اور مقربین کو یہ خدشہ تھا کہ اگر نظام الملک کو ایک بار دربار پر تسلط حاصل ہوگیا تو وہ سب اپنے اقتدار سے محروم ہو جائیں گے۔ ان مجوزہ اصلاحات سے مقربین کو سخت نقصان ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے شہنشاہ سے عرض کی کہ اب حکومت کے حالات اورنگ زیب کے عہد کے حالات سے بالکل مختلف ہیں اس لیے قدیم قوانین کے نافذ کرنے سے مال گزاری اور انتظامی امور کا طریقۂ کار درہم برہم ہو جائے گا۔ انھوں نے شہنشاہ کے دماغ میں نظام الملک کے ارادوں سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے شروع کر دیے اور اس کی بلند خواہشات اور اختیارات واثرات کے لیے اس کی کوششوں کا بار بار تذکرہ کیا اور یہ بھی اس کے دماغ میں بٹھایا کہ اس جیسا کامیاب سپہ سالار شاہی خاندان کے

مستقبل کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے۔ 21 انھوں نے جزیہ کو دوبارہ شروع کرنے کی تجویز کے مخطرات سے آگاہ کیا اور انفرادی اور اجتماعی طور پر شہنشاہ سے یہ کہا کہ جزیہ کا ٹیکس بے محل ہے۔ اور نظام الملک کی تجویز کا مقصد محض حکومت میں خلفشار پیدا کرنا اور حکومت اور اس کے ملازمین کے درمیان ایک عداوت اور مخاصمت پیدا کرنا ہے ہم عصر مصنف وارد افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ امرا ایمان اور دین کے معاملات میں بہت سست پڑ چکے تھے اور وہ جزیہ کی مخالفت کو ہندوؤں کی تحریک کا نتیجہ بتلاتا ہے مقربین تو اپنے ہی مقاصد کی بنا پر نظام الملک کی تجاویز کی مخالفت کر رہے تھے مو خر الذکر کی یہ جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنے کی بنا پر اس کے مخالفین کو ہندو امرار اور راہل کاروں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوگی اور اس طرح انھوں نے نظام الملک کو سب سے جدا کر دیا۔ حد یہ ہے کہ عبدالصمد خاں جو شادی کے رشتہ سے نظام الملک کا قرابت دار ہوتا تھا وہ بھی جزیہ کے دوبارہ نافذ کرنے کے خلاف تھا۔ 22

نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ نے رسمی طور پر تو نظام الملک کی اصلاحات کے لیے اپنی مرضی ظاہر کر دی لیکن درحقیقت اس نے ان کو بالکل مسترد کر دیا۔ اصلاحات کی تجویز کے رد ہو جانے سے نظام الملک ایک عجیب دشواری میں پھنس گیا۔ یا تو وہ سید برادران کے نقش قدم پر چل کر ایک فوجی بغاوت کرے، اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر دے اور محمد شاہ کو محض ایک کٹھ پتلی بنا دے یا کسی دوسرے کو اس کی جگہ شہنشاہ مقرر کرے۔ نظام الملک میں غالباً یہ سب کچھ کرنے کی طاقت تو تھی اور بغاوت کے بعد اس کے لیے سید برادران سے زیادہ اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے مواقع بھی موجود تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک اس طریقہ کو بے سود اور غیر شریفانہ سمجھتا تھا۔

امرا نہایت مختلف الطبع لوگ تھے اور ان میں آپس میں زبردست حسد اور جلن موجود تھی اس لیے ان کی اعانت کے بھروسہ پر کوئی بھی خواہ کتنا ہی لائق و فائق کیوں نہ ہو مکمل طور پر بااختیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کوئی نیا خاندان برسر اقتدار لائے۔ لیکن موجودہ حالات میں ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس دربار میں بے بس بن کر رہنا اس

کے مزاج کے خلاف تھا اور اس سے دکن میں نظام الملک کی بنی بنائی بات بگڑ سکتی تھی شاہی مقربین نے شہنشاہ کو باور کرانے میں تساہل نہ برتا کہ نظام الملک کا ایک ہی وقت میں دکن پر اقتدار، گجرات اور مالوہ کی (غیابی) صوبہ داری کے ساتھ ساتھ وزیر بھی ہونا حکومت کے لیے سخت خطرہ کا سبب ہو سکتا ہے۔ مغل تاریخ میں ایک شخص کے ہاتھ میں اس قدر اختیارات کے مرکوز ہو جانے کی کوئی ایک نظیر بھی تو نہ تھی۔ چنانچہ نظام الملک کو دکن کی گورنری سے برطرف کرنے کے اقدامات شروع ہو گئے۔

نظام الملک دکن کو ہمیشہ اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھتا تھا اس کی جوانی کا بیشتر حصہ وہیں گذرا تھا اور سیدوں کے قبضہ سے نکالنے کے بعد سے وہ دکن پر اپنی تلوار کے زور پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ ایک متزلزل وزارت کے بدلے دکن کے اقتدار کا سودا کرنا نہ چاہتا تھا۔ دکن میں مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر کی وجہ سے اور اپنے نائب مبارز الملک پر عدم اعتبار کے سبب سے وہ دکن کی طرف لوٹنا نہایت ضروری سمجھتا تھا دکن سے ہٹانے کے لیے اس نے مبارز الملک کا نام کابل کی صوبہ داری کی خالی آسامی کے لیے تجویز کیا تھا۔[23] دہلی کا سفر تو گویا محض ایک آزمائشی سفر تھا۔ خود اپنی آنکھوں سے دربار کی روبہ زوال حالت دیکھ کر اور شہنشاہ میں قوت ارادہ کے فقدان کو محسوس کر کے اس نے اپنا الگ راستہ بنانے کی ٹھان لی کیونکہ دربار کی طرف سے کسی قسم کے نقصان پہنچنے کا خدشہ نہ تھا دربار کی اصلاح اور حکومت کے امور کو سدھارنے کی کوشش کے بارآور نہ ہونے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکا تھا۔

اپنی پیش کردہ تجاویز کے مسترد کیے جانے کے کچھ عرصے کے بعد نظام الملک نے گفت و شنید کے جاری رکھنے کا بہانہ کیا۔ لیکن یہ بالکل واضح تھا کہ اس نے دکن کو لوٹ جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ دسمبر 1723 میں راجہ گوجرمل، دیوان خالصہ کے فوت ہو جانے پر جو کہ نظام الملک کی طرف سے شہنشاہ سے گفت و شنید کر رہا تھا، مصالحت کی آخری توقع بھی ختم ہو گئی۔[24] دسمبر 1723 میں نظام الملک اپنی جاگیر مراد آباد اپنی "تبدیل آب و ہوا" کے لیے پہنچا۔ آگرہ سے اس نے خبر ارسال کی کہ مرہٹوں نے مالوہ اور گجرات پر حملہ کر دیا ہے، مالوہ اور گجرات اس کے

بیٹے کی صوبہ داری میں تھے۔ چنانچہ اس نے لکھا کہ وہ ان کو پسپا کرنے کی غرض سے ان پر جوابی حملہ کرنے جا رہا تھا۔ جب نظام الملک مالوہ پہنچا تو مرہٹوں نے نرمدا کو دوبارہ پار کر لیا تھا۔ اسی وقت اس کے پاس یہ خبر پہنچی کہ دکن میں مبارز الملک یعنی اس کے نائب کو گورنر مقرر کر کے نظام الملک کو معزول کر دیا گیا تھا اور اب اس کے خلاف کانوجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں سے کمک مانگی جا رہی تھی۔[25] شہنشاہ نے بھی شاہو سے مشورے شروع کر دیے تھے۔[26] اب نظام الملک نے ہر پردہ کو چاک کر کے دکن کا رخ کیا۔

11 اکتوبر 1724ء کو باجی راؤ کی مدد سے نظام الملک نے اورنگ آباد کے قریب شکر کھیڑا کے مقام پر مبارز الملک کو شکست دی۔[27] اسی تاریخ سے حیدرآباد کا ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے آغاز ہوتا ہے اور مغل حکومت کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہوتا ہے۔

جاٹوں اور راجپوتوں کے معاملات

راجپوتانہ اور صوبہ آگرہ کی سرحدوں پر جاٹوں کے اقتدار، راجپوت حکمرانوں کی طاقت اور راہمیت میں روز افزوں اضافہ یہ دو امور پچھلے کچھ عرصہ سے نہایت نمایاں صورت اختیار کر گئے تھے۔ ان طاقتوں کے ساتھ سید برادران کے قریبی تعلقات نے اس عمل کو مزید تقویت بخش دی تھی، جس سے جاٹوں اور راجپوتوں میں زبردست اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔

سیدوں کے زوال کے بعد ان عناصر کے ساتھ مغل حکومت کے تعلقات کی نوعیت دوبارہ درباری حلقوں میں ایک خاص موضوع بن گئی تھی چورامن جاٹ نے سید برادران کا اس وقت ساتھ چھوڑ دیا تھا جب ان کی قسمت ان سے برگشتہ ہو گئی تھی اور وہ شاہی افواج سے آ کر مل گیا تھا۔ لیکن عبداللہ خاں کے خلاف حسن پور کی جنگ کے موقع پر اس نے پھر ساتھ چھوڑ دیا اور شاہی افواج کے عقبی دستہ کے ساز و سامان کو لوٹ لیا۔ اس نے اپنی بے وفائی کے ان طریقوں کو اس کے بعد بھی جاری رکھا اور بندیلوں کی مدد کی جب وہ الٰہ آباد کے صوبہ دار محمد خاں

بنگش کے نائب دلیر خاں سے دست وگریباں تھے۔ 1721ء میں چورامن نے سعادت
خاں کی افواج کو تاراج کیا جبکہ وہ جودھپور کے اجیت سنگھ کی سرزنش کے لیے جارہے
تھے معاملات اس وقت اور سنگین ہوگئے جب 1722ء میں چورامن کے بیٹے محکم
سنگھ نے آگرہ کے گورنر سعادت خاں کے نائب نیل کنٹھ ناگر کو شکست دی اور
اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا (سعادت خاں اس وقت آگرہ کا صوبہ دار
تھا) سعادت خاں کا جاٹوں پر کوئی خوف وہراس قائم نہ ہوسکا۔ چنانچہ خان
دوراں کے مشورے پر 1722ء میں اجیت سنگھ کو ان کے خلاف مہم اقدام
کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ 28

اگرچہ جے سنگھ جاٹوں کے فتنہ کو دبانے کے لیے تیار تھا لیکن اپنی پچھلی شکستوں
کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اس وقت تک اقدام کرنے سے انکار کر دیا جب
تک اسے آگرہ کا صوبہ دار مقرر نہ کر دیا جائے۔ ا ستمبر 1722ء کو اس کی خواہش
پوری کر دی گئی اور اس کے فوراً بعد ہی جے سنگھ چودہ پندرہ ہزار سوار لے کر دہلی
سے روانہ ہوگیا اس وقت تک چورامن مرچکا تھا اور اس کے بیٹے محکم سنگھ نے
جاٹوں کی رہبری کا کام سنبھال لیا تھا۔

جے سنگھ نے جاٹوں کے گڑھ ٹھن کا محاصرہ کر لیا اور باقاعدہ جنگلات کو کاٹتا
ہوا اور محاصرہ کو سخت سے سخت تر کرتا ہوا آگے بڑھتا اس میں چند ہفتے گزر گئے 29
یہ کہنا تو مشکل ہے کہ یہ محاصرہ کب تک چلتا لیکن جاٹوں کے درمیان اختلافات
شروع ہوگئے۔ محکم سنگھ کا چچازاد بھائی بدن سنگھ اجیت سنگھ کی طرف آملا اور اس
نے جاٹوں کے دفاع کے کمزور مقامات اس کو بتادیے۔ اب محکم سنگھ کی صورتحال
خطرناک ہوگئی۔ ایک رات اس نے مکانات کو آگ لگا دی' بارود کو نذر آتش
کر دیا، جس قدر بھی نقد اور جواہرات جمع کر سکتا تھا وہ لے کر اجیت سنگھ کے پاس
بھاگ کر پہنچ گیا۔ اجیت سنگھ نے اس کو پناہ دی۔ اب جے سنگھ کامیابی کے ساتھ
قلعہ میں داخل ہوا اور اس کو مسمار کر دیا اور اہانت کے طور پر زمین پر گدھوں
کے ہل چلوا دیے۔ 30

اس فتح کے لیے جے سنگھ کو راجائے راجیشور کا خطاب دیا گیا۔ جاٹوں کو

ساتھ صلح کی کیا شرائط قرار پائیں اس کا تذکرہ کسی معاصر کے یہاں نہیں ملتا۔ بدن سنگھ جاٹوں کا سربراہ مقرر ہوا اور چورامن کی زمینداری اس کے قبضہ میں آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اہم قلعوں کو تو مسمار کر دیا گیا تھا لیکن چورامن خاندان کو اس پورے علاقے سے محروم نہیں کیا گیا تھا جو رفتہ رفتہ انھوں نے حاصل کیے تھے اس کے بعد سے بدن سنگھ اپنے آپ کو عاجزی سے جے سنگھ کا باج گذار لکھتا تھا۔ لیکن وہ ایک اچھا منتظم تھا۔ اس کی متالا سرپرستی میں بھرت پور کا خاندان اگلے بیس سال میں خاموشی اور استقلال کے ساتھ قوت حاصل کرتا گیا۔ اس طرح جاٹوں کی قوت جو عدم پہنچا تھا وہ صرف ظاہری تھا اور اس کی حقیقت کچھ نہ تھی۔

سیدوں کے زوال سے بھی راجپوتانہ کے سیاسی حالات میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ سیدوں کے اقتدار کے دوران اجیت سنگھ راٹھور راجپوت راجاؤں میں سب سے اہم راجہ ہوگیا۔ کیونکہ وہ گجرات اور راجپیر دونوں کا صوبہ دار تھا۔ جیت سنگھ ہمیشہ ایک اوسط درجہ کا منتظم تھا اور اس کی پچھلی صوبہ داری پر راجہ اور راجہ کے اہل کاروں کے خلاف ظلم وتشدد کی بہت سی شکایات موصول ہوئیں۔ ان شکایات کے پیش نظر 1717ء میں فرخ سیر نے بد انتظامی 31 کے الزام پر راجہ کو اس کے منصب سے معزول کر دیا تھا لیکن جب اقتدار سیدوں کے ہاتھوں میں آیا تو انھوں نے راجہ کو اس کے پرانے منصب پر بحال کر دیا اور اس کو اجمیر کا صوبہ دار مقرر کر دیا اجیت سنگھ نے دوبارہ گجرات کے معاملات کو اہل کاروں پر چھوڑ دیا اور عبد اللہ خاں کی متعدد اور پر زور سفارشوں کے باوجود جودھ پور کو چھوڑ کر خود صوبہ کی ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ 32

سیدوں کے زوال کے بعد شہنشاہ نے حیدر قلی خاں کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ اور خانِ دوراں کے چھوٹے بھائی مظفر علی خاں کو اجمیر کا صوبہ دار مقرر کیا۔ 33

جب اجیت سنگھ نے یہ سنا وہ تیس ہزار افواج لے کر جودھ پور سے روانہ ہو کر اجمیر پر قابض ہوگیا۔ اس نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہ کی جائے گی۔ اس نے شہر کے تمام بااثر لوگوں کو جمع کیا

اور جہان شاہ یعنی شہنشاہ کے والد کا ایک نشان دکھلایا جس کی رو سے اس کو اجمیر اور گجرات کی صوبہ داری تاحین حیات بخش دی گئی تھی۔ اس نے شہنشاہ سے بھی درخواست کی کہ اجمیر یا گجرات کا صوبہ اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ 34

دربار میں صورت حال نہایت ہی زیر و زبر تھی، نامزد صوبہ دار مظفر علی خاں دہلی سے چند منزلیں بھی طے نہ کرنے پایا تھا۔ وہ ایک نیا امیر تھا اور اس کے پاس فوج کو جمع کر لینے کے ذرائع موجود نہ تھے شاہی خزانہ خالی تھا۔ پچھلی خانہ جنگی میں ہر چند اختتام تک پہنچ گئی تھی۔ فوج کے مطالبات واجب الادا تھے اور سپاہ دل برداشتہ تھی۔ دربار میں گروہوں اور جماعتوں کی کثرت تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر خان دوراں، اجیت سنگھ سے مصالحت کر لینے کے حق میں تھا اور اس کی یہ دلیل تھی کہ اگر وہ میدان جنگ میں ہار بھی گیا تو وہ اپنے وطن مالوف کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں جا چھپے گا جہاں کوئی بھی اس کا تعاقب نہ کر سکے گا۔ 35 بالفاظ دیگر وہ اس صورت حال سے خائف تھا جس میں 1679 میں اورنگ زیب پھنس گیا تھا۔ ایک دوسرا گروہ جس کا سربراہ حیدر قلی اور کچھ امراء تھے، اجیت سنگھ کو اجمیر کی صوبہ داری دینے کے خلاف تھا ان کی دلیل یہ تھی کہ اجمیر دہلی سے قریب کا صوبہ تھا اور اس میں مسلمانوں کے متعدد متبرک مقامات تھے۔ اس لیے اس پر ہندو اقتدار مناسب نہ تھا۔

ابھی دربار میں اس معاملہ پر بحث ہو رہی تھی کہ مظفر علی خاں کے فوجی تنخواہیں نہ ملنے کے سبب سے باغی ہو گئے اور ان کے ہاتھ جو آ رہا تھا اس پر قابض ہونے لگے مجبور ہو کر مظفر علی نے اجمیر میں پناہ لے لی تھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر، ابھے سنگھ کی سربراہی میں راٹھوروں نے شاہی سرحدوں پر بہت لوٹ مار مچائی۔ نرنول میں زمیندار اور مقامی گروہ اس قدر زور آور ہو گئے تھے کہ انھوں نے بغاوت کر دی تھی اور شہر میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ اس طرح دربار کی کمزوری سے ہر طرف صورت حال ابتر ہو چلی تھی۔ 36

اب اجمیر کی صوبہ داری ایک کشکول بن گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے خان دوراں حیدر قلی، اور مرحوم وزیر کے فرزند قمر الدین خاں نے اس آسامی کو قبول کیا

لیکن صوبہ کے انتظام کی قیمت اور دشواریوں سے سب ہی ہراساں ہو گئے۔ بالآخر نصرت خاں بارہ کو اس خالی صوبہ داری پر مقرر کیا گیا۔ اس وقت نظام الملک دکن سے آگرہ کو آرہا تھا اب اجیت سنگھ نے جوش کی بجائے ہوش مندی سے کام لیا اور وہ فوراً ہی اجمیر سے رخصت ہوگیا اور اس نے معافی تلافی کے خطوط لکھے۔ 37 اس کے اس عمل سے اس کی عزت میں کچھ فرق نہیں آیا کیونکہ اس کے دوست خانِ دوراں کی سفارش سے اس کو معاف کر دیا گیا اور اسے اجمیر کی صوبہ داری پر قایم رہنے کی اجازت مل گئی (مارچ 22 17ء) خان دوراں کی نیت کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے شاید نظام الملک کو اجیت سنگھ کی بغاوت کے فرو کرنے کی نیک نامی سے محروم رکھنا چاہا جیسا کہ چند مورخین کا خیال ہے کہ یا اس نے ایک ایسے گروہ کو وجود میں لانے کو سوچا ہے۔ جس کے ہندی نژاد مسلمان اور راجپوت بعض امرار کے تنگ نظرانہ اور علیحٰدہ روی کے رویہ کا مقابلہ کر سکیں۔

چونکہ دربار کی ایک طاقتور جماعت اجیت سنگھ کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی یہ طے کیا گیا کہ نہر خاں جو سانبھر کا فوجدار اور گجرات کا دیوان تھا اسی کو اجمیر کا دیوان بھی مقرر کر دیا جائے اس کو زبردست اختیار دیے گئے تاکہ وہ راجہ کی دست درازیوں کو روک سکے۔ اجیت سنگھ کو نہر خاں سے ازلی نفرت تھی اس لیے وہ اس اقدام سے نہایت برانگیختہ ہوا اور اس وقت جبکہ وہ راجپوتوں کے درمیان ان کو دوست جان کر غیر انگیز ہوا فریب دے کر قتل کر دیا۔ (جنوری 6 ، 1723ء) 38

جب محمد شاہ کو یہ اطلاع ملی تو وہ بہت غضبناک ہوا اور شرف الدولہ کی کمان میں اس نے ایک فوج مقرر کی کہ وہ پرُفریب اجیت سنگھ کو اس کے چوہے کے بل سے بھی نکال کر لائے۔"

جے سنگھ اگر دھر بہادر اور بہت سے دوسرے سرداروں کو جنھوں نے جاٹ مہم کو مکمل کیا تھا ان کی مدد کرنے کو کہا گیا 39 اسی اثنا میں حیدر قلی خاں جو نظام الملک کی آمد پر گجرات سے بھاگ آیا تھا دہلی کے نزدیک پہنچا۔ قمرالدین کے مشورہ پر اس کو معاف کر دیا گیا اور اسے اجمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

حیدر قلی بڑی پامردی سے روانہ ہوا وہ سانبھر کے راستہ سے جودھپور کی طرف بڑھا۔ 8 جون 1723ء کو وہ اجمیر پہنچا نئے صوبے دار نے گڑھ پاتلی کا محاصرہ کر لیا۔ ڈیڑھ ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۴۰

اب اجیت سنگھ نے صلح کر لینے ہی کو مصلحت جانا۔ اس نے شاہی سپہ سالار کے پاس ابھے سنگھ کو متعدد ہاتھی اور تحفے تحائف لے کر بھیجا۔ دربار میں خان دوراں راجپوتوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھائے رکھنے کو تیار رہتا ہی تھا۔ چنانچہ اجیت سنگھ کو معاف کر دیا گیا اور اس کو اس کے منصب پر بحال کر دیا گیا۔ انفرادی طور پر بذات خود دربار میں حاضر ہونے سے اس کی معذرت کو بھی قبول کر لیا گیا۔ ۴۱ اجیت سنگھ کا لڑکا، ابھے سنگھ، اپنے باپ کی جگہ دربار میں حاضر ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد 7 جنوری 1724ء کو جودھپور میں اپنے کسی بیٹے کے ہاتھوں یا زہر دیے جانے سے اجیت سنگھ کے انتقال کی خبر پہنچی۔ اب خان دوراں نے ابھے سنگھ کو راجائے راجیشور کا خطاب اور 7 ہزاری منصب دلوا دیا اور اس کو اپنے باپ کی گدی پر قابض ہونے کے لیے جودھپور جانے کی اجازت مل گئی۔ ۴۲

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیدوں کے زوال سے جودھپور کے خاندان کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی تھی جو ان کے زمانے میں تھی۔ لیکن اس سے راجپوتوں کی طاقت اور ان کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جے سنگھ کو پہلے آگرہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور اس کے بعد مالوہ کا۔ وہ بخشی خاص خان دوراں کا بہت قریبی دوست تھا۔ اور مغل دربار میں دس سال سے زیادہ عرصہ تک اس کا بہت زبردست اثر رہا۔ خان دوراں نے ابھے سنگھ کو بھی اپنی طرف مائل کرنا چاہا کیونکہ ابھے سنگھ راجپوتانہ کا بڑا مقتدر آدمی تھا۔ اس طرح مغل دربار میں راجپوت ایک اہم فرض ادا کرتے رہے۔

دربار سے نظام الملک کی روانگی کا وقت مغل دور حکومت میں ایک دور کے ختم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اس عرصہ میں متعدد حوصلہ مند امرا نے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے کر حکومت کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا اور انتظامیہ کے محکموں میں انھوں نے بہت سی اصلاحات بھی کیں۔ نظام الملک کی علیحدگی نے ثابت

کر دیا تھا کہ آئندہ سے حوصلہ مند اور با اثر امرا اپنے اثرات کو اپنے لیے علیحدہ علاقے حاصل کرنے پر صرف کریں گے۔

بظاہر اس سے قبل کا زمانہ وزیروں کے اپنے اثرات کو مضبوط و منضبط کرنے اس عمل کے راستہ میں حائل ہونے والے با اثر افراد اور امرا کی جماعتوں اور حاکم اعلیٰ یعنی بادشاہ سے تصادم مول لینے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کشمکش کی تہ میں ایک اور کشمکش تھی۔ ایک کشمکش ان لوگوں کے درمیان جو اکبر کی وسیع النظری اور قومی اتحاد کی حکمت عملی کا احیاء اور اس کی ترقی چاہتے تھے اور دوسرے وہ لوگ جو اورنگ زیب کے نام سے وابستہ علیحدگی اور مذہبی تفریق کی پالیسی کو اپنانے چاہتے تھے۔

ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی سیدھا سادہ سا تعلق نہیں ہے۔ ذوالفقار خاں اور سید برادران نے ہندو جذبات کو مطمئن کر کے اپنا استحکام واقتدار چاہا اور اس کے لیے انھوں نے راجپوتوں اور مرہٹوں کو خصوصی طور پر اپنی طرف لانا چاہا۔ یہ فرض کر لینا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ امرا ہمیشہ خود غرضی ہی سے کام لیتے تھے یا یہ کہ یہ لوگ جان بوجھ کر حکومت کے مفاد کے خلاف اپنی خود غرضی کی بناء پر ایک خاص قسم کی پالیسی کو اپناتے تھے۔ ان کو اس ایک سمت میں لے جانے والی طاقت خود غرضی کے ساتھ ساتھ اپنے اصولوں پر یقین بھی تھا کہ وہ صحیح راستہ پر عمل پیرا تھے۔

سید برادران سے اپنے تصادم میں نظام الملک اور محمد امین خاں نے عالمگیری امرا کو مذہب و ملت کے جذبات کا واسطہ دے کر اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے پر انھیں اسی سبب سے سید برادران کی بہت سی وسیع النظری اور حیلے جوئی کی پالیسیوں کے خلاف عمل کرنا پڑا چنانچہ جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنے کی کوشش کی گئی اور راجیت سنگھ کی سرکوبی کے لیے مہم بھیجی گئی۔ اس کا مقصد کچھ یہ بھی تھا کہ راجپوتوں کو ان کے مناسب مقام پر ہی ٹھہرے رہنے کا اشارہ دیا جائے۔ لیکن یہ محدود مقاصد بھی حاصل نہ ہو سکے کیونکہ وہ جماعتیں جو راجپوتوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کو اور شرع کے

احکامات نافذ کرنے کو کہتی تھیں وہ کمزور پڑ چکی تھیں۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ عبداللہ خاں جو کہ تورانی جماعت کا ستون اور متعصب جماعت کا سربراہ کہا جاتا تھا اس نے بھی نظام الملک کی جزیہ نافذ کرنے کی تجویز کی مخالفت کی۔

پچھلے ابواب کے بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے نام سے وابستہ پالیسی کو اس کی وفات کے بعد کے چند ہی سالوں میں ترک کر دیا گیا۔ بعد میں اس پالیسی کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی خود مغل دربار میں تقویت حاصل نہ کر سکی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں وسیع النظری کی طاقتیں جتنا بادی النظری معلوم ہوتی ہیں اس سے زیادہ قوی اور با اثر تھیں اور ہندوستانی معاشرہ میں ایک مختصر سے زمانے کے لیے بھی اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی مکمل کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اٹھارہویں صدی کے اوائل ہی میں مذہبی عصبیت کا مغل دربار میں شکست کھا جانا بڑے دوررس نتائج رکھتا ہے۔ اس سے مغل دربار میں مشترک تہذیب کے بانیوں میں سے مانا جانے لگا جس میں ملک کے مختلف عناصر کے اثرات کا امتزاج کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا تمدن تھا جس کی نشوونما میں، ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔ مغل دربار کی تمدنی حیثیت میں بہت اضافہ ہوا اگرچہ اس کی سیاسی حیثیت میں زبردست زوال آیا۔ اب تمدنی عمل کے دو نشانات تسلیم کیے گئے ایک اردو زبان اور ایک شہنشاہ محمد شاہ۔ ولی کے وقت سے دکنی اردو مغل دربار میں اپنی بہترین شکل میں نمودار ہوئی اور یہ گویا ہندو اور مسلمانوں کا ایک نشان اشتراک بن گئی تھی۔ محمد شاہ نے فنون لطیفہ خصوصاً سنگیت کو بہت ترقی دی۔ اب پورے مہذب معاشرے کے لیے دربار گویا تہذیب و تمدن کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی بن چکا تھا۔

یہ عوامل سیاست پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکے شمالی ہندوستان کے اعلیٰ طبقہ کے ہندو اور مسلمانوں میں اس کی وجہ سے نہایت پُرخلوص تعلقات ہو گئے۔ اس سے مرہٹوں اور مغل حکومت کے درمیان جو پرانے زمانہ سے تنازعہ چلا آ رہا تھا وہ فرقہ وارانہ شکل اختیار نہ کر سکا۔

باب ہفتم

حاشیے

1 بحوالہ خفی خاں۔ 911 ، 938 ، شیو داس 133 ، کام ور 444 ۔

2 بحوالہ وارد (نسخہ حیدرآباد) صفحہ 399 خفی خاں 940

3 بحوالہ اقبال 130

4 بحوالہ اقبال 131 خفی خاں 936 ، کام ور (اندراج مورخہ 24 دسمبر 1720ء)
شیو داس نے جے سنگھ اور گردھر سنگھ کی عرضی کی نقل دی ہے (نسخہ پٹنہ 40 39 33)
اقبال مزید لکھتا ہے کہ "شرح کا لحاظ کرتے ہوئے جے سنگھ نے اپنی جاگیروں اور زمینداروں
بیشتر محال جزیہ کے بجائے دے دیے تھے" مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے مصنف ہذا کا
مقالہ "اورنگ کے عہد کے بعد جزیہ" انڈین ہسٹری کانگریس روداد 1946ء
صفحات 27 - 20

5 بحوالہ ڈفرن جلد اصفحہ 473 ، مظفر 307 ، ریاست 160

6 بحوالہ ایس.پی.ڈی. نمبر 30 صفحہ 266 . بظاہر نمبر 10 صفحہ 5 میں اسی ملاقات کا حوالہ دیا
گیا ہے. تفصیلات موجود نہیں. نظام الملک نے پہلے ہی شاہو سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ حسین علی
کی رعایات کو تسلیم کرے گا اور 3 ، دسمبر 1720ء کو اس نے خود اپنے دستخطوں سے ان
رعایتوں سے متعلق اسناد جاری کیں. اس نے متعدد ان تھانوں کو واپس ملنے کے احکامات
جاری کئے جن کا وہ دعوے دار تھا (مزید ملاحظہ ہو روداد انڈین ہسٹری ریکارڈس کمیشن
روداد نمبر 27 صفحات 10-209 -

7 بحوالہ مرآۃ جلد اصفحہ 37 . حیدر قلی کے نائب، مہر علی خاں کو خوف تھا کہ اجیت کو بحال کر دیا
جائے گا وہ کھمبایات سے ایک فوج کے ہمراہ آیا اور اس نے اجیت سنگھ کے نائب مہر خاں کو
معزول کر دیا اور اس کے دیوان انوپ سنگھ کو بھی. اجیت کو باقاعدہ طور پر رجب 1133ء
مطابق مئی 1720ء تک یعنی محمد امین خاں کی وفات تک اس کے عہدے سے برطرف
نہیں کیا گیا۔

8 خانِ ساماں، سعد الدین خاں کے ایک خط میں، نظام الملک نے تحریر کیا، ہمارے اور

اعتماد الدولہ (محمد امین خان) کے درمیان معاہدہ کی رو سے بہتر تو یہ تھا کہ موخر الذکر وزارت کا مدعی نہ ہوتا تھا اس معاہدہ کو پس پشت ڈالدینا ہمارے لیے قابل نفرین تھا لیکن اعتماد الدولہ سے رشتہ داری کی صورت میں ہم نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور اس کو برداشت کیا" (بحوالہ آصف خاں صفحہ 40 - 139)

9 بحوالہ ایس پی ڈی نمبر 14 صفحہ 47 رستم علی نے اس کا نام لاپرواہی کی پناہ گاہ رکھا تھا۔ (تاریخ ہندی صفحہ 535)۔

10 بحوالہ مراۃ جلد 5 - 4، معاصر الامراء جلد 3 صفحہ 746 اس زمانے میں عبدالغفور دنیا کا رئیس ترین مجلاز مشہور تھا۔ یہ عبداللہ خاں کی سیرت کے لیے قابل تحسین امر ہے کہ اس نے بغیر اپنے لیے ایک پیسہ بھی قبول کیے ہوئے، عبدالغفور کی جائداد اس کے بیٹے کو پوری کی پوری لوٹادی۔

10 الف بحوالہ خفی خاں 940 - وارد 43۔ معاصر الامراء جلد 3 صفحہ 746

11 بحوالہ شیوداس 154، وارد 43، خفی خاں 940

12 بحوالہ وارد 8-7 مراۃ جلد 2 صفحہ 47 - 45، خفی خاں، 94، 946، شیوداس 143، شاکر 16

13 خفی خاں 947 ستمبر 1722ء میں گردھر نے نظام الملک کی جانشینی کی (کام ور)

14 خفی خاں 962، 963 - حدیقتہ 136 - ریاست 163

15 بحوالہ ایس پی ڈی - جلد 30 نمبر 310، 22 جلد نمبر 4 - خفی خاں 946 راجوارے 2 صفحہ 48

17 کام ور صرف یہ تحریر کرتا ہے کہ 25 مئی 1723ء کو سرونج کے مقام پر نظام الملک نے عظیم اللہ خاں کو مالوہ کا نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ خفی خاں اس سلسلے میں خاموش ہے۔

18 بحوالہ خفی خاں 946، مراۃ جلد 2 صفحہ 48

19 بحوالہ خفی خاں 947، وارد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ 9-8 سیر 158

20 اوپر کے حوالے دیکھئے۔ خفی خاں کہتا ہے کہ نظام الملک محمد حسین افغان کے ذریعہ اصفہان سے نکالے ہوئے صفوی حکمران کو بحال کرنے کے لیے مہم آغاز کرنے کی فکر میں تھا۔ اردن (جلد 3 صفحہ 132) ٹھیک کہتا ہے کہ ایسی تجویز نظام کی جیسی محتاط طبیعت کے خلاف معلوم ہوتی

ہے. شاید اس قسم کی کوئی مبہم ہی گفتگو ہوئی ہوگی. اصفہان کا 21 اکتوبر 1722 کو زوال ہوا دلی میں یہ خبر 10 مارچ 1723 کو پہنچی. نظام الملک گجرات کے لیے دسمبر 1722 میں روانہ ہوگیا اور جولائی 1723 کو واپس ہوا. دربار میں اس کی صورت حال پہلے ہی سے کچھ مشکوک تھی اس لیے اس بات کا یقین نہیں آتا کہ اس نے سنجیدگی سے اس تجویز پر سوچا ہوگا۔

21 وارد۔ 643 شیوداس 153،150 خفی خاں 940

22 وارد۔ 40 (او۔پی۔ال کا نسخہ) اور خفی خاں 949

23 دیکھئے معاصر الامرا، جلد 3 صفحات 36 - 735

24 بحوالہ خفی خاں 949 دکام ور 267

25 جے پور ریکارڈس (متفرقات جلد ا صفحہ 75) وارد جلد ا صفحہ 12

26 ایس.پی.ڈی. جلد 10 نمبر 1 و دیکھئے کا مضمہ باجی راؤ صفحہ 13

28 بحوالہ شیوداس واردن جلد 2 صفحات 21 120

29 بحوالہ کاغذات واقعہ افواج مہاراجہ

30 بحوالہ اخبارات۔ اروِن (جلد 2 123) ٹھٹن کے زوال کی تاریخ 18 نومبر لکھتا ہے

31 دیکھئے اصل کتاب کا صفحہ 127 جو اس سے قبل ہے

32 بحوالہ بال مکند نامہ 29 ، 5 - 33 یہ واقعہ رجب 1233ھ مطابق مئی 1721 کا ہے صاحب مراۃ کے مطابق ایک افواہ یہ تھی کہ اجیت سنگھ کو اجمیر کا صوبہ دار رہتے دیا جائے گا۔

33 بحوالہ سیر صفحہ 453 تاریخ مظفری 317 خفی 938 (منذبذب) مراۃ جلد 2 صفحہ 38 - 37 اقبال صفحہ 375

35 36۔ انھیں حوالوں کو دیکھئے۔

36 بحوالہ خفی خاں صفحہ 938 سیر 54 - 453 ایلیٹ کہتا ہے (بحوالہ جلد 7 صفحہ 517.) کہ نظام الملک نے اجیت سنگھ کو سخت سرزنش لکھی. لیکن یہ خفی خاں کے مندرجہ الفاظ کا ایک غلط ترجمہ معلوم ہوتا ہے. "دریں زمانہ اخبار آمدن نظام الملک نے اس بات پر اظہار ملال کیا کہ اجیت سنگھ کی بغاوت سے اس قدر چشم پوشی کی گئی. (بحوالہ تاریخ ہندی)

38 مراۃ جلد 2 صفحہ 38

39 جے پور ریکارڈس کے خطوط

40 بحوالہ کاموربھارت منڈل کا نسخہ صفحات 66 - 264 ، تاریخ ہندی 497 وارون
جلد 2 صفحہ 114

41 اوپر کا حوالہ ملاحظہ ہو۔

42 بحوالہ تاریخ مظفری 337

باب ہشتم

مرہٹوں کی شمالی ہند کی طرف پیش قدمی

مرہٹوں کی توسیع پسندی کی پالیسی

اٹھارہویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں راجپوتوں اور مرہٹو ں کے اندرونی و بیرونی حالات میں اہم تبدیلیاں ہوئیں اس زمانے میں راجپوت و مرہٹہ دونوں ہی طاقتوں کی ترقی ہوئی اور مغلوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں کافی تبدیلی آئی۔ساتھ ہی دونوں میں اندرونی کشمکش رہی جس کا اثر اس دور کی سیاست پر پڑا۔ دونوں کی اندرونی تنظیم میں بھی تبدیلی آئی۔

بہادر شاہ کے دورِ حکومت کے اواخر میں راجپوتوں اور مغلوں کے تعلقات پر تبصرہ ہم ایک گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جہاندار شاہ و فرخ سیر کے ذریعے راجپوت راجاؤں کو دی گئی مراعات اعلیٰ عہدوں اور منصبوں وغیرہ کا بھی ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ان رعایتوں کی وجہ سے اورنگ زیب کے زمانے سے چلی آرہی راجپوتوں کی مصلح جد وجہد اور مغلوں کی طرف سے بے چینی عام طور سے ختم ہو جاتی ہے۔ نئے دور میں راجپوت راجاؤں کے مطالبات کی شکل پہلے سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اب راجپوت راجاؤں کی اپنی اپنی اعلیٰ خواہشات زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ان کا اثر ایک جانب ان کے اندرونی مسائل پر پڑتا ہے اور دوسری جانب مغلوں اور مرہٹوں کے ساتھ ان کے تعلقات پر پڑتا ہے۔عزت و احترام ذرائع اور جنگی طاقت سبھی کے نقطۂ نظر سے میواڑ ریاست راجپوتانہ میں سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی تھی۔پور ا منڈل وغیرہ پرگنوں کی ملکیت کے سوال کو لے کر اور ڈونگر پور بانسواڑہ وغیرہ ریاستوں کی وراثت کے معاملے پر 1712ء تک میواڑ اور مغل بادشاہ کی کش مکش بیان کی جا چکی ہے۔ 1710ء میں مہارانہ امر سنگھ کی موت کے بعد پور منڈل وغیرہ کو مہارانہ سے لے کر رنباس خاں میواتی اور اندر سنگھ کو دینے کی ناکام کوشش کی گئی مہارانا کے ساتھ جنگ میں رنباس خاں کا انتقال ہونے سے ناراض ہو کر بہادر شاہ نے سنگرام

سنگھ ثانی کو ٹیکہ نہیں دیا۔ فرخ سیر کے تخت نشین ہونے پر سیدوں کے کہنے سے مہاراناؔ کو 7000 / 7000 کا منصب اور آٹھ کروڑ دام انعام میں عطا کیے گئے۔ اسی وقت پور، منڈل وغیرہ پھر سے اسے جاگیر میں دئے گئے اور مہارانا کے ڈونگرپور بانسواڑہ وغیرہ سے پیش کش وصول کرنے کے حق کو بھی منظور کر لیا گیا۔

اس طرح مغلوں کے لیے مہارانا کے دل میں جو بے چینی تھی اس کی خاص وجوہات دور ہوگئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ مہارانا کی اولو العزمی بھی بڑھی۔ پڑوسی ریاستوں پر میواڑ کا تسلط قایم کرنے کی خواہش میواڑ کے راجاؤں میں بہت پرانی تھی۔ مالوہ کے کئی راج گھرانے بھی سسودیہ خاندان کے تھے۔ مالوہ کے شمال مغربی حصے میں کوٹہ اور دیولیا (پرتاپ گڈھ) ریاست کے درمیان قایم رامپورہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جس کے اوپر سسودیوں کی چندراوت کھانپ کی حکومت تھی۔ یہ ریاست مالوہ و میواڑ کے درمیان ایک کڑی یا ڈھال کی شکل میں تھی۔ اکبر سے پہلے رامپور امیواڑ ریاست کا حصہ تھا لیکن اکبر نے وہاں کے حاکم کو خود مختار حاکم بنا دیا تھا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت میں رامپورہ کے گوپال سنگھ اور اس کے بیٹے رتن سنگھ کے جھگڑے کی وجہ سے رتن سنگھ سلمان بن گیا تھا اور اسلام خاں کے نام سے رامپورہ اسے دے دیا گیا۔ گوپال سنگھ نے کوٹہ کے راجا رائے سنگھ ہاڑہ کے بیٹے بھیم سنگھ کی مدد سے رامپورہ پر اپنا قبضہ جمانے کی ناکام کوشش کی اس کے بعد گوپال سنگھ جگہ جگہ بھٹکتا رہا اور آخر میں اس نے مہارانا کی پناہ لی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ 17.08ء کے معاہدے سے اجیت سنگھ، جے سنگھ اور مہارانا نے گوپال سنگھ کو رامپورہ کی گدی پر بٹھانے کا فیصلہ کیا اس کے مطابق مہارانا نے گوپال سنگھ کے ہمراہ رامپورہ پر ایک فوج بھیجی لیکن گوپال سنگھ پھر ناکام رہا۔

17.08ء میں اودے پور میں تینوں مخصوص راجپوت راجاؤں کے معاہدے کا راجستھان کی تاریخ میں ایک خاص مقام ہے۔ لیکن اس اہمیت کا صحیح اندازہ مورخین نے نہیں کیا۔ حقیقت میں اس معاہدے کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو تھا راجاؤں کو مل کر اپنی اپنی ریاستوں کو مغلوں کے تسلط سے آزادی دلانا اور اپنی ریاست پر اپنا قبضہ جمانا۔ دوسرا پہلو راجستھان کی اندرونی سیاست سے متعلق تھا

اپنی بیٹی چندر کنور بائی کی شادی جے سنگھ کے ساتھ کر کے مہارانا اس کے ساتھ خصوصی تعلق قایم کرنا چاہتے تھے۔ جے سنگھ کے انتقال کے بعد اس شادی کا نتیجہ جے پور ریاست کے لیے خطرناک ثابت ہوا تو بھی اس معاہدے کا یہ مقصد نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رانا امر سنگھ کو راجستھان میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لیے اور اپنی دوسری اہم خواہشات کو پوری کرنے کے لیے کسی دوست کی ضرورت تھی۔ کئی وجوہات کی بنا پر وہ اجیت سنگھ کو اپنا دوست نہیں بنا سکتے تھے۔ میواڑ اور مارواڑ ریاستوں میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے اور حسد کا جذبہ روایتی تھا خاص طور سے دونوں ریاستیں گوڑوار کے پرگنے پر اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھیں۔ فوجی و مالی نقطۂ نظر سے یہ پرگنہ دونوں کے لیے اہم تھا جسونت سنگھ کے دور میں یہ پرگنہ اس کی جاگیر میں تھا جسونت سنگھ کی موت کے بعد یہ پرگنہ خالصہ ہوگیا۔ حالانکہ رانا راج سنگھ نے اجیت سنگھ کا پورا ساتھ دیا۔ خفیہ طریقے سے درگا داس نے بہادر شاہ کے ساتھ گوڑوار کا پرگنہ اجیت سنگھ کو دینے کی بات شروع کردی اس سے گوڑوار کے بارے میں کش مکش پھر شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان دونوں ریاستوں کی دشمنی بڑھنے کی وجہ خود درگا داس بن گیا۔ اجیت سنگھ کے ساتھ جھگڑے میں درگا داس کو مہارانا کی پشت پناہی حاصل تھی 1708ء کی راجپوت جنگ میں درگا داس نے سارے کام اجیت سنگھ کے حکم سے نہیں رانا کی ایما سے کیے درگا داس اور رانا کے حاصل ہونے والے خط و کتابت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ جے سنگھ اور اجیت سنگھ میں بھی کشیدگی بڑھتی گئی اور جے سنگھ اور رانا کی دوستی مضبوط ہوتی گئی۔ 1713ء میں مارواڑ کی جنگ کے وقت جے سنگھ نے اجیت سنگھ کے خلاف حسین علی کا ساتھ دیا۔ رانا نے بھی ایک فوج بھیج کر حسین علی کی ہی حمایت کی۔ اس طرح اجیت سنگھ اکیلا رہ گیا۔ آخر فرخ سیر کے دور حکومت میں رامپورہ پر بھی رانا سنگرام سنگھ کا تسلط قایم ہوگیا اس کا پس منظر یہ تھا کہ 1712ء میں رتن سنگھ مالوہ کے صوبہ دار امانت خاں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا مارا گیا گوپال سنگھ نے مہاراجہ کی مدد سے رامپورہ پر اپنا

قبضہ جمالیا لیکن مہارانا نے گوپال سنگھ کو ریاست کا ایک چھوٹا حصہ ہی دیا اور زیادہ تر حصہ میواڑ ریاست میں ملالیا۔ راٹھور درگا داس جو کچھ وقت قبل اجیت سنگھ کو چھوڑکر مہارانہ کی خدمت میں چلاگیا تھا رامپورہ کا حاکم بنا دیا گیا۔ 1717ء میں سید برادران کے توسل سے مہارانا نے فرخ سیر سے رامپورہ کی زمینداری اپنے نام لکھا لی۔ کچھ کشمکش کے بعد گوپال سنگھ نے رانا کا دست نگر ہونا قبول کرلیا۔ اور اس کے بدلے رانا نے اسے رامپورہ کا تقریباً نصف حصہ جاگیر میں دے دیا۔ لیکن ساتھ ہی گوپال سنگھ کو میواڑ ریاست کی خدمت گزاری میں یہ وعدہ کرتا پڑا کہ وہ مہارا کا حکم مانے گا اور دوسرے ٹھاکروں کی طرح ان کے دربار میں تہواروں وغیرہ پر حاضر ہوگا۔

اس طرح میواڑ ریاست کی طاقت اور حدود دونوں میں ترقی ہوئی جے سنگھ کی دوستی کی وجہ سے ہی رفتہ رفتہ رانا سنگرام سنگھ نے سید برادران سے منہ موڑلیا جیساکہ اس سے قبل بتایا جاچکا ہے۔ سید برادران کے زوال کے بعد رانا اور جے سنگھ کی دوستی اور بھی مضبوط ہوگئی 26۔1725ء میں جے سنگھ کے اشارے سے ایڈر اور سروہی پر بھی مہارانا کا قبضہ ہوگیا دونوں پرگنوں پر بھی کسی زمانے میں میواڑ کا تسلط تھا لیکن اکبر کے دور حکومت سے قبل یہ پرگنے میواڑ سے الگ ہوگئے تھے اس طرح رانا سانگا کے بعد سنگرام سنگھ ثانی کے دور حکومت میں میواڑ ریاست کا عروج انتہا کو پہنچ گیا۔

رانا اور جے سنگھ کی دوستی کا اثر راجستھان کی بیرونی واندرونی سیاست پر پڑا۔ مغل دربار کی جانب سے میر بخشی خان دوراں نے ان دونوں راجاؤں کے ساتھ خصوصی دوستانہ تعلقات قایم کرنے کی کوشش کی۔ راجپوتوں کی جانب بھی ان دونوں راجاؤں کی پالیسی میں بڑا تال میل رہا۔ لیکن ان راجاؤں کی دوستی کے لیے مصیبت تب آن پڑی جب 1726ء میں جے سنگھ کا رانا کی بیٹی چندر کنور سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس سے قبل دوسری رانیوں سے جے سنگھ کے دو بیٹے پیدا ہوچکے تھے۔ 1708ء کے معاہدے کے مطابق رانا اس بات کے لیے بضد ہوسکتا تھا کہ گدی کا وارث رانا کے نواسے مادھو سنگھ کو بنایا جائے۔ ممکنہ خانہ جنگی

کے ماننے کے لیے جے سنگھ نے رانا سے یہ درخواست کی کہ وہ 1709ء کی صلح پر عمل نہ کریں اور رامپورہ کی ریاست مادھو سنگھ کو دے دیں یہ دونوں تجاویز مہارانا کے لیے قبول کرنا آسان نہیں تھا لیکن جے سنگھ کی دوستی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور راجستھان میں امن بنائے رکھنے کے مقصد سے آخر 1722 میں سنگرام سنگھ نے ان تجاویز کو قبول کر لیا مادھو سنگھ کو رامپورہ کی ریاست دے کر اس کا رانا کے سردار کی حیثیت سے اعلان کر دیا گیا اور جے پور کی گدی پر جے سنگھ کے بڑے بیٹے ایشوری سنگھ کا حق تسلیم کر لیا گیا مہارانا کے اس دور اندیشانہ فیصلے کا یہ اثر ہوا کہ بنیادی طور سے 1742ء تک راجستھان خانہ جنگی سے بچا رہا اور مرہٹوں کو راجستھان میں مداخلت کرنے کا بہت کم موقع ملا مادھو سنگھ کے بارے میں پالیسی بدلنے کی ذمہ داری خاص طور سے سنگرام سنگھ کے وارث رانا جگت سنگھ ثانی پر ہے اور کسی حد تک ایشوری سنگھ پر۔

میواڑ ریاست کی طرح اس زمانے میں امیر ریاست کی سرحدوں اور طاقت میں بھی بہت ترقی ہوئی کچھواہا راجاؤں کے پاس ایک یا دو پرگنوں سے زیادہ اپنی ریاست میں کبھی نہیں رہے کچھواہا راجاؤں کو شاہی منصبوں کی بنیاد پر راجستھان میں یا اس کے باہر بڑی بڑی جاگیریں ملا کرتی تھیں۔ جے سنگھ نے اپنی ریاست کی سرحدوں کو بڑھانے کے لیے امیر کے پاس کے بہت سے پرگنوں کو بادشاہ سے اجارہ استمرار پر لے لیا رفتہ رفتہ یہ سب پرگنے جے پور ریاست کے حصے بن گئے۔ اس طرح پرگنے امرسر، ٹارنا، لالسور وغیرہ جو اس زمانے میں اجارہ استمرار میں لیے گئے بعد میں جے پور ریاست کے حصے بن گئے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اپنی سرحد پر جاٹوں کی قوت کا بڑھنا امیر کے راجاؤں کو پسند نہیں تھا ساتھ ہی آگرہ و مین پوری کے قریبی علاقوں پر وہ اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے لیکن 1717ء میں سید عبداللہ خاں کی خفیہ مخالفت کی وجہ سے جے سنگھ چوڑامن جاٹ کو ہرانے میں ناکام رہا تھا۔ سید برادران اور بادشاہ محمد شاہ کی کشمکش کے وقت چوڑامن نے دونوں جماعتوں کو لوٹا تھا اس نے بہت سے شاہی علاقے دبا لیے تھے 1720ء میں اس کے بیٹے محکم سنگھ نے آگرے

کے نائب صوبے دار نیل کنٹھ ناگر کو جنگ میں مار ڈالا تھا اس لیے اپریل 22 17ء میں خانِ دوران کی گزارش پر جاٹوں کے خلاف مہم کی قیادت جے سنگھ کو سونپی گئی۔ لڑائی میں کوئی . . . رکاوٹ نہ پڑے اس لیے جے سنگھ نے آگرہ صوبے کی صوبے داری کا مطالبہ کیا۔ ستمبر 1722 میں جے سنگھ کو آگرے کا صوبے دار مقرر کیا گیا اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی جے سنگھ نے جاٹوں کے خلاف مہم کے لیے کوچ کیا۔

جے سنگھ نے راجا گردھر بہادر ناگر، اورچھا کے راجا مہاراجا اجیت سنگھ، گج سنگھ نروری اور مظفر خاں کے ساتھ پندرہ سولہ ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر کوچ کرکے تھون کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اپنے پچھلے تجربے سے فائدہ اٹھا کر جے سنگھ نے تھون کے آس پاس کے جنگلوں کو کٹوا ڈالا تاکہ جاٹوں کو ان میں چھپنے کا موقع نہ ملے جے سنگھ کی مہم سے قبل ہی چوڑامن جاٹ کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا محکم سنگھ اس وقت جاٹوں کی قیادت کر رہا تھا خاندانی جھگڑے کی بنا پر اس کا چچازاد بھائی بدن سنگھ اس سے پہلے ہی مغلوں سے جا کر مل گیا تھا۔ وہ تھون قلعے کی سبھی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اسی کے اشارے پر جے سنگھ تقریباً ایک ماہ کی جدوجہد کے بعد ہی تھون جیسے طاقتور قلعے کو فتح . . . . کرنے میں کامیاب ہوا۔ اپنی شکست کو قریب دیکھ کر ایک رات محکم سنگھ نے اپنی بارود میں آگ لگا دی اور اپنے ہیرے جواہرات وغیرہ کے ساتھ چپ چاپ بھاگ گیا۔ 15 نومبر کو جے سنگھ قلعے میں داخل ہوا جاٹوں کی طاقت کم کرنے کے لیے اس نے تھون کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس زمین پر گدھوں سے ہل چلوا دیا۔ جاٹوں کی شکست کی خاص وجہ ان کی آپسی ناچاقی اور محکم سنگھ کی بے عملی سمجھنی چاہیئے سیاسی حالات بھی جے سنگھ کے حق میں تھے۔

اس فتح سے مغل بادشاہ بہت خوش ہوا اور جے سنگھ کا احترام بہت بڑھ گیا۔ دربار میں لوٹنے کے بعد اسے "راجائے راجیشور" کے خطاب سے نوازا گیا۔ جاٹوں کے اوپر اس کا تسلط رکھنے کی نیت سے جاٹوں کا علاقہ جے سنگھ کو جاگیر میں دے دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تمام علاقہ امیر ریاست کا حصہ بن

گیا۔ جے سنگھ اور بدن سنگھ جاٹ کے تعلقات کے بارے میں مورخین کے بہت سے مبالغہ آمیز خیالات ہیں۔حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جے سنگھ کی گزارش پر بدن سنگھ کو چوڑامن جاٹ کی جگہ پر جاٹ علاقے کی زمینداری دے دی گئی۔ ایک دستاویز سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بدن سنگھ نے جے سنگھ کو اس زمینداری کے لیے 83000 ہزار روپیہ پیش کش میں دینا قبول کر لیا تھا۔ کسی جاگیر دار کو کسی بڑے زمیندار کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کا مطلب محض اتنا تھا کہ جاٹ علاقوں میں گاؤں در گاؤں مال گذاری طے کرنے کی ذمہ داری جے سنگھ یا شاہی افسروں پر نہیں ہوگی۔ کسی خودمختار زمیندار کی طرح بدن سنگھ اس علاقے کی مالگذاری کے عوض میں طے شدہ رقم وہاں کے جاگیر دار کو دیتا رہے گا۔ بدن سنگھ دسہرے کے موقعے پر جے سنگھ کے دربار میں جایا کرتا تھا اور جے سنگھ نے اسے ٹیکہ، نشان، نقارہ اور پنج رنگی پرچم وغیرہ دئے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بدن سنگھ جے سنگھ کے دیگر سرداروں کے برابر ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ جے سنگھ کی جانب احسان مندی ظاہر کرنے اور احترام دینے کی غرض سے ہی کیا گیا تھا۔ لیکن اس شک نہیں کہ بدن سنگھ کے کام امبیر ریاست کے بڑھتے ہوئے اثر کا ایک کھلا اعلان تھے اور اس کے بدلے میں جے سنگھ کو بہت سے شاہی علاقوں کو امبیر ریاست میں ملانے کا موقعہ ملا تھا۔

جے سنگھ نے اپنا حلقۂ اثر ہاڑوتی پر بھی بڑھانے کی کوشش کی بوندی و کوٹہ ریاست کے پرانے جھگڑوں کا تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں سیدوں کے تعاون سے کوٹے کے بھیم سنگھ نے بوندی پر بھی قبضہ جما لیا تھا بدھ سنگھ جے سنگھ کے پاس جودھپور چلا گیا تھا سیدوں کے زوال کے بعد بوندی پر پھر سے بدھ سنگھ کا قبضہ ہو گیا بوندی پر اپنا اثر قایم کرنے کی نیت سے جے سنگھ نے اپنے دودھ شریک بھائی ناگراج کو بدھ سنگھ کا دیوان بنا کر بھیج دیا۔ ریاست کا سارا انتظام ناگ راج کے ہاتھوں میں آگیا بدھ سنگھ کی رانی (اپنی بہن) کے احتجاج پر جے سنگھ نے ناگ راج کو بوندی سے واپس بلا لیا لیکن جے سنگھ بوندی کے معاملات میں مداخلت کرتا رہا کچھ دنوں بعد بدھ سنگھ کو حکومت کے لیے نااہل بتا کر جے سنگھ نے

بوندی پر حملہ کر دیا اور بدھ سنگھ کو ہٹا کر اس کے ایک جاگیر دار راتا سالم سنگھ کے بیٹے دلیل سنگھ کو اپنی حکمرانی میں بوندی کی گدّی دے دی۔

جے سنگھ کے حملہ کا نتیجہ اس کے یا بوندی کے لیے اچھا نہیں رہا کچھ مدت تک بوندی پر جے سنگھ کا اثر رہا لیکن اس کی بہن کچھواہی رانی نے اپنے بھائی سے انتقام لینے کا عہد کیا اس سے قبل کوٹہ کے راجہ دُرجن سنگھ کے خلاف اس کے بھائی شیام سنگھ کو جے سنگھ نے مدد دی تھی اس لیے دُرجن سنگھ نے کچھواہی رانی کی طرفداری اور حمایت کی بُدھ سنگھ نے رانا سنگرام سنگھ سے مدد مانگی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی جے سنگھ کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں ان حالات کا فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کو ہاڑوتی اور راجستھان میں داخل ہونے کا اچھا موقعہ مل گیا۔

آگرے کے علاقے اور ہاڑوتی کے علاوہ ایک دوسرے علاقہ مالوہ میں بھی جے سنگھ کی بڑی دلچسپی تھی۔ بہادر شاہ کے دور حکومت میں جے سنگھ نے مالوہ کی صوبہ داری کا بار بار مطالبہ کیا تھا آخر میں سید برادران کے ہاتھوں میں طاقت آ جانے کے بعد 1713ء میں جے سنگھ کو مالوہ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا جے سنگھ نے حکومت کا کام بڑی مستعدی سے کیا تھا اور 1715ء میں اس نے مرہٹوں کو بری طرح شکست دی تھی۔ اس کے بعد تقریباً دو سال تک مرہٹوں کو مالوہ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں فرخ سیر کے اصرار پر جے سنگھ کو مالوہ چھوڑ کر دلّی آنا پڑا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں مرہٹوں نے دوبارہ مالوہ پر حملے کرنے شروع کر دیے تھے۔ حالانکہ فرخ سیر نے جے سنگھ سے وعدہ کیا تھا کہ مالوہ کی حفاظت کے لیے وہ کسی بڑے امیر کی قیادت میں ایک بڑی فوج تعینات کرے گا اور وہ اس کے تعاون سے کام کرے گی لیکن 1717ء میں بغیر کسی اطلاع کے اس نے مالوہ محمد امین خاں کو سونپ دیا یہ بات جے سنگھ کو بہت ناگوار گزری۔

اکتوبر 1729ء میں جے سنگھ دوبارہ مالوہ کا صوبے دار مقرر کیا گیا اس سے قبل بھی وہ مالوہ کے معاملے میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس کے بارے میں مرہٹے اور مغل بادشاہ کے ساتھ خفیہ بات چیت کر رہا تھا اس کا پس منظر یہ تھا کہ نظام کے دلّی چھوڑ کر چلے جانے کے بعد نظام اور مغل بادشاہ دونوں نے اپنے آپ کو

مضبوط کرنے کے لیے مراٹھوں سے مدد مانگی حالانکہ شاہو نے اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا تھا الگ الگ سرداروں نے اس مسئلے پر دونوں فریقین سے بات چیت شروع کر دی۔ پیشوا باجی راؤ نے جیسا کہ کہا جا چکا ہے نظام کا ساتھ دیا بادشاہ نے کانوجی بھونسلے وغیرہ سرداروں کے ساتھ جے سنگھ کے توسل سے بات چیت شروع کی۔ کانوجی بھونسلے نے نظام کی فتح کے بعد لکھا۔ "بادشاہ کے فرمان کے مطابق اور اس بلند پکان راجا (جے سنگھ) کے خط کے مطابق مبارز کو دس ہزار سوار اور دیگر سامان جنگ دے دیا گیا تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ اس علاقے (مہاراشٹر) میں پہنچنے سے پہلے جنگ نہ کرے لیکن خان نے بات نہ مانی اور جلد بازی کی وجہ سے اپنی بھی جان گنوا دی۔"

نظام الملک اور مرہٹے

مغل بادشاہ اور اس کے وزیر اعظم نظام الملک دونوں کا مرہٹوں سے امداد مانگنے کا یہ واضح مطلب تھا کہ اب کسی امیر یا راجہ کا مرہٹوں سے بات چیت کرنا یا ان سے مدد مانگنا حکومت سے غداری نہیں رہی تھی۔ مغل بادشاہ کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ نظام الملک اور باجی راؤ کی دوستی سے تھا۔ 1725 کے بعد جے سنگھ کی مرہٹوں کے لیے پالیسی بدلنا اور مرہٹہ اور مغل بادشاہ کے ساتھ بات چیت کرنے کی کوشش اسی پس منظر میں جانچی جانی چاہیئے۔ ساتھ ہی مالوہ میں جے سنگھ کے اپنے بھی مفادات تھے۔ ہاڑوتی راجستھان اور مالوہ کے درمیان ایک کڑی تھی اور ایک طرح سے دکن سے آنے کا راستہ تھا۔ مشرقی راجستھان کے ساتھ ساتھ جے سنگھ ہاڑوتی پر بھی اپنا اثر جمانا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے مالوہ پر اس کا تسلط یا وہاں کے حاکم کے ساتھ سمجھوتہ ضروری تھا۔ 1725ء میں مرہٹے مالوہ کے ذریعے ہاڑوتی کی سرحد تک پہنچ چکے تھے۔ ساتھ ہی گجرات کے راستے سے انھوں نے میواڑ کے کچھ علاقوں پر قدم بڑھائے۔ مارواڑ میں ابھے سنگھ اور ان کے بھائیوں کی آپسی رنجش کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے

راجستھان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنی چاہیئے 1725ء میں ابھے سنگھ کے بھائیوں کی مدد کرنے کی غرض سے مرہٹوں نے کپڑ رپر حملہ کیا اور مہارانا کے قریبی علاقوں کو اجاڑ دیا۔ اگلے سال انھوں نے سیدھے جودھ پور پر دھاوا بول دیا۔

اسی سارے پس منظر میں جے سنگھ اور مہارانا نے مرہٹوں سے صلح کی بات چیت شروع کی 1725ء میں مہارانا نے اپنے وکیل جوشی رائے کو ساہو کے پاس بھیجا اس نے ساہو کی جانب سے یہ تجویز بھجوائی کہ ساہو کو شاہی افواج دی جائیں اور اسے 20 لاکھ کی جاگیر مالوہ و گجرات میں دی جائے ساتھ ہی اس کے چار خصوصی سرداروں کو شاہی منصب دیے جائیں۔

مرہٹوں کی حقیقی خواہش کے بارے میں رانا سنگرام سنگھ اور جے سنگھ کو شک تھا جے سنگھ کو لکھے گئے ایک خط میں مہارانا نے کہا تھا۔ "دکنی (مرہٹے) بڑے مطلبی ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔" انھوں نے یہ بھی لکھا "اپنی خوشحالی کے لیے (راجپوت) راجاؤں کو دکنیوں کے خلاف ایک ہونا چاہیئے۔" تو بھی، مرہٹوں کی اب دو ریاستیں ہیں اور پہلے کی طرح راجپوت ان پر فتح حاصل کرسکتے ہیں یہ ان کے وکیل نے لکھا یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر اس قسم کی صلح کی تجویز مغل بادشاہ مان لیتا تو اس کا مرہٹوں پر کیا اثر پڑتا اس وقت ساہو کی اندرونی حالت مضبوط نہیں تھی پیشوا باجی راؤ اور نمائندے میں طاقت کی کش مکش چل رہی تھی ایسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ ساہو مغل بادشاہ کے 20 لاکھ روپئے کے عوض حملہ آورانہ پالیسی چھوڑ دیتا یا شمالی ہندوستان کی بجائے دکن کی جانب دھیان دیتا۔ لیکن راجاؤں کی یہ تجویز مغل بادشاہ نے منظور نہیں کی۔

راجپوت راجاؤں کی مراٹھوں کے ساتھ صلح کی تجویز کی بنیاد دونوں فریقین کا ہندو ہونا نہیں تھا جے سنگھ کے وہ خط نعیں کہا جاتا ہے کہ اس نے مالوہ کے سردار نند لال منڈلوئی کو لکھے تھے اور جن میں اس نے یہ لکھا تھا کہ وہ ہندو ہونے کے ناطے مرہٹوں کی مخالفت نہیں کرے گا اب جعلی ثابت ہو چکے ہیں جے سنگھ اور مہارانا کی پالیسی مذہب سے نہیں بلکہ ان کے سیاسی مفادات اور حالات سے متاثر ہوئی تھی۔ 1729ء میں جے سنگھ دوبارہ مالوہ کا صوبے دار بنایا گیا۔ اس وقت اس نے اپنی پالیسی واضح کرتے ہوئے مغل بادشاہ کو یہ عرضی لکھی۔ "اس

گروہ کا واسطہ یعنی حملہ صوبہ مالوہ سے بڑی مدت سے چلا آرہا ہے الراس سال ایک بڑی فوج تیار کر کے ان کو صوبے میں داخل نہ ہونے دیا جائے یا داخلہ پانے کے بعد انھیں جنگ و جدل کے ذریعے پسپا کیا جائے۔" آپ جانتے ہیں، ہر سال اس طرح کتنا خرچ ہوگا اس لیے یہ امید ہے کہ راجہ ساہو کو جو خلد مکاں (اورنگ زیب) کے زمانے سے شاہی خدمت پر مامور ہے اس کے بیٹے کشن سنگھ کے نام سے دس لاکھ روپئے کی جاگیر اس شرط پر عطا کی جائے کہ وہ مالوہ میں جھگڑا کرنا بند کر دے اور وہاں کے صوبے دار کی مدد کے لیے ایک فوج رکھے اِس طرح بادشاہی ملک محفوظ رہے گا اور فوجی کارروائی کے خرچے سے چھٹکارہ ملے گا۔

جے سنگھ کی مرہٹہ پالیسی کسی حد تک نظام کی پالیسی سے ملتی جلتی تھی 1725ء میں نظام نے جے سنگھ کو لکھا تھا۔" اس سے قبل مرہٹوں کو ہرانے کے لیے بہت سے صوبے داروں کے تعاون و مدد کی ضرورت پڑتی تھی اورنگ زیب بادشاہ کے زمانے میں اور اس کے قبل کے بادشاہوں کے دور میں اس کام کے لیے بڑا بھاری خزانہ صرف کیا گیا اور بڑے بڑے راجاؤں کو تعینات کیا گیا لیکن اس وقت مرہٹے حکومت کے رگ و ریشے میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کی طاقت آسمان تک پہنچ گئی ہے۔"

اپنی وصیت میں نظام نے اپنے وارثین کو یہ صلاح دی۔" دکن کے حکمراں کو چاہیئے کہ وہ مرہٹوں کے ساتھ جو اس ملک کے زمیندار ہیں صلح و معاہدے سے کام لیں لیکن ساتھ ہی اسلام کی عزت و اقبال کو کم نہ ہونے دیں اور انھیں حد سے آگے نہ بڑھنے دیں۔

اس طرح نظام اور جے سنگھ دونوں کی پالیسی یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کریں اور ساتھ ہی ان کی طاقت کو حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیں حالات کو دیکھتے ہوئے کسی دوسری پالیسی کو اپنانا مشکل تھا۔

جے سنگھ کی صلح کن پالیسی حالانکہ محمد شاہ نے 1728ء میں مان لی تھی لیکن اس کے فوراً بعد اس نے جے سنگھ کو مالوہ سے معزول کر دیا اس طرح جے سنگھ کی پالیسی کو عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جب تک مہارانا سنگرام سنگھ زندہ رہے انھوں نے جے سنگھ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے اور جے سنگھ کی پالیسیوں کی حمایت کی۔ 32--ء میں

جب جے سنگھ تیسری بار مالوہ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تو اس نے مہارانا کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ 24، 25 ہزار سوار جے سنگھ کے ساتھ مرہٹوں کا سامنا کرنے کے لیے مالوہ بھیجے گا اور مالوہ کی آمدنی جس میں منصب داروں کی جاگیروں کا اجارہ اور زمینداروں کی پیش کش شامل ہے۔ 2:1 میں مہارانا اور جے سنگھ کے بیچ بانٹی جائے گی اس طرح مہارانا اور جے سنگھ کی دوستی اور تعاون اس زمانے کی سیاست اور راجستھان کے لیے اہم تھے۔

مالوہ اور گجرات پر مرہٹوں کی پیش قدمی

حالانکہ 1720ء کے بعد بھی میواڑ و امیر جے پور ریاست کی حدود اور طاقت میں ترقی ہوئی تو بھی سید برادران کے زوال کی وجہ سے جودھپور ریاست کی طاقت وعزت کو دھکا لگا۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ سید برادران نے اجیت سنگھ کو اجمیر و گجرات کا صوبے دار مقرر کیا تھا لیکن ان کے بار بار اصرار کرنے پر بھی اجیت سنگھ جودھپور میں بیٹھا رہا اور اپنے صوبے کے انتظام کے لیے کوئی خاص اقدامات نہیں کیے۔ اس نے گجرات اور راجستھان کے کچھ علاقوں کو اپنی ریاست میں ملا لیا تھا۔

عبداللہ خاں کی شکست کے بعد بادشاہ محمد شاہ نے حیدر قلی خاں کو گجرات کا اور بخشی الملک خان دوراں کے چھوٹے بھائی مظفر خان کو اجمیر کا صوبے دار مقرر کیا یہ سن کر اجیت سنگھ 30 ہزار فوج کے ہمراہ جودھپور سے اجمیر آیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے شہر کے سب معزز لوگوں کو جمع کر کے محمد شاہ کے والد جہاں شاہ کا ایک فرمان پڑھ کر سنایا جس میں اجیت سنگھ کو گجرات و اجمیر کی صوبے داری مستقلاً عطا کی گئی تھی اجیت سنگھ نے گوکشی کا حکم دیا ساتھ ہی ساتھ اس نے اسلامی روایات میں کوئی روک ٹوک نہ کرنے کا یقین دلایا۔ بادشاہ کو اس نے اس مطلب کی عرضی بھی بھیجی کہ اسے گجرات یا اجمیر ایک صوبے کا حاکم رہنے دیا جائے۔

اس وقت تک مغل دربار میں اجیت سنگھ کے لیے کوئی خاص پالیسی طے نہیں تھی۔ دربار میں الگ الگ فریق اور گروہ بن رہے تھے۔ شاہی خزانے میں پیسے کی بہت کمی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے شروع [illegible] اجیت سنگھ [illegible] اس کا کہنا تھا کہ اگر اجیت سنگھ

کو جنگ میں شکست بھی ہو جائے تو ایسی حالت میں وہ اس علاقے کے دشوار گزار پہاڑوں اور گھاٹیوں میں جا کر چھپ گا۔ جہاں اس کا پیچھا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خانِ دوراں جنگ سے گھبراتا تھا یا اورنگ زیب کے زمانے کے حالات کو دوبارہ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حیدر قلی اور دوسرے کچھ امیر اجمیر کو اجیت سنگھ کے ہاتھوں میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہاں خواجہ صاحب کی درگاہ وغیرہ مسلمانوں کے مقدس مقامات تھے۔

جس زمانے میں یہ مباحثہ دربار میں چل رہا تھا مظفر خاں جسے نہ جنگ کا تجربہ تھا اور نہ جس کے پاس لڑائی کا پورا سامان وہ تین ماہ تک منوہرپور میں پڑاؤ ڈالے رہا۔ اس زمانے میں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے مظفر خاں کے سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ جو کچھ بھی ہاتھ لگا لوٹ لیا۔ مظفر خاں جان بچا کر امیر آیا اور فقیر بن گیا ادھر اجیت سنگھ نے سانبھر، ڈیڈوانہ، ٹوڈہ، آلودا ور امرسر پر اپنا قبضہ جمالیا۔

اس کے بعد خان دوراں، حیدر قلی، قمرالدین خاں سبھی بڑے امیروں کو باری باری سے اجمیر کا صوبہ دار بننے کے لیے کہا گیا لیکن سب نے ٹال مٹول کر دی آخر میں عبداللہ خاں کے چچا سید نصرت خاں بارہا نے یہ بیڑہ اٹھایا۔ اسی وقت اجیت سنگھ کے حکم سے ابھے سنگھ نے نیم رانہ، شاہ جہاں پور، الور، تجارہ وغیرہ پرگنوں کو لوٹا۔ کہا جاتا ہے کہ ابھے سنگھ نے دلی سے ۹ کوس کے فاصلے تک لوٹ مار کی۔ لیکن اسی زمانے میں نظام کے دکن سے دلی لوٹ کر آنے کی اطلاعات ملی اس لیے اجیت سنگھ نے اجمیر خالی کر دیا اور معافی نامہ بھیجا۔ لیکن خان دوراں کے توسل سے اسے نہ صرف معاف ہی کر دیا بلکہ اجمیر کی صوبے داری بھی سونپ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خان دوراں راجپوت راجاؤں کی دوستی کے ذریعے اپنا ایک الگ گروہ بنانا چاہتا تھا۔ نظام نے اس پالیسی کی نکتہ چینی کی اور اجیت سنگھ کو اس طرح معاف کرنا کمزوری کا ثبوت مانا۔ اس طرح پھر دربار میں گروہ بندی شروع ہوگئی۔

دربار میں امیروں کا ایک با اثر گروہ اجیت سنگھ کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا اس لیے اجیت سنگھ کی طاقت کم کرنے کے لیے طاہر خاں کو جو اس سے قبل گجرات کا دیوان تھا اور سانبھر کا فوجدار مقرر کیا گیا تھا صوبہ اجمیر کا دیوان بنایا

گیا۔ اجیت سنگھ اور نا ہر خاں کی دیرینہ دشمنی تھی لیکن راجستھان میں داخل ہو کر ناہر خاں نے راجپوتوں کے پاس اپنا خیمہ ان کو دوست سمجھ کر لگا لیا۔ رات میں ناہر خاں کو قتل کر دیا گیا (6 جنوری 1723) اس اطلاع سے بادشاہ محمد شاہ بہت برہم ہوا اور اس نے شرف الدولہ خاں کو 7000 / 6000 منصب کے ساتھ اجمیر کا صوبے دار مقرر کیا اور یہ حکم دیا کہ "اس بدکار باغی کو چوہے کے بل سے بھی پکڑ کر لانا۔" اس مہم کے لیے اسے دو لاکھ روپے بھی نقد دیئے گئے۔ اسی زمانے میں جے سنگھ کی جاٹوں کے خلاف مہم ختم ہو ئی تھی اس لئے محمد خاں بنگش اور راجا گردھر کے ساتھ اسے بھی شرف الدولہ کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد تیسری بار مغلوں نے جودھ پور کی ریاست پر حملہ کیا پہلے دو حملوں (1702 و 1713) کے مقابلے میں یہ حملہ زیادہ سخت تھا۔ کیونکہ اس وقت کوئی بھی راجپوت راجا اجیت سنگھ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی زمانے میں حیدر قلی خاں گجرات کی صوبے داری سے نظام کے ذریعہ نکالے جانے کے بعد ریواڑی پہنچا کیونکہ وہ تجربہ کار اور محمد شاہ کا معتمد تھا اس لیے اسے اجمیر کی صوبہ داری اور سانبھر کی فوجداری دی گئی اور وہاں جانے کی اجازت دی گئی۔

8 جون 1723 کو مغل افواج اجمیر پہنچ گئیں اور انھوں نے گڑھ (بیٹلی گڑھ) کا محاصرہ کر لیا۔ حالانکہ اجیت سنگھ اس سے پہلے ہی اجمیر چھوڑ کر جودھ پور آگیا تھا۔ لیکن گڑھ بیٹلی کے قلعے دار اور داوت مضبوطی کے ساتھ شاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد جے سنگھ کے توسل سے صلح ہو گئی۔ اور امر سنگھ کو مع جملہ سامان کے قلعہ خالی کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اجیت سنگھ کو معاف کر دیا گیا اور اس کو پرانا منصب دوبارہ اسے دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اجیت سنگھ کو ناگور کی جاگیر راؤ اندر سنگھ کو واپس دینی پڑی یہ جاگیر 1713ء میں اجیت سنگھ نے اندر سنگھ سے چھین لی تھی جے سنگھ نے بذات خود جا کر اندر سنگھ کو ناگور کا قبضہ دلایا اجیت سنگھ کا یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا کہ اسے خود مغل دربار میں حاضری نہ دینی پڑے گی۔ اس کی جگہ پر اس کے بیٹے ابھے سنگھ کو دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی گئی یہ رعایتیں خان دوراں کے اثر سے حاصل ہوئیں کیونکہ

وہ راجپوت راجاؤں کو اپنا دوست اور حامی بنانا چاہتا تھا۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد 23 جون 1723ء کو اجیت سنگھ کے بیٹے بخت سنگھ نے اس کا قتل کر دیا اس واقعہ کی بہت سی وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ کچھ مصنفین کا کہنا ہے کہ وزیر قمر الدین خاں نے ابھے سنگھ کو یقین دلایا تھا کہ اجیت سنگھ کا زندہ رہنا مارواڑ ریاست کے فائدے میں نہیں ہے۔ لیکن باپ کے قتل کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ مارواڑ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ حالانکہ محمد شاہ نے راجا کا ٹیکا ابھے سنگھ کو دیا 'جیتاوت، کو پاوت' اور اوداوت راٹھور سرداروں کی حمایت سے ابھے سنگھ کے دیوان بھنڈاری رگھوناتھ نے بغاوت کو دبانا چاہا۔ اس کی مدد کے لیے جے سنگھ نے اپنے سپہ سالار رائے شیو داس کے تحت ایک فوج بھی بھیجی لیکن بغاوت بڑھتی گئی۔ اور جودھ پور شہر کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر میں بادشاہ سے مالی مدد لے کر ابھے سنگھ کو خود مارواڑ آنا پڑا۔ جے سنگھ کے کہنے سے رانا نے بھی ایک سسودیہ فوج ابھے سنگھ کی حمایت کے لیے بھیجی اس طرح سے 1725ء میں امیر جے پور اور میواڑ کی افواج کی مدد سے ابھے سنگھ اپنے بھائیوں کو شکست دے پایا لیکن یہ خانہ جنگی 1728ء تک چلتی رہی آنند سنگھ اور رائے سنگھ نے مراٹھوں سے مدد مانگی۔ اگر راجپوت راجا یہ مشورہ مان لیتے کہ ایڈر کی جاگیر ابھے سنگھ کے بھائیوں کو دے دی جائے تو شاید یہ حالات پیدا نہ ہوتے لیکن مہارانا خود ایڈر چاہتے تھے۔ 1728ء میں جب کنٹھ جی اور پلا جی نے گجرات کی جانب سے جالور پر حملہ کیا تب مہارانا کی آنکھیں کھلیں۔ بھنڈاری کھیوسی کے ذریعے انھوں نے یہ معاہدہ کیا کہ ایڈر ابھے سنگھ اور رائے سنگھ کو دے دیا جائے اور مرہٹے جالور خالی کر دیں گے۔

اس آپسی تنازع کے دو نتیجے نکلے اوّل خانہ جنگی اور اپنی اپنی ریاستوں کی توسیع کی خواہش کی وجہ سے مراٹھوں کو راجستھان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا موقعہ ملا۔ دوم یہ کہ اس پورے زمانے میں شاہی وزیر کی بار بار کوشش کرنے پر بھی ابھے سنگھ گجرات جاتے اور وہاں کے صوبے دار سربلند خاں کی مدد کرنے میں حیلہ سازی کرتا رہا۔ اس نے فوجی اخراجات

کے لیے وزیر سے ایک بڑی رقم مانگی جسے وہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ کسی جانب سے بھی مدد نہ ملنے کی وجہ سے فروری 1727ء میں سربلند خاں کو مرہٹوں کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنی پڑی اور گجرات کی چوتھ کنٹھ جی کدپ اور پلاجی گائیکواڑ کو دینا منظور کرنا پڑا اس طرح مرہٹے گجرات میں جم گئے اور گجرات کی سمت سے مرہٹوں کے لیے راجستھان میں داخل ہونے کا راستہ کھل گیا۔

1730ء میں ابھے سنگھ گجرات کا صوبے دار بنایا گیا 1733ء میں جب اومایائی داماڈے نے احمد آباد کا محاصرہ کیا تو ابھے سنگھ کو گجرات کی چوتھ وسر دیش مکھی دینا قبول کرنا پڑا مایوس ہو کر ابھے سنگھ گجرات کا کام اپنے نائب رتن سنگھ بھنڈاری کے سپرد کر کے جودھ پور چلا آیا۔ اپنے باپ اجیت سنگھ کی طرح اسے بھی بیکانیر ریاست پر اپنا قبضہ جمانے اور راجمیر کی صوبے داری حاصل کر لے کی خواہش تھی 1733 میں اس نے بیکانیر پر حملہ کیا۔ بیکانیر کے حاکم نے 12 لاکھ روپئے دے کر اپنی جان چھڑائی جب وزیر قمر الدین خاں نے اس سے گجرات واپس جانے کے لیے کہا تو اس نے اجمیر کی صوبے داری اور 25 لاکھ روپئے فوجی اخراجات کے لیے طلب کیے 1734 میں ہورڑہ میں سب راجپوت راجاؤں نے مرہٹوں کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن آپسی کش مکش کی وجہ سے مرہٹوں کے خلاف کوئی متحدہ محاذ نہ بن سکا۔ 1734ء کی مہم میں مغل پھر ناکام رہے۔ اس کے بعد ابھے سنگھ دلی پہنچا وہاں اس نے خان دوراں کے خلاف وزیر قمر الدین خاں کی حمایت کی اور راجمیر کی صوبے داری حاصل کرنے میں لگا رہا۔ حالانکہ وہ 1737 تک گجرات کا صوبے دار رہا لیکن اس نے وہاں کے انتظامی معاملات میں 1733ء کے بعد کوئی دل چسپی نہیں لی۔

شروع میں ابھے سنگھ اور بے سنگھ کے تعلقات اچھے تھے 1728ء کے بعد دونوں میں کشیدگی بڑھتی گئی اور 1735 کے بعد تو دونوں دربار میں مخالف گروہوں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح زیادہ دنوں تک اس دور میں راجپوت راجاؤں نے مشترکہ طور پر کسی ایک پالیسی پر اتفاق نہیں کیا حالانکہ سیاست میں ان کا اہم حصہ رہا۔

اس دور میں صرف مغل امیروں ہی کی قوت نہیں بڑھی بلکہ راجپوت اور

مرہٹہ دونوں ریاستوں میں سرداروں کی طاقت میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ راجپوت سرداروں کی قوت بڑھنے کی سب سے خاص مثال یہ ہے کہ میواڑ کے مہارانا امر سنگھ دوم نے سرداروں کے طبقے قایم کیے۔ ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا کہ جاگیروں کے وقتاً فوقتاً تبادلے کرنے کی مغلوں کی روایت کو ختم کر دیا جائے۔ اس طرح سرداروں کی جاگیریں ان کی آبائی جائیدادیں ہوگئیں اور ان کے اوپر دربار کا کنٹرول کم ہوگیا۔ شاید دوسری راجپوت ریاستوں کا بھی یہی مزاج تھا۔

اٹھارہویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں مرہٹوں کا عروج ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کا اثر مغل شہنشاہیت ہی پر نہیں سارے ملک پر پڑا بہادر شاہ کے دور حکومت میں مغلوں اور مراٹھوں کے تعلقات پر ایک گذشتہ باب میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد مرہٹہ حکومت کی سلسلے وار ترقی اور مغلیہ سیاست میں مراہٹوں کے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے اور شمالی ہندوستان میں ان کی آمد اور عمل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ ساہو کے مغل کیمپ سے بھاگ کر مہاراشٹر میں داخل ہونے کی وجہ سے مہاراشٹر میں ایک سنگین خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ سنبھاجی کے بہیمانہ قتل کے بعد اس کے بھائی راجہ رام نے حکومت کا کام سنبھالا تھا تو بھی گدی کا اصلی وارث سنبھاجی کے بیٹے ساہو کو جو قید میں تھا مانا گیا تھا۔ لیکن راجہ رام کی موت کے بعد اس کی بیوہ تارا بائی نے اپنے کم عمر بیٹے شیواجی دوم کو گدی کا وارث تسلیم کرانے کی کوشش کی اس لیے ساہو کے مہاراشٹر لوٹ آنے کے بعد مرہٹوں میں دو گروہ ہوگئے۔ برار، خاندیش اور بڈالانہ کے بااثر مرہٹہ سردار پرسوجی بھونسلے، نیماجی سندھیا ہیبت راؤ سنبل کر اور ساہو کے مسر رستم جی جادو وغیرہ نے ساہو کا ساتھ دیا۔ پونہ کے نزدیک کھیٹ کی جنگ میں تارا بائی کی بھیجی گئی فوج کو شکست دینے کے بعد ساہو نے ستارا پر حملہ کیا حالانکہ پرسو رام پنت نمائندے نے پھر بھی اس کی مخالفت کی۔ ستارا کے مغل قلعے دار شیخ میر نے ساہو کو اصلی وارث تسلیم کرتے ہوئے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ 12 جنوری 1708ء کو ساہو نے دھوم دھام سے ستارا میں تخت نشینی کا جشن

منایا اس کے بعد اس نے پنہالہ پر اپنا قبضہ جمایا اگر سب مرہٹہ سردار ساہو کا ساتھ دیتے تو وہ شیواجی کی ساری ریاست پر اپنا قبضہ جما لیتا لیکن بہت سے سردار ساہو کو زیادہ طاقتور نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ بہادر شاہ کے وزیر منعم خاں نے بھی تارا بائی کا ساتھ دیا۔

اسی زمانے میں بالاجی وشوناتھ کا عروج ہوتا ہے بالاجی کے آباؤ اجداد کونکن کے سری وردھن علاقے کے دیش مکھ تھے 1695ء سے 1707ء تک بالاجی پونا اور دولت آباد کے سر صوبے دار رہے۔ یہ علاقے اس زمانے میں مغلوں کے ماتحت تھے۔ معلوم پڑتا ہے کہ بالاجی نے راجہ رام اور اس کے وزیروں اور ساتھ ہی مغل حاکموں اور ساہو کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے۔ کھیڈ کی جنگ میں بالاجی نے ساہو کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد انہیں سپہ سالار بنایا گیا۔ بالاجی کے بڑھتے ہوئے اثر اور نئے عہدے کی وجہ سے کئی مرہٹہ سردار ناراض ہو گئے۔ خاص طور سے دھناجی جادو کا بیٹا چندرسین جادو اس سے بہت ناخوش ہوا۔ اس نے اور کئی مرہٹہ سرداروں نے تارا بائی اور مغلوں دونوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ شکار کھیلتے ہوئے بالاجی کے ساتھ جھگڑا ہونے اور ساہو کو اس کا ساتھ نہ دینے کے بہانے سے اگست 1711ء میں چندرسین مغلوں سے جا ملا۔ اس سے قبل راؤ رمبھا نمبالکر بھی مغلوں کی خدمت میں جا چکا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زیادہ تر مرہٹہ سرداروں میں غرور و خود غرضی کا جذبہ زیادہ تھا۔ اور وفاداری اور آزادی کا جذبہ کم۔ ان سرداروں کو مغل سلطنت میں بغیر کسی سے پوچھے لوٹ مار کرنے اور اس سے حاصل شدہ دولت آپس میں بانٹ لینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ شیواجی کے ذریعے چلائی گئی مرہٹہ تحریک کی شکل بدل چکی تھی کسانوں کے مفادات کی فکر ان طاقتور مرہٹہ سرداروں کو کم تھی اس لیے ساہو کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے سرداروں پر کنٹرول قایم کرنا تھا۔

اپنی خود غرضی کی وجہ سے ان سرداروں نے نہ صرف ساہو کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ دیگر سرداروں نے بھی تارا بائی کے ساتھ سازش کرنا شروع کر دیا۔ خاص طور سے مرہٹوں کی بحری فوج کے سالار کانھوں جی آنگرے نے کلیان وغیرہ علاقوں پر اپنا قبضہ جمایا اور ستارا پر بھی حملہ کرنے کی دھمکی دی ان حالات میں ساہو کو اپنے سرداروں

کو خوش کرنے کے لیے کئی اقدامات کرنے پڑے پرسو رام امبک کو جو تارا بائی کا خفیہ معاون ہونے کے الزام میں قید میں ڈال دیا گیا تھا اس کو نمائندے کا عہدہ دیا گیا۔ اس وقت پرسو رام اور بالا جی ایک دوسرے کے معاون تھے۔ پرسو رام امبک نے بالا جی کو پیشوا بنانے کے لیے زور دیا لیکن بالا جی نے یہ شرط لگائی تھی کہ کانھوں جی کے خلاف مہم پر وہ تبھی جائے گا جب اسے پیشوا کے عہدے پر تعینات کر دیا جائے۔

17 نومبر 1713ء کو ساہو نے بالا جی کو پیشوا مقرر کر دیا بالا جی نے بڑی ہوشیاری سے کانھوں جی وغیرہ کو توڑ لیا اس کے کہنے کے مطابق ساہو نے اس کے کئی قابل اعتماد لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح سید برادران کی طرح بالا جی بھی رفتہ رفتہ اپنی قوت بڑھا رہا تھا اور اپنے حامیوں کا گروہ تیار کر رہا تھا۔

1714ء میں تارا بائی کو اس کی سوت جس بائی نے سازش کر کے قید کر لیا اور اس نے اس کے بیٹے شیوا جی دوم کی جگہ پر اپنے بیٹے سنبھا جی دوم کو تخت پر بٹھایا۔ سنبھا جی کی تخت نشینی کولھا پور میں ہوئی۔ ستارا و کولھا پور ریاستوں کے آپسی جھگڑے پہلے کے مطابق چلتے رہے اور بعد میں مغلوں اور نظام الملک نے برابر ان جھگڑوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن تارا بائی کے زوال کے بعد کچھ وقت کے لیے ساہو بے فکر ہو گیا۔ اسی کی وجہ سے مرہٹوں کو اپنی طاقت بڑھانے اور مغل دربار کی گروہ بندیوں سے پیدا شدہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔

فرخ سیر کے تخت نشین ہونے کے بعد نظام الملک کو دکن کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا۔ نظام الملک نے داؤد خاں کے معاہدے کو جس کے مطابق دکن کی چوتھ و سردیش مکھی صوبے دار خود ساہو کو دے دیتا تھا۔ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں نے پھر سے جگہ جگہ لوٹ مار شروع کر دی خفی خاں کہتا ہے کہ نظام نے مرہٹوں کو کئی بار پسپا کیا لیکن مرہٹوں نے الگ الگ علاقوں میں مٹی کی چھوٹی چھوٹی گڑھیاں بنا رکھی تھیں۔ یہ گڑھ بڑے مضبوط تھے اور ضرورت کے مطابق مرہٹے جا کر ان میں چھپ جاتے تھے اور شاہی فوج کے لوٹ جانے کے بعد پھر لوٹ مار کرنا شروع کر دیتے تھے۔ نظام کے لیے ان سب گڑھیوں کو

مسمار کرنا ممکن نہیں تھا لیکن اسی زمانے میں نظام نے تارا بائی اور کولھاپور کے مرہٹہ سرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم کیے۔

1715ء میں نظام الملک کی جگہ پر میر بخشی سید حسین علی خاں کو دکن کا صوبیدار بنایا گیا۔ دکن پہنچنے کے بعد کچھ وقت تک حسین علی نے نظام کی پالیسی پر ہی عمل کیا۔ اس نے اور اس کے بخشی نے بڑی مستعدی سے جگہ جگہ مرہٹوں کو شاہی حدود سے باہر نکال دیا لیکن مرہٹوں کی سرگرمیاں بڑھتی ہی گئیں۔ برہان پور کے پاس کھانڈو ڈابھاڈے نے حسین علی کے بخشی ذوالفقار علی خاں کو بُری طرح شکست دی۔ اس کے انتقام میں حسین علی کے دیوان راجہ موکھم سنگھ، چندر سین جادو، نیما جی سندھیا نے ستارا تک مرہٹوں کا علاقہ تہس نہس کر دیا۔ حالانکہ شاہی حلقوں میں اس فتح پر بڑی خوشی منائی گئی لیکن ایک طرف تو اس سے حسین علی کے مسائل کا حل نہیں نکلا اور دوسری طرف فرخ سیر نے خفیہ طور پر ساہو اور کرناٹک کے زمینداروں وغیرہ کو حسین علی کی مخالفت کرنے کے لیے اکسایا۔

آخر میں اپنے چچا سید انور خان کے مشورے سے اور شنکراجی ملہار کے توسل سے حسین علی نے ساہو کے ساتھ صلح کر لی۔ مغلوں اور مرہٹوں کے تعلقات کے لیے یہ صلح جو فروری 1718ء میں ہوئی بہت اہم ہے کیونکہ یہ مستقبل کے سب معاہدوں کی بنیاد ہے۔ اس میں یہ طے کیا گیا (1) ساہو کو رسمی طور پر شیواجی کا "سوراج" دے دیا گیا لیکن خاندیش کے بدلے اسے پنڈار پور اور ترپلنگ پرگنوں سے لگے ہوئے علاقے دے دیئے گئے۔ (2) برار گونڈوانہ اور کرناٹک کے علاقوں میں مرہٹوں کے حال میں فتح کیے گئے علاقے بھی اسے دیدیے گئے۔ (3) ساہو کو دکن کے چھ صوبوں سے اپنے کامبش داروں کے ذریعے چوتھ و سردیش مکھی وصول کرنے کا اختیار دے دیا گیا اس شرط کے ساتھ کہ ہر اٹھے راہداری وصول نہیں کریں گے بلکہ وہ صرف حکومت کی جانب سے طے کیے گئے ٹیکس وصول کریں گے (4) مندرجہ بالا رعایتوں کے بدلے میں ساہو نے یہ وعدہ کیا کہ وہ دس لاکھ پیش کش دے گا، مغل صوبے دار کے لیے پندرہ ہزار گھوڑسوار تعینات کرے گا، ملک کو آباد کرے گا سب

مفسدوں کو سزا دے گا اور اگر کسی کا سرمایہ چرالیا جائے یا برباد کیا جائے تو اسے واپس دلائے گا اور چوروں کو سزا دے گا اور اگر سرمایہ واپس نہ دلا سکے تو اسے بذات خود دے گا۔(5) سر دیش مکھی کے حصول کے لیے وہ روایتی سرمائے کے لیے طے شدہ درسے پیش کش دے گا۔ یہ رقم ایک سال کی آمدنی کے ساڑھے چھے گنا کے حساب سے 117516762 روپئے ہوتی تھی لیکن ساہو نے صرف اس کا دسواں حصہ یعنی 1719390 روپئے بارہ آنے دینا منظور کیا۔

خفی خاں کا کہنا ہے کہ مراٹھوں نے چوتھ وسر دیش مکھی کے لیے ہر پر گنے میں الگ الگ کام درسدار تعینات کیے جس کے نتیجے میں رعایا کو اب دو یا تین عاملوں کو مال گزاری دینی پڑتی تھی۔ مرہٹے مال گزاری کے علاوہ راہ داری اور دیگر ٹیکس بھی وصول کرتے تھے جس کی وجہ سے جمع بندی کا تقریباً آدھا حصہ انھیں حاصل ہوجاتا تھا۔ امن وامان کے انتظام کے لیے ساہو نے کوئی توجہ نہیں دی نہ ہی اس نے سر دیش مکھی کی سند کے بدلے ایک کروڑ سے زیادہ رقم جس کا اس نے وعدہ کیا تھا، ادا کی۔ فرخ سیر کو تخت سے ہٹانے کے بعد یہ سب سندیں سیدوں نے نئے بادشاہ سے دلوادیں۔ بعد میں محمد شاہ نے بھی تخت نشین ہونے کے بعد ان سندوں کی تصدیق کی یہی چیز آگے چل کر مرہٹوں کے قانونی اختیارات کی بنیاد بنی

ان سندوں کے حاصل کرنے سے سید برادران اور مرہٹوں کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ نظام کی بغاوت کے وقت عبداللہ خاں نے ساہو کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں تے اپنے نائب علی خاں کو دکن میں اکیلے آپ ہی کے بل بوتے اور حمایت پر چھوڑا ہے لیکن چوتھ وسر دیش مکھی کی سندوں کے حصول کی وجہ سے مراٹھوں کی اندرونی حالت پر بھی ایک اہم اثر پڑا ساہو اب سب کی نظر میں مرہٹوں کا واحد حاکم تھا۔ اور شیواجی کا قانونی وارث بن گیا اس کے بعد بھی مرہٹوں نے جو کچھ علاقے جیتے ان کا قانونی اختیار مغل بادشاہ سے حاصل کرنے کی انھوں نے برابر کوشش کی، اس طرح دوسرے مغلیہ امیروں کی طرح مرہٹوں نے مغل بادشاہ کے لیے وفاداری دکھاتے ہوئے سلطنت کو کھوکھلا کیا۔

دوسرے چوتھ وسر دیش مکھی کا بٹوارہ بالاجی نے ایک خاص طریقے سے کیا

چوتھ کا 25 فی صد حصہ مرہٹہ راجہ کا مانا گیا راجہ کے حصے کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری اس کے اعلیٰ عہدے داروں، نمائندہ، پیشوا اور پنت سکریٹری کو سونپی گئی اس کے علاوہ چھ فی صد سہوترہ کے نام سے پنت سکریٹری کو انتظام کے لیے دے دی گئی۔ تین فیصد نالگونڈہ کے نام سے ساہو کے پاس محفوظ رہا کہ چاہے جس سردار کو دے دے۔ بچا ہوا 66 فی صد حصہ مقاسا کے نام سے مختلف سرداروں کو دے دیا گیا۔ اسی طرح بعد میں سردیش مکھی کا بٹوارہ کیا گیا۔

یہ انتظام کسی طرح سے بھی ایک معیاری انتظام نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت میں یہ اس دور کے سرداروں کی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے اس کا بنیادی اثر یہ پڑا کہ سرداروں کی قوت اور بڑھ گئی اپنے حصے کی چوتھ یعنی چوتھ کے 25 فی صد حصے کے لیے بھی ساہو اپنے اعلیٰ عہدے داروں پر منحصر ہو گیا۔ یہی نہیں ساہو کے حصے کا خود استعمال کرنے کے لیے اس کے اعلیٰ عہدے دار، نمایندہ، پیشوا اور پنت سکریٹری میں باہمی کش مکش ایک فطری بات تھی۔ مغلیہ دربار کے حالات اور مرہٹہ راجا کے دربار کے حالات میں ہمیں کئی طرح سے یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ دونوں میں امیروں اور سرداروں کی طاقت بڑھنا، ان میں جاگیر یا مقاسہ، سرجام وغیرہ کے لیے آپسی کش مکش اور گروہ بندی اور حاکم اور اس کے وزیر اعلیٰ۔ وزیر یا پیشوا میں طاقت کے لیے کش مکش یہ تینوں عنصر دکھائی دیتے ہیں لیکن یہاں یکسانیت ختم ہو جاتی ہے کہ مغل حکومت میں وزیر طاقت حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے لیکن مرہٹوں میں پیشوا کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن سب سے اعلیٰ ہو جانے کے بعد وہی سرداروں کے ساتھ کشمکش کرنے کا مسئلہ پیشوا کے سامنے بھی آ جاتا ہے۔ ان پورے واقعات کے سلسلے پر تبصرہ کرنا حالانکہ اس کتاب کا مقصد نہیں ہے لیکن اس کی جانب اشارہ کرنا ہمارے لیے نامناسب بھی نہیں ہے۔

پیشوا کو مرہٹہ حکومت میں سب سے اعلیٰ بنانا مرہٹوں کی طاقت مالوہ اور گجرات میں قایم کرنا اور راجستھان بندیل کھنڈ اور گنگا کے علاقے میں مرہٹہ افواج کے داخلے ان سب کا سہرا بالاجی وشوناتھ کے بیٹے اور وارث باجی راؤ کے سر ہے۔ مغلیہ طاقت کے روز بروز زوال اور دربار میں مختلف گروہوں کے درمیان

کش مکش نے مرہٹوں کو اپنی قوت میں ترقی کرنے کا موقعہ دیا حقیقت میں مرہٹوں نے اس موقعہ کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اب مرہٹوں کی جد وجہد اپنی اور مراٹھا حکومت کی حفاظت کے لیے نہ ہو کر مرہٹہ سلطنت کے قیام کے لیے اور مرہٹوں کے ذریعے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے والے علاقوں کی فلاح وبہبودی کے لیے شروع ہوئی۔ باجی راؤ کے طاقت حاصل کرنے تک یہ تبدیلی واضح طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔

مرہٹہ دربار میں مرہٹوں کی مستقبل کی پالیسی کے بارے میں اور دوسرے معاملات میں باجی راؤ اور نمائندہ سری پت راؤ کے درمیان زبردست اختلاف رائے تھا۔ ہم عصر مصنف چٹنس کے مطابق دونوں آدمیوں کے کام کرنے کے ڈھنگ اور جوازات پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ چٹنس کے کہنے میں مبالغہ آرائی اور پر جوش انداز بیان کا استعمال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور بہت سے ایسے الفاظ جو شاید صرف چٹنس کے اپنے خیالات ہوں مخصوص کرداروں کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں۔ اختلاف رائے اور کش مکش کے مندرجہ ذیل معاملات تھے۔

(1) توسیع پسندانہ پالیسی اور اس کی راہوں اور وقت کا تعین

(2) نظام الملک کا رویہ اور اس سے دوستانہ تعلقات بنائے رکھنے کے امکانات

(3) اندرونی انتظام خاص طور سے مرہٹہ سرداروں پر قابو رکھنا اور فوجی و مالی انتظامات آخری سوال طاقت کا تھا یعنی شاہی نشستوں میں بالادستی پیشوا کی ہوگی یا نمائندے کی۔

حقیقت میں نمائندہ توسیع پسندانہ پالیسی کے خلاف نہیں تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے کونکڑ کی جانب ریاست کو پھیلایا جائے۔ اس کا جواز تھا کہ کرناٹک پر تسلط قائم کیا جائے جہاں زنجیرہ کے سدی نے بہت سے علاقے دبا لیے تھے اور کرناٹک کی فتح پایہ تکمیل تک پہنچائی جائے جس کی ابتدا شیواجی نے کی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ دکن میں اپنی حالت مضبوط کرنے کے بعد ہی شمال کی جانب بڑھنا چاہیئے۔ نمائندے نے ہوشیاری کی پالیسی پر زور دیا اور تنبیہ کی کہ مرہٹے ایسی پالیسی پر عمل نہ کریں کہ دوبارہ مہاراشٹر کو مغلوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ وہ طاقتور نظام کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی رائے تھی کہ جب

تک کافی مالی ذرائع اور ایک طاقتور فوج اور مستقل انتظامیہ ڈھانچہ قایم نہ ہوجائے تب تک کوئی بڑی فوجی کارروائی نہ کی جائے۔

برخلاف اس کے باجی راؤ نے مغلیہ دربار کی کمزوریوں اور کاہلی پر زور دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مغل دربار امیروں کی اندرونی چپقلش اور گروہ بندی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور مرہٹوں کی مدد سے بادشاہ تخت سے اتارے یا بٹھائے جا رہے ہیں۔ کرناٹک کی فتح کو اس نے ایک گھریلو معاملہ بتایا جسے حضرت (راجا کی گھریلو) فوج پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ شیواجی کے ہندو پادشاہی کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ہندو راجاؤں کی نام نہاد دوستی کا تذکرہ کیا۔

نظام کی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نظام کو روکنے کے ساتھ ہی شمال کی جانب مرہٹہ قوت کو بڑھا سکتا ہوں۔ آخر میں اس نے مرہٹہ سرداروں کو لوٹ مار سے حاصل ہونے والی دولت کا لالچ دیتے ہوئے کہا کہ دکن تو مسلسل جنگوں کی وجہ سے ویران ہو چکا ہے لیکن شمالی ہندوستان مال و زر سے بھرا پڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے پرجوش الفاظ میں کہا۔ تنے پر وار کرنے سے شاخیں اپنے آپ گر جائیں گی اگر میری بات سنو تو میں اٹک کی دیواروں پر مرہٹوں کا بھگوا پرچم لہرا دونگا۔

باجی راؤ کی شمال کی جانب توسیع پسندانہ پالیسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دکن کی فتح کی جانب دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ 1724ء میں ہی جب بادشاہ نے نظام الملک کے خلاف مرہٹوں سے مدد مانگی اسی وقت باجی راؤ نے مطالبہ کیا تھا کہ حیدر آباد کی صوبے داری اس کو دے دی جائے اور ان کی رضامندی سے دکن کے صوبے دار کا تقرر کیا جائے۔

اس سے واضح ہے کہ باجی راؤ بھی دکن میں مرہٹوں کا تسلط قایم کرنے کے حق میں تھا لیکن وہ نمائندے کی اس تخیلاتی رائے سے متفق نہیں تھا کہ نظام الملک کی مخالفت کے بغیر مراٹھے آسانی سے کرناٹک پر قبضہ کرلیں گے۔ بالالفاظ دیگر وہ سمجھتا تھا کہ نظام جیسے چالاک اور مدبر دشمن کی موجودگی میں اپنے موجودہ ذرائع سے مرہٹے سارے دکن پر اپنا تسلط قایم نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس کی واضح پالیسی تھی کہ مرہٹے مالوہ و گجرات جیسے خوش حال علاقوں کو فتح کریں۔ اٹھارہویں صدی

کی ابتدا سے ہی ان صوبوں پر مرہٹے مسلسل حملے کرتے آ رہے تھے اور وہاں لوٹ مار کر کے دولت حاصل کر رہے تھے باجی راؤ نے ان بے ضابطہ حملوں کو نہ صرف ایک مستقل شکل دی بلکہ اس نے ان علاقوں کی سیاسی و فوجی اہمیت کو بھی سمجھا مرہٹوں کا مالوہ و گجرات پر مضبوط کنٹرول ہونے پر وہ نظام اور دلی کے رابطوں کو توڑ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں مرہٹے نظام کے علاقے پر آسانی سے تین طرف سے حملہ کر سکتے تھے اور نظام کسی بھی طرح کی مدد دلی سے حاصل نہیں کر سکتا تھا یا مرہٹے وہاں سے دوآبہ اور اس کے پورب و پچھم کی جانب آگے بڑھ سکتے تھے۔

اس لیے ایک بڑی مرہٹہ سلطنت کے قیام کے لیے مالوہ و گجرات پر مرہٹوں کا تسلط پہلا قدم تھا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ خیال ٹھیک نہیں کہ باجی راؤ نے اس کے آگے اپنا منصوبہ بنایا ہوگا۔ اٹک پر مرہٹوں کا پرچم لہرانے کا اس کا قول ایک سیاداں کی شیخی بگھارنے یا دھاک جمانے والی بات تھی اٹک تک پرچم لہرانا ایک لمبی مدت تک مرہٹوں کی قوت کے باہر تھا باجی راؤ اتنا زمانہ شناس تھا کہ اس نے عملاً اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش نہیں کی جس کا حاصل کرنا پوری طرح ناممکن تھا۔

شمالی ہندوستان کا ردعمل

حالانکہ نظام نے سیدوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ سید برادران ہندوؤں راجپوتوں اور مراٹھوں کے دوست ہیں لیکن اپنی کامیاب بغاوت کے بعد نظام الملک نے اس شاہی فرمان جس کے مطابق مرہٹوں کو دکن کی چوتھ و سردیش مکھی کا اختیار دیا گیا تھا احترام کیا۔ لیکن اس نے مرہٹہ عہدے داروں کے دارالحکومت اورنگ آباد کے پاس رہنے پر اعتراض کیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ۹ جنوری 1721 کو اس نے باجی راؤ کے ساتھ پہلی ملاقات کی اس ملاقات میں کن مدعوں پر بات چیت ہوئی یہ نامعلوم ہے لیکن یہ واضح ہے کہ نظام الملک نے جوان العمر باجی راؤ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے تو بھی دونوں کے مابین کسی طرح کا معاہدہ نہ ہو سکا۔ نظام الملک کا بیجاپور اور گولکنڈہ پر قبضہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بیجاپوری و حیدرآبادی دونوں کرناٹکوں کا مالک سمجھتا تھا جبکہ

مراٹھے اس کے اس دعوے کو غلط سمجھتے تھے شاہ جی کے زمانے سے ہی مرہٹے کرناٹک پر اپنا خصوصی حق سمجھتے تھے اور وقتاً فوقتاً اسے لوٹتے رہتے تھے۔

نظام الملک اکتوبر 1721ء میں اورنگ آباد سے دلی لوٹ آیا اور 1724ء تک دربار کی اس سیاست میں پھنسا رہا اس کی غیر حاضری میں اس کے نائب مبارز الملک نے مرہٹوں کے ساتھ چوتھ دینے کے معاہدے کو ماننے سے انکار کر دیا جس سے مرہٹوں کے ساتھ پھر سے کش مکش شروع ہو گئی لیکن اس دوران میں بھی نظام الملک نے مرہٹوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنائے رکھنے کی کوششوں کو جاری رکھا۔ گجرات کی مہم کے دوران 24 فروری 1723ء کو نظام اور باجی راؤ کی دوبارہ ملاقات ہوئی جیسا کہ اس سے قبل بھی بیان کیا جا چکا ہے

نظام کے دلی چھوڑ کر دکن چلے جانے کے وقت 1724ء مراٹھوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بادشاہ نے ساہو کو لکھا مبارز خاں نے بھی مرہٹوں کے ساتھ دوستی کے لیے سیدھی بات چلائی۔ ان کوششوں کو روکنے کے لیے نظام الملک نے باجی راؤ کے ساتھ تیسری بار ذاتی طور پر ملاقات کی حالانکہ ساہو نے اپنے سرداروں کو غیر جانبدار رہنے کا حکم دیا تھا لیکن شاکر کھیڑا کی جنگ میں باجی راؤ اپنے گھوڑ سواروں کے ساتھ نظام کے حق میں لڑا اس کے کاموں سے خوش ہو کر نظام الملک نے اسے 7000 ہزاری کا منصب دے کر اس کی عزت افزائی کی۔ کچھ ہم عصر مورخین کی رائے ہے کہ نظام الملک نے مرہٹوں کی حمایت کے بدلے میں باجی راؤ کو گجرات و مالوہ کی جانب پیش قدمی کرنے کے لیے اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی۔

مرہٹوں کی شمالی ہندوستان کی طرف بڑھنے کی پالیسی کو سمجھنے کے لیے مرہٹوں اور نظام کے تعلقات کو سمجھنا ضروری ہے۔ نظام الملک کے دوستانہ تعلقات کے بارے میں پیشوا اور نمائندہ شری پت راؤ کے درمیان اختلاف رائے تھا۔ نمائندہ نظام کے ساتھ مستقبل میں دوستی بنے رہنے کی جانب کافی پُر امید تھا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مبارز خاں کے خلاف فتح کے بعد کرناٹک میں نظام اور مرہٹے مشترکہ طور پر دو بار مہم کر چکے تھے لیکن نمائندہ ان کارروائیوں کے پردے میں نظام کے مقاصد اور اندرونی جذبے کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ نظام باجی راؤ کے

شمالی ہندوستان کی جانب پیش قدمی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا تھا کیونکہ مغلیہ دربار کا رویہ اس کے لیے دشمنانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ مرہٹوں کو اتنا طاقت ور بننے کا موقعہ دینے کے حق میں بھی نہیں تھا کہ وہ مالوہ وگجرات پر اپنا پورا تسلط قایم کریں کیونکہ ایسی حالت میں وہ اس کے اور مغل دربار کے بیچ دیوار کا کام کرتے اور اس کی حالت خطرے میں پڑ جاتی۔ نظام الملک کی پالیسی کا بنیادی مقصد تھا کہ اس کے دونوں دشمن یعنی مرہٹے اور مغل بادشاہ آپس میں لڑتے رہیں ساتھ ہی وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی اتنا طاقتور نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ دوسرے فریق پر حاوی ہو جائے اس لیے مراٹھوں کے ساتھ دوستی دکھاتے ہوتے بھی اس نے دربار کے ساتھ اپنے تعلقات کو ٹھیک کرنے اور دلّی کے لیے اپنا راستہ صاف رکھنے کی بھی کوشش کی۔ مراٹھوں پر اندرونی بندش رکھنے کے مقصد سے اس نے مرہٹوں کے مختلف گروہوں اور سرداروں اور خاص طور سے کولھاپور کے سنبھاجی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم کیے یہ پالیسی انتہائی گنجلک تھی اور اسے نظام الملک جیسا ہی مدبر اور ہوشیار سیاست داں عملی جامہ پہنا سکتا تھا جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ کسی حد تک سوائی جے سنگھ نے بھی نظام کی بنیادی پالیسی کی تقلید کی لیکن اس میں اسے نظام جیسی کامیابی نہیں ملی۔

نظام کی اس مشکل پالیسی کی وجہ سے ہمیں بار بار ایسے دور دکھائی دیتے ہیں جن میں نظام اور مراٹھوں کی دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور دشمنی دوستی میں۔ اس کا اثر شمالی ہندوستان کی سیاست پر پڑنا لازمی تھا۔ نظام اور مرہٹوں کے تعلقات کا تفصیلی جائزہ لینا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ 1721 سے 1727ء تک دوستانہ تعلقات کے بعد نظام اور مراٹھوں میں کشمکش کی حالت پیدا ہو گئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس مدت میں مالوہ وگجرات میں مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے نظام الملک بے چین اور خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کرناٹک کے خلاف مرہٹوں کی مہم کی بھی مخالفت کی حالانکہ 1725-26ء اور 1727-28ء میں کرناٹک میں ساہو کی مہم کے دوران اس نے اپنا تعاون دیا تو بھی اس نے اپنے سپہ سالاروں کو مرہٹوں کی مخالفت کرنے کے لیے خفیہ حکم

دے رکھا تھا جب مراٹھوں کی فوج کا بڑا حصہ باجی راؤ کی قیادت میں کرناٹک میں تھا تو نظام نے اپنا نقاب اتار دیا اس نے دکن کی چوتھ وسردیش مکھی کے سلسلے میں ساہو اور سنبھاجی کے درمیان اختلاف کو بنیاد مان کر ساہو کو چوتھ وسردیش مکھی دینے سے انکار کر دیا اس کے ساتھ ہی شاہی نمائندے کی حیثیت سے اس نے ساہو کو اپنا دعویٰ پیش کرنے کی غرض سے مدعو کیا اس نے ساہو کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ باجی راؤ کو پیشوا کے عہدے سے ہٹا دے اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے نظام نے کولھاپور کے سنبھاجی کے ساتھ ساز باز کر لی تھی۔

نظام کے اس رویے نے ساہو کو شش وپنج میں ڈال دیا نمائندہ شری پت راؤ کی صلاح سے ساہو نے تنازعے کو نپٹانے کی غرض سے نظام کی ثالثی منظور کر لی۔ لیکن وہ جلد ہی حقیقت کو سمجھ گیا اور مرہٹہ افواج کو فوراً واپس آنے کے لیے لکھا اس نے مرہٹہ سالاروں کو بھی اپنے اپنے قلعے میں ہوشیار رہنے کا حکم دیا کرناٹک سے لوٹ کر باجی راؤ نے نظام کے خلاف لڑائی چھیڑنے کی رائے دی اس لیے ساہو نے نمائندے کی صلح کی تجویز کو رد کر دیا نظام الملک کو مراٹھوں کے ساتھ جنگ چھڑنے کی امید نہیں تھی باجی راؤ نے ایک بڑے گھوڑ سوار دستے کو لے کر نظام الملک کو پالکھیڑہ کے مقام پر گھیر لیا مرہٹوں نے نظام تک رسد پہنچنا روک دیا لیکن نظام کے طاقتور توپ خانے کی مار کی وجہ سے انھوں نے نظام کی فوج پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے ڈیڑھ ماہ کے محاصرے کے بعد دونوں نے صلح کرنی زیادہ مفید سمجھی مارچ 1728ء میں منگی شیوگاؤں میں سمجھوتہ ہوا جس کے مطابق نظام ساہو کو دکن کی چوتھ وسردیش مکھی دینے اور کولھاپور کے سنبھاجی کو کسی بھی طرح پناہ نہ دینے کو رضامند ہوگیا کچھ مورخین کا خیال ہے کہ منگی شیوگاؤں کی صلح کے نتیجے میں دکن میں مرہٹوں کی خودمختاری قایم ہوگئی تھی لیکن یہ تاریخی نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ دکن پر اپنا تسلط جمانے کے لیے مرہٹوں کو برابر جد وجہد کرنی پڑی اور یہ جد وجہد 1761 اور اس کے بعد تک چلتی رہی۔ لیکن اس صلح میں دکن کی چوتھ وسردیش مکھی پر ساہو کے دعوے کو صحیح تسلیم کر لیا گیا اور ایک لمبی مدت سے چلا آ رہا تنازعہ ختم ہوگیا۔ باجی راؤ ساہو کے دربار میں نمائندہ شری پت راؤ کا اثر کم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ اب مرہٹے اپنا پورا دھیان مالوہ و گجرات کی طرف لگا سکے۔

اس طرح منگی شیوگاؤں کی صلح صرف دکنی ہندوستان کے لیے ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس کا پورا اثر شمالی ہندوستان کی سیاست پر بھی پڑا بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ 1725ء میں نظام کے مغل دربار چھوڑ کر چلے جانے کے بعد 1739ء میں نادر شاہ کے حملے تک سیاست کا مرکز مغلیہ دربار نہیں دکنی ہندوستان ہو جاتا ہے اور شمالی ہندوستان کی سیاست کافی حد تک دکنی ہندوستان کی سیاست سے طے ہوتی ہے۔

باب نہم

مالوہ اور بندیل کھنڈ کی فتح

(1732 - 42)

مالوہ کی چوتھ کے سلسلے میں مرہٹوں کے ساتھ زبانی معاہدے کے بعد(1731 میں) محمد امین خاں بنگش کو اس صوبہ کی صوبہ داری سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کی جگہ پر جے سنگھ سوائی کو مقرر کیا گیا اور وہ اس شرط پر کہ وہ تیس ہزار سوار اور اتنے ہی پیدل سپاہ مہیا کرے گا اور ان اخراجات کے لیے اس کو اس صوبہ کی زمینوں اور خراج وغیرہ سے ملنے والی آمدنی کا دو تہائی حصہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن خود اس پرگنہ داری کے خیال سے ایک دیوان کا بھی تقرر کیا گیا جسے 18 ہزار سوار مہیا رکھنے اور مال گزاری کا ایک تہائی حصہ بذریعہ اپنے اہل کاروں کے وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ راجہ کی غیر حاضری میں راجہ کے نائب کو کم از کم چھ ماہ تک رہنے کا حکم دیا گیا۔ 1

جے سنگھ سے قبل کسی گورنر کو اس قدر اختیارات کبھی نہ دیے گئے تھے اس کے پاس علاوہ مالوہ کے آگرہ کا صوبہ بھی تھا اور اسے یہ بھی اختیار تھا کہ اپنی جے پور کی افواج کے ذریعہ اور اس کی فوج کے لیے مقرر کردہ راجاؤں کی سپاہ کے ذریعہ وہ 48 ہزار سوار اور پیادوں کا اضافہ بھی کر سکتا تھا۔ مالوہ کی گذاری سے کے علاوہ شہنشاہ کی طرف سے اس کو 20 لاکھ کی رقم دی گئی جس میں سے 13 لاکھ بطور وظیفے کے اور سات لاکھ بطور قرض کے دیے گئے۔ 2

مرہٹوں کے ساتھ ایک پُرامن تصفیہ سے متعلق راجہ کی واضح پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات قابل قیاس نہیں ہے کہ اسے مالوہ میں مرہٹوں کے خلاف ناقابل تصفیہ دفاع کے لیے بھیجا گیا تھا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل کہ وہ اس کے لیے تصفیہ کرے۔ اسے اسی صوبہ میں اپنی دفاعی طاقت کی نمائش کرنا تھی۔

جے سنگھ دسمبر 1722ء میں مالوہ پہنچا۔ ہولکر کی سرگرمی میں مرہٹے صوبہ کے اندر داخل ہوئے اور ہولکر نے منڈسور میں جے سنگھ کی افواج کو گھیر لیا۔ شہنشاہ کے اس موقعہ پر پہنچ جانے کے ارادہ کی خبر سے محصور افواج کا حوصلہ بڑھ گیا اور انھوں نے ہولکر کو منڈسور سے سولہ کوس کی دوری تک پسپا کر دیا۔ لیکن موخر الذکر نے اپنی مہم کو تیز تر کر دیا اور اب اس کے سامنے جے پور کا راستہ صاف اور خالی نظر آرہا تھا۔ جے سنگھ گھبرا گیا اور اس نے مرہٹوں سے امن کی تجویز پیش کر دی۔ مارچ 1733 میں اس نے چھ لاکھ روپیہ بطور ضمانت کے اور چوتھ کی جگہ مالوہ کے اٹھائیس پرگنے پیشوا کو دینے منظور کر لیے۔[3]

اس معاہدہ سے مالوہ میں مغل اور مرہٹہ کشمکش میں ایک نیا موڑ سامنے آجاتا ہے ابھی تک تو مرہٹے صرف چوتھ اور سردیش مکھی کی ہی مانگ کر رہے تھے اور اس رقم کو یا تو سالانہ یک مشت رقم کی صورت میں یا جاگیر کی صورت میں طلب کر رہے تھے لیکن اب چوتھ کی جگہ پر انھوں نے چند پرگنوں کی مانگ شروع کر دی تھی۔ اب لوٹ مار نہ کرنے اور حفاظت کی ذمہ داری کے بدلہ میں چوتھ طلب کرنے کا بہانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب تو انھوں نے چوتھ کی مانگ کو گویا اپنی سرحدوں کی توسیع کرنے کا ایک وسیلہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد مالوہ میں چوتھ اور سردیش مکھی کی مانگ روز بروز پس منظر میں جاتی رہی اور اب اس صوبہ پر مکمل قبضہ کی مانگ کا آغاز ہو گیا۔ اب مالوہ میں مرہٹے خود کو اس قدر مضبوط اور محفوظ سمجھنے لگے تھے کہ جولائی 1732ء میں پیشوا نے اس صوبہ کو اپنے مخصوص سپہ سالاروں یعنی سندھیا ہولکر اور دونوں پاور بھائیوں میں بھی تقسیم کر دیا۔[4]

جے سنگھ کے معاہدے کے لیے شاہی تصدیق حاصل ہونے کا دور تک بھی نشان نظر نہ آتا تھا۔ ادھر دوسرے ہی سال 34-1733ء میں مرہٹوں نے ایک طرف تو راجپوتانہ پر حملہ کیا اور دوسری طرف دیتا اور چھا وغیرہ ریاستوں پر بھی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ مرہٹوں کی فوج میں چھترسال بندیلہ کے بیٹے بھی آکر شامل ہو گئے۔ کیونکہ ان کا 1733ء سے اپا کے ساتھ یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ وہ مرہٹوں کی مدد کریں گے اور جمنا پار کی فتوحات میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔[5]

مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی رفتار نے بالآخر دربار کو شدید خطرہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا اور 1732 اور 1735ء کے درمیان مرہٹوں کو مالوہ سے بے دخل کرنے کی تین مہمیں بروئے کار لائی گئیں 173233ء، میں وزیر اعظم قمر الدین خاں اسی نوے ہزار فوج کو لے کر مالوے کی سرحد تک پہنچا اور گوالیار کے ضلع سینتو پوری میں خیمہ انداز ہوا اس نے عظیم اللہ خاں کو مرہٹوں کو پسپا کرنے کے لیے روانہ کیا کیونکہ مرہٹے اس وقت شاہی کیمپ سے 15 یا 16 کوس کے فاصلہ پر تھے۔ عظیم اللہ نے پلاجی کو جا پکڑا اور شیو داس کے بقول ان کو شکست فاش دی اور انھیں نرمدا کے اس پار لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس فتح سے مطمئن ہو کر عظیم اللہ پھر وزیر کی افواج سے آملا۔6 اسی اثنا میں مندسور کے مقام پر جے سنگھ کی شکست کا حال سب کو بخوبی معلوم ہو چکا تھا۔ نرمدا پر کوئی ایسا دفاعی انتظام نہ کیا گیا جس کے ڈر سے آئندہ مرہٹے دوبارہ مالوہ میں نہ داخل ہونے پائیں۔ اورچھا کے راجاؤں اور راؤ رام چندر نے وزیر پر زور ڈالا کہ وہ چھتر سال کے بیٹوں کے خلاف ایک مہم بھیجے اور ان کی سرکوبی کرے کیونکہ وہ لوگ مرہٹوں سے ملے ہوئے تھے۔ وزیر راجہ جگت رائے کی سرحد تک پہنچا کہ اس نے ایک زمیندار کی مسلح بغاوت کی خبر سنی۔ یہ زمیندار اس کی غازی پور کی جاگیر میں ادارو نام کا تھا اور اس کے ہاتھوں اس کے داماد نثار خاں کی موت واقع ہو چکی تھی۔ انتہائی غضبناک ہو کر وزیر اس جگہ پہنچا اور اس پر قابض ہو گیا۔ سینتو داس اس کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے اس لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے زمیندار کا شاہی وزیر کی خلاف ورزی کرنے کا اقدام شاہی اثر و رسوخ اور عظمت و عزت کے زوال پذیر ہونے کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے۔6الف

1733ء و 1734ء میں پچھلے سال کی حماقت کو پھر دہرایا گیا۔ یعنی مظفر خاں، خان دوراں کا بھائی، مرہٹوں پر حملہ کیے بغیر سرونج تک بڑھا اور آئندہ کے لیے مرہٹوں کے حملوں کا سدباب اور مالوہ کی حفاظت کا انتظام کیے بغیر واپس لوٹ آیا۔7

یہ شاہی مہمات نقطۂ عروج کو 35-1734ء میں پہنچ گئیں جبکہ وزیر اعظم قمر الدین خاں اور بخشی الممالک خان دوراں کی سرکردگی میں دو زبردست افواج مرہٹوں کو نرمدا کے پار پسپا کرنے کے لیے روانہ کی گئیں۔ خان دوراں کے ساتھ تمام راجپوت بشمولیت

جے سنگھ ایسے سنگھ اور ذرجن لال کوئر شامل تھے۔ راجپوتانہ پر ہولکر کے حملہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں تھیں اور 1734ء میں جے سنگھ کے مشورے پر راجاؤں نے مجلس مشاورت طلب کی اور مرہٹوں کے خلاف متحد ہو کر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ 8ء

وزیر کی افواج 25 ہزار اور خان دوراں کی 50 ہزار سے بھی زائد تھیں۔ 9

لیکن یہ زبردست افواج مرہٹوں کے اسپ سوار دستوں کے سامنے دوبارہ بے بس ہو گئیں۔ خان دوراں اور جے سنگھ ٹوڈا ٹیمنک کے مقام پر محاصرہ میں لے لیے گئے اور اپنی افواج سے علیحدہ ہو گئے۔ اب جے پور کو مرہٹوں سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ بالآخر جے سنگھ کے مشورے پر خان دوراں نے صلح کی گفتگو کا آغاز کیا اور مالوہ کی چوتھ کی صورت میں مرہٹوں کو 22 لاکھ روپئے سالانہ دینا منظور کیا۔ 10ء

قمرالدین خان کا نارو کے مقام پر پلا جی جادو سے ہلکا سا مقابلہ ہوا لیکن وہ بھی مرہٹہ افواج کو کوئی قابل لحاظ نقصان نہ پہنچا سکا۔ 10 الف ان مہمات سے ایک بار پھر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مغلوں کے پاس مرہٹوں کے اسپ سوار دستوں کی چابکدستی کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ ناکامی ملک عنبر اور شاہ جی بھونسلے کے وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ مرہٹوں کے اسپ سوار دستوں نے دکن میں منظم مظاہرہ کیا تھا مرہٹوں کی ان پالیسیوں کا اس وقت تک کوئی جواب نہ ہو سکا جب تک کہ روہیلوں کے پیدل سپاہیوں نے تیز بندوقوں سے گولیوں کی بارش نہیں کی۔ یہ جنگی حکمت عملی پہلی بار پانی پت کی جنگ میں نادر شاہ کامیابی سے اختیار کر چکا تھا 11 مغل افواج اپنے لیے چوڑے اسلحوں اور بھاری توپوں کے ذریعہ کسی ایک مقام پر جم کر لڑنے کے لیے ہی نہایت مناسب تھیں۔ ایسی جنگ اگرچہ بڑی مشکلات پیش کرتی تھی لیکن مرہٹوں کے نرمدا پار کرنے سے قبل تک ہی ممکن تھی 1732ء میں مکمل طور پر جنوبی مالوہ میں مرہٹوں کے قیام سے شاہی افواج کے لیے جنگی مسائل نے ایک دوسری صورت اختیار کر لی۔ اب تو ان کو کھلے میدانوں میں حکمت عملی والی جنگ لڑنی تھی جس کے لیے مرہٹوں کی اسپ سوار فوج نہایت کارگزار ثابت ہوتی تھی کیونکہ ان کے ذریعہ وہ مغل توپوں کی رسائی سے دور کے علاقوں میں مغل افواج پر باآسانی آگ برسا دیتے تھے۔ اور ان کے رسل و رسائل اور رسد کے راستے

بند کر دیتے تھے۔ اب صرف کھلے میدانوں ہی میں مرہٹوں کو شکست دے کر مغل مرہٹوں کو مالوہ سے باہر نکال سکتے تھے۔ اور نرمدا کے کنارے کنارے اپنے دفاع کو مضبوط کر سکتے تھے۔ مغلوں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا اور اس لیے انھوں نے دیکھا کہ مالوہ میں زبردست افواج کو بھیجنا مرہٹوں پر بہت زیادہ اثر انداز نہ ہو سکا اور اس کے نتیجہ میں یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ راجپوتانہ اور دہلی تک کے علاقے مرہٹوں کی زد میں آگئے ہیں۔

دربار میں امن پسند اور جنگ پسند گروہ

مندرجہ بالا حالات میں دو مختلف پالیسی کی حمایت کرنے والے دو متضاد گروہ دربار میں منظر عام پر رونما ہوئے۔ خان دوراں اور جے سنگھ کی سرکردگی میں ایک گروہ تو مرہٹوں کے ساتھ امن کا خواہش مند تھا۔ دوسرا گروہ قمر الدین خاں اور سعادت خاں کی سربراہی میں نظام کی مدد لے کر اور زیادہ بہتر تیاری کے ساتھ جنگ کو جاری رکھنے کی حمایت میں تھا۔ محمد سر بلند خاں اور روشن الدولہ بھی جنگ کے حامی تھے۔ 12 تین سال کی مہم کے نتیجہ میں صرف جے سنگھ کے 1733 والے چوتھ کی ادائگی کے معاہدہ کی توثیق ہو سکی۔ سعادت خاں نے جے سنگھ پر دھوکہ دہی کا الزام لگایا اور اس کو اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ دینے اور ان کی ہم نوائی کرنے کا اتہام لگایا گیا۔ مرہٹوں کے ساتھ خفیہ طور پر دوستی کر کے جے سنگھ نے حکومت کو تباہ کر دیا ہے، یہ سعادت خاں کے الفاظ تھے۔ "مجھے صرف آگرہ اور مالوہ کی صوبہ داری دیدیجئے مجھے اس کے لیے روپیہ پیسہ درکار نہیں" جے سنگھ تو کروڑوں طلب کر سکتا ہے لیکن مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا خزانہ خود ہی معمور ہے۔ نظام میرا دوست ہے وہ مرہٹوں کے نرمدا کے پار اترنے میں مزاحمت کرے گا۔ 13

وہ جب خود شہنشاہ، خان دوراں اور جے سنگھ کی غلطیوں پر احتجاج کرنے میں شامل ہوا تو خان دوراں نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کو جنگ کے ذریعہ پوری طرح دبایا نہیں جا سکتا۔ البتہ گفت و شنید کے ذریعہ پیشوا یا اس کے بھائی کو جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہونے پر مائل کیا جا سکتا ہے اگر اس کی مانگیں قبول کر لی جائیں تو آئندہ

مستقبل قریب میں شاہی سرحدوں پر کسی طرح کی بدامنی نہ ہوگی۔ لیکن اگر سعادت خاں اور نظام مل گئے تو وہ کسی نئے حکمراں کو تخت نشیں کر دیں گے۔" ج ا۔ الف

خان دوراں اور جے سنگھ کھلے طور پر اس رائے کے تھے کہ مرہٹوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا آسان نہ تھا اس لیے ان کے ساتھ امن پسندی کی پالیسی کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار نہ تھا۔ انھوں نے شہنشاہ کے خدشات کو ہوا دی کہ اگر ان کے اختیار میں بڑی تعداد میں شاہی افواج دے دی گئیں تو سازشیں کر کے بااثر امرا کسی نئے حکمراں کو تخت نشیں کر دیں گے۔ اس طرح انھوں نے امن کی بات چیت شروع کرنے کے لیے شہنشاہ کی اجازت حاصل کر لی۔ انھوں نے نظام الملک کے ارادوں کی طرف سے شہنشاہ کے خدشات کو اور تقویت پہنچائی یقیناً نظام کی پیچیدہ حکمت عملی کو سمجھنا دشوار تھا اور اس کی یقین دہانی پر اعتماد کرنا بھی سخت مشکل تھا۔ اس نے 1725ء اور 1728ء میں مرہٹوں سے دوستی کر لی تھی اور دونوں دفعہ ان کو دھوکہ بھی دیا تھا۔ 1731ء میں اس نے محمد خاں بنگش کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف ایک مشترکہ مہم کی تجویز رکھی تھی لیکن 1732ء میں اس نے باجی راؤ کے ساتھ صلح کر لی تھی۔ اور پہلے کی طرح وہ اس صلح نامہ کو توڑنے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔

1735ء میں وہ برہان پور تک وزیراعظم کے ساتھ مالوہ والی مہم میں شریک رہا۔ اس کی کمک کے لیے اس نے پانچ ہزار سوار بھی روانہ کیے اور پلاجی سے واپس جانے کے لیے بھی زور دیا۔[14] دربار میں ان تمام امور کا ہر ایک علم تھا، پھر بھی نظام پر کسی کو بھروسہ نہ تھا۔[15] سعادت خاں بھی اس سے بدگمان تھا اگرچہ اس کی اس کے ساتھ خط و کتابت بھی تھی۔

اب ان دو قسم کی متضاد تجویزوں کے حامیوں میں ایک طویل کشمکش شروع ہو گئی۔ پہلے تو شہنشاہ "جنگ کے حامیوں" کی طرف مائل ہوا۔ ابھے سنگھ وزیر کا ہم خیال بن گیا او۔ مرہٹوں کے وکیل نے بتایا کہ قمرالدین خاں کو آگرہ، مالوہ یہاں تک کہ گجرات بھی دے دیتے جائیں اور دو زبردست افواج روانہ کی جائیں۔ اگر جے سنگھ نے ساتھ نہ دیا تو اس کے علاقوں میں لوٹ مار کی جائے اور حکم عدولی کی اس

کو سزا دی جائے۔ ندیوں کے پایاب ہو جانے پر شہنشاہ بہ نفس نفیس میدان میں اترنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جے سنگھ اور خان دوراں کو جے پور کے راستہ سے دکن بھیجا جاتا تھا اور وزیر اعظم اور ابھے سنگھ اور سعادت خاں گوالیار کے راستے سے روانہ ہونے تھے [16] محمد خاں بنگش سے بھی جو اس وقت فرخ آباد میں خانہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا، جاگیریں اور دوسری مراعات کے وعدوں کا یقین دلا کر، جمنا کے گھاٹوں کو مرہٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے افواج اکٹھا کرنے کے لیے کہا گیا۔[17]

جنگ کی حامی جماعت کا سد باب کرنے کے لیے 34-1733ء اور 35-1734ء میں پیشوا نے ایک چال چلی۔ اس کی ماں شمالی ہندوستان کی طرف یاترا کے ارادہ سے روانہ ہوئی وہ تمام بڑے بڑے راجاؤں کی راجدھانیوں میں گئی اور اس موقعہ پر مرہٹہ وکیلوں نے ان کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کر لیا۔ جے سنگھ اور بندیلے دوستانہ تعلقات کی طرف مائل تھے ہی۔ مہاراجہ اودے پور کچھ مذبذب تھا اور ابھے سنگھ کا رخ غیر یقینی تھا۔ جے سنگھ نے پیشوا کو شمالی ہندوستان آنے کی دعوت دی اور اس کے تمام اخراجات کو جو پانچ ہزار روپے روزانہ ہوتے تھے، برداشت کرنے کا وعدہ کیا اور مالوہ کی چوتھ دلوانے کا بھی یقین دلایا۔ اور اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری میں اس کے تمام مطالبات کا تصفیہ کرانے کے لیے اس کو شہنشاہ کے روبرو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔[18]

جے سنگھ کا باجی راؤ کو شمالی ہندوستان کے لیے دعوت دینا بہت سے مصنفین کی نظر میں ایک باغیانہ عمل تھا اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ شاید جے سنگھ دہلی کے خلاف ایک مشترکہ منصوبہ بنانا چاہتا تھا۔[19] لیکن یہ خوب ظاہر ہے کہ جے سنگھ نے باجی راؤ کو ایک امن کی تجویز کے لیے بلایا تھا کیونکہ اس نے اس کو صرف پانچ ہزار سواروں کے ساتھ آنے کو کہا تھا اور مرہٹہ وکیل سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کی آمد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو پیشوا کوئی بھی پسندیدہ راستہ یعنی جنگ کا راستہ اپنا سکتا تھا۔[20] اس طرح اس سے قبل کی جنگ کے شعلے حکومت کے پایۂ تخت تک پہنچنے لگیں جے سنگھ کی امن کے لیے یہ آخری کوشش تھی۔ ظاہر ہے کہ جے سنگھ کا خیال تھا کہ اگر پیشوا شمالی ہندوستان میں بذات خود آ گیا تو شہنشاہ سے اس کا کسی تصفیہ پر پہنچ جانا اس سے زیادہ آسان ہے کہ درمیانی لوگوں کے ذریعہ مہاراشٹر میں بیٹھ کر

سفت وشنید کرتا رہے۔ 1735ء و 1736ء میں شمالی ہندوستان میں باجی راؤ کی آمد یقیناً اگر دربار کی اجازت سے نہیں تو اس کے علم میں ضرور تھی کیونکہ اس سال شاہی افواج نے مرہٹوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا [21] جنوری 1736ء میں جیسے ہی پیشوا نے نرمدا کو پار کیا۔ مرہٹہ افواج کے اخراجات کے لیے خان دوراں کے توسل سے فوراً روپیہ دربار سے فراہم ہونا شروع ہوگیا [22] اکتوبر 1735ء میں پیشوا دکن سے روانہ ہوگیا۔ نومبر کے آخر تک اس نے نان دربار کے مقام پر تاپتی کو پار کیا اور جنوری 1736ء میں وہ میواڑ کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ اور بانسواڑہ پہنچا۔ فروری کے پہلے ہفتہ میں وہ اودے پور پہنچا اور وہاں اس کا راجہ جے سنگھ کے دیوان اور سفیروں نے استقبال کیا۔ دربار سے روانہ شدہ امن کے سفراء بھی جلد ہی وہاں پہنچ گئے [23] 14 مارچ کو بھامولاؤ کے مقام پر جے سنگھ کی پیشوا سے پہلی ملاقات ہوئی اور وہ کئی دن تک اس کی ہمراہی میں رہا [24] مرہٹوں سے امن کی تجویز میں خود جے سنگھ کا اپنا ایک ذاتی مقصد بھی تھا۔ وہ مغلوں کی طرف سے مطمئن نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ مالوہ میں اس کے استحکام کے لیے پیشوا کی دوستی لازمی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ مالوہ اور آگرہ کے صوبے مستقل طور پر اس کے تصرف میں آجائیں [25] اس طرح وہ سعادت خاں اور نظام الملک کے اتباع میں اپنے لیے ایک علیحدہ علاقہ نکال لینا چاہتا تھا۔

1736ء میں قیام امن کے لیے بات چیت

فروری سے لے کر جون 1736ء تک خان دوراں اور جے سنگھ کے توسط سے شہنشاہ اور پیشوا کے درمیان مستقل طور پر مذاکرات ہوتے رہے۔ ان پیچیدہ مذاکرات کا احاطہ کرنا دشوار ہے کیونکہ یہ تین مختلف مراکز یعنی دہلی، جے پور اور پیشوا کے پڑاؤ سے متعلق ہیں۔ اور ان میں متعدد قسم کے درمیانی لوگ شامل رہے۔ ان مذاکرات کا تعلق متعدد موضوعات سے رہا۔ لیکن ان طول طویل اور پیچیدہ مذاکرات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ... مذاکرات ... دربار میں جے سنگھ اور خان دوراں

کے اثرات کو کمزور رکھتے تھے۔ جنگ کی حامی جماعت مستقل طور پر مخالفت میں اڑی ہوئی تھی۔ نظام طرح طرح کی چالیں چل رہا تھا۔ پیشوا کے مطالبات بھی حد سے گذرے ہوئے تھے اور وہ بذات خود دربار میں حاضر ہونا اور "مغلوں" یعنی جنگ کی حامی جماعت کے ہاتھوں میں پڑنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ مرہٹہ وکیل نے بھی راؤ کو خبردار کر دیا تھا۔ کہ تمام مغل ایک طرف ہو گئے ہیں۔ خان دوراں اور جے سنگھ اور چند دوسرے سردار دوسری جانب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سعادت خاں اور قمر الدین ان کے شکست کھا جانے تک ان کے فیصلوں پر عمل درآمد نہیں ہونے دیں گے۔ مغل ناقابل اعتماد، پرفریب اور بے وفا ہیں۔ 26 باجی بھیو راؤ نے بھی لکھا "دہلی میں مغلوں نے ایک وفاق بنالیا ہے خان دوراں اور جے سنگھ شہنشاہ کے ساتھ ہیں نظام کے جاسوسوں کی آمد و رفت شب و روز جاری ہے۔ نظام الملک کے مشورے پر قمر الدین، روشن الدولہ، سعادت خاں اور ابھے سنگھ نے ایک وفاق بنالیا ہے اور آپ کو کامیاب نہ ہونے دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ آپ ان پر اعتماد کر کے دہلی کا رخ نہیں کر سکتے۔ جب آنجہانی بالاجی دہلی گئے تھے تو سید قابل اعتماد تھے اور شنکر جی درمیان میں تھا۔ مغل بالکل بے اثر تھے اور نظام اپنے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ آج وہ اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور ان کی طاقتیں مضبوط اور متحد ہو چکی ہیں۔ 27

باجی راؤ نے اپنے وکیل دھونڈو مہادیو کے توسط سے اپنے مطالبات پیش کیے 28 اس نے اپنے لیے شاہی حکومت کے تحت ایک موروثی علاقے کا اور اپنے اور اپنے سرداروں کے لیے منصبوں اور جاگیروں کا مطالبہ کیا 29 اور اپنی فوج کے خلاف عداوت پسندی کے رجحانات کو ختم کرنے کو کہا اس نے جنگ کے اخراجات کے بطور 13 لاکھ زر ضمانت طلب کیا اور سال رواں کے لیے 20 لاکھ بطور چوتھ کے مانگا۔ 31 اس نے مالوہ کی صوبہ داری اور شہنشاہ کی تحویل میں لیے ہوئے قلعہ کو چھوڑ کر اس کے تمام علاقوں پر اختیار بشمولیت جاگیر داروں کی زمین اور پرانے باج گزاروں اور بے محصول زمینوں اور اخراجات روزآنہ اور باقی تمام زمیندار جو کہ صرف مرہٹوں کو مال گذاری دے کر ہی اپنی جگہ قائم رہ سکیں گے۔ یہ سب طلب کیا۔ 32

پیشوا نے بندیل کھنڈ کے سرداروں سے خراج وصول کرنے کا اختیار بھی مانگا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم مطالبہ یہ تھا کہ دکن کے سردیش پانڈے کا موروثی عہدہ بھی پیشوا کو دیا جائے۔ اس عہدے سے وابستہ دکن کے محصول مال گذاری کا پانچ فیصد اور کچھ غیر واضح انتظامی امور سے متعلق مطالبات بھی تھے 33

ان تمام مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا۔ یادگار خاں جس کو خان دوراں کی فہم وفراست کی کنجی 34 کہا جاتا تھا مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری کا فرمان لے کر ان صوبوں پر بزور تلوار قابض ہو چکا تھا اور بندیل کھنڈ کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے کے حق کا پروانہ بھی اسے عطا کیا گیا۔ 35 پھر بھی کوئی فیصلہ کن سمجھوتہ نہ ہو سکا 36 اس کی خاص وجہ اس وقت دکن سے متعلق باجی راؤ کے نہایت دوررس مطالبات تھے۔ پیشوا نے خاندیش اورنگ آباد اور بیجاپور میں پچاس لاکھ کی جاگیر کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ولی عہد کو دکن کا گورنر مقرر کیے جانے کے ساتھ ساتھ خود کو اس کا نائب حکمران بنائے جانے کا مطالبہ بھی پیش کر دیا تھا۔ تمام انتظامی امور خود پیشوا کے ذریعہ انجام پذیر ہونے تھے اور دکن میں جو زاید محصول و مال گذاری وصول کی جائے اس میں سے نصف کا حصہ دار خود پیشوا ہوتا۔ 38 اس طرح باجی راؤ نے دراصل دکن کو اپنے تصرف میں لے لینے کا مطالبہ کیا تھا 39 ایک دوسری یادداشت میں مالوہ اور بندیل کھنڈ سے متعلق مطالبات بھی پیش کیے گئے تھے اس میں بھوپال سے یار محمد خاں کی بیدخلی مانڈو دھار اور رائے سین کے قلعوں سے دست برداری اور مکمل مالوہ بشمولیت ریاستہائے قلعہ کے بطور جاگیر کے زیر تحویل لینے کے مطالبات بھی شامل تھے۔ پیشوا نے ہندوؤں کے مذہبی مراکز یعنی پریاگ، بنارس، متھرا اور گیا کو بھی بطور جاگیر کے مانگا تھا۔ شہنشاہ یار محمد خاں کے اخراج پر تو راضی ہو گیا تھا لیکن باجی راؤ کے شہنشاہ کے حضور میں آنے کی صورت میں اس کے خاندان کی حفاظت کے لیے صرف ایک قلعہ سے زیادہ دینے پر راضی نہ ہو سکا۔ 40

ان مطالبات نے شہنشاہ کو عجیب کشمکش میں ڈال دیا۔ وہ پیشوا کو دکن پر سردیش پانڈے کا اختیار دینے اور اس طرح نظام اور اس کے درمیان مخاصمت

کو ہوا دینے کے لیے تو تیار تھا لیکن ،وہ تمام وکمال دکن اس کے حوالے کرنے پر رضامند نہ تھا۔ اس تمام عرصہ میں مستقل طور پر نظام الملک کی طرف سے شہنشاہ روزانہ مراصلات وصول ہوتے رہے جن میں شہنشاہ سے ثابت قدم رہنے اور مرہٹوں کے خلاف اس کی مدد کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔[41] مالوہ اور گجرات کو مرہٹوں سے بچانے کی کچھ نہ کچھ امید شہنشاہ کے رجحانات پر اثر انداز ہوئی اگرچہ شہنشاہ دیر تک ایک ارادہ پر کبھی قایم نہ رہتا تھا۔ بہرحال باجی راؤ کے مطالبات حد سے زیادہ متجاوز تھے اور انھیں مطالبات نے شہنشاہ کو جنگ کے حامی گروہ اور نظام الملک کی طرف راغب کر دیا باجی راؤ مالوہ میں مئی کے آخر تک اپنے مطالبات کے جوابات کے انتظار میں وقت گنواتا رہا اور پھر بالآخر دوسرے سال اپنے مطالبات کو منوانے یا سلطنت کے اندر داخل ہوکر جنگ کرنے کے ارادے سے مہاراشٹر لوٹ گیا۔[42]

خان دوراں باجی راؤ کے شہنشاہ کے حضور میں آنے اور اس کی ملازمت سے وابستہ ہو جانے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے دوسرے سال بھی اس کو آنے کی دعوت دی۔ اس نے یقین دلایا کہ اجین کے مقام پر اخراجات کے پانچ لاکھ کی پہلی قسط ادا کی جائے گی اور آگرہ میں اسے جے سنگھ اور امیر خاں ملیں گے جو اسے شہنشاہ سے کسی سواری کے دوران (یعنی دربار میں نہیں) ملا دیں گے 43 جے سنگھ نے پیشوا کو دستی خط لکھ کر بوندی اور خود اس کے علاقے پر فوج کشی نہ کرنے کی درخواست کی۔ 44

دوآب پر مرہٹوں کے حملے

باجی راؤ شہنشاہ کو ناراض نہ کرنے اور اس کے اعزاز واحترام کو ٹھیس دلگانے یا مغل حکمران کی بجائے ہندو یا مرہٹہ حکمراں کو تخت نشین کرنے کا خواہش مند نہ تھا۔[45] اگرچہ مرہٹے اکثر ہندو۔ پد۔ پادشاہی کی گفتگو کرتے تھے لیکن پیشوا یہ بھی جانتے تھے کہ وہ تیموریوں کو معزول کر کے اس کی جگہ کوئی مرہٹہ یا راجپوت حکمران مقرر نہ کر سکتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے خلاف پورا ہندوستان متحد ہو سکتا

تھا 46 اسس لیے پیشواؤں کا مقصد آل تیمور کو تاج وتخت کا مالک رکھ کر ان کی حشمت وجلال اور ان کے نام کی عظمت کے سائے میں پورے ہندوستان پر اپنا سیاسی تسلط قایم کرنا تھا. گویا باجی راؤ کے فوری مقاصد مالوہ اور بندیل کھنڈ پر اپنی فتوحات اور اسس کے نواح پر اپنے قبضے کی شاہی توثیق وتصدیق حاصل کرنا اور شہنشاہ کی اجازت سے پورے دکن پر قابض ہونے کے...... علاوہ کچھ اور متفرق مطالبات بھی تھے جو 1736ء میں پیش کیے گئے تھے۔ ایک قابل ذکر مطالبہ ایک خطیر نقد رقم کا تھا جس کے ذریعہ پیشوا اپنے گرانقدر قرضوں کی ادائیگی کر سکے۔ لیکن ان مقاصد کا حصول اسس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ دربار میں "جنگ" کی حامی جماعت کی شکست یا معزولی نہ ہو جاتی۔ اسس مقصد کے پیش نظر 1736ء میں دسہرہ کے دن پیشوا دکن سے روانہ ہوتا کہ دوآب پر حملہ آور ہو کر شہنشاہ پر اپنی فوجی برتری کا مظاہرہ کر سکے۔

فروری 1737ء تک پیشوا آگرہ تک پہنچ چکا تھا دہلی میں جنگ کی حامی جماعت نے زبردست تیاریاں کر رکھی تھیں۔ دو فوجیں ایک قمرالدین خاں اور دوسری خان دوراں کی سربراہی میں روانہ ہوئی تھیں۔ سعادت خاں اور راجہ جے سنگھ کو آگرہ میں آکر مل جانا تھا۔ تب اسس مشترک اور متحدہ فوج کو مرہٹوں کے خلاف فوج کشی کرنی تھی۔ محمد خاں بنگش بارہ ہزار سوار لے کر خانِ دوراں کے ساتھ شامل ہو ہی چکا تھا۔ 47

پیشوا کے لیے ساتھ اسس مہم کا آغاز کچھ سازگار نہ ہوا۔ دوآب میں ہل کر یہ حملہ کر کے سعادت خاں نے مرہٹوں کو سخت نقصان پہنچا کر پیچھے پسپا کر دیا تھا۔ شاہی فوجیں آگرہ پر آکر ملنے والی تھیں اسس لیے باجی راؤ کو تیزی سے اقدام کرنا تھا۔ ایک شدید حملہ کا فیصلہ کر کے وہ مغل افواج سے تیزی سے بچتا ہوا اچانک دہلی پہنچ گیا۔ اس کا مقصد شہنشاہ کو نقصان پہنچانا یا دہلی کو لوٹ کر خود کو دشمن ثابت کرنا نہ تھا بلکہ خود اسس کے الفاظ کے مطابق "وہ تورانیوں کے غرور کو توڑ کر اور شہنشاہ کو اس کی طرف مائل کرنا چاہتا تھا چنانچہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اور شہنشاہ کو تین روز تک اپنے رحم وکرم پر رکھ کر پیشوا واپس لوٹ گیا" 48

باجی راؤ جنگ کی حامی جماعت کو شکست دینے کے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ شہنشاہ سعادت خاں پر نہایت غضبناک ہوا اور یہ کہا کہ اسس کا ہولکر کے ساتھ

جنگ کرنے میں جلدی کرنا ہی دہلی پر حملہ کا باعث ہوا۔ سعادت خاں نے یہ گزارش کی کہ اگر اس کو آگرہ، مالوہ، گجرات اور اجمیر دے دیئے جائیں تو وہ مرہٹوں کی پیش قدمی کو روک دے گا لیکن اس کی اس مکرر یقین دہانی کو ٹھکرا دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ بغیر شہنشاہ کی ملاقات کا شرف حاصل کیے ہوتے اپنے منصبی عہدہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے روانہ ہو جائے 49 لیکن باجی راؤ شہنشاہ کو اپنے ساتھ امن قایم کرنے کے لیے مائل کرنے میں ناکام ہوگیا۔ اس کے حملہ سے ایک زبردست ہلچل اور بیداری پیدا ہوگئی۔ اب شہنشاہ امن کی پیش کشوں سے بیزار ہوکر نظام الملک کی عرض داشتوں کو سننے پر اور بھی مائل ہوگیا اور مو اخر الذکر کو دربار میں طلب کرنے کے فرمان جاری کر دیئے گئے 50

اس طرح باجی راؤ پھر اپنے پرانے حریف نظام کے مد مقابل آکر کھڑا ہوگیا۔ اب کسی بات کا اس وقت تک اقدام نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ ان دو حریفوں کے مسئلہ کا مستقل طور پر فیصلہ نہ ہو جائے۔

بھوپال کی جنگ

نظام الملک شمالی ہندوستان کی طرف مرہٹوں کی نقل و حرکت کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ مرہٹوں اور دہلی دربار کے مابین طاقت کا ایک توازن قایم کرنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی حکومت کے خلاف مرہٹوں کو بھڑکا کر اپنے لیے کچھ مہلت حاصل کر لینے میں بھی گریز نہ کرتا تھا۔ لیکن نظام الملک شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کی طاقت کے استحکام کا خواہش مند تھا 17.35ء تک مرہٹوں نے اپنی کامیابی حاصل کر لی تھی کہ شمالی ہندوستان کے اہم علاقوں پر ان کا اثر قایم ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ 17.36ء کے معاہدہ سے نظام الملک ناخوش تھا کیونکہ اس کو خوف تھا کہ شہنشاہ اس کی قیمت پر مرہٹوں کی دوستی کو خرید سکتا ہے۔ اس کے یہ خدشات بے جا نہ تھے کیونکہ 17.36ء کے معاہدہ میں پیشوا کو دکن کے چھ صوبوں میں سردیش پانڈے اور شاہی نائب حکمراں کو مقرر کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس لیے نظام دہلی دو مقاصد لے کر پہنچا اول دکن میں اپنا استحکام دوم شمالی ہندوستان اور دہلی دربار میں مرہٹوں کے

بڑھتے ہوئے اثرات کی روک تھام۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے کچھ مزید مراعات بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گر شاہی افواج کی مدد سے وہ مرہٹوں کو شکست دے سکتا تو وہ ہندوستان کا صحیح معنوں میں حکمراں بن سکتا تھا۔

چنانچہ اب مرہٹوں اور نظام الملک کے درمیان کی کشمکش دراصل شمالی اور جنوبی ہندوستان پر تسلط کی کشمکش تھی۔ بہر حال باجی راؤ ان حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ لیکن خود اس کے لیے یہ جنگ شمالی ہندوستان سے زیادہ جنوبی ہندوستان پر تسلط جمانے کی جنگ تھی۔ اس نے اپنے بھائی چمناجی کو بھوپال کی 1732ء کی جنگ کے موقع پر تحریر کیا کہ اگر ایک ایک مرہٹہ اس جدوجہد میں شامل ہو جائے تو فقط ایک متحد کوشش ہی ہم کو دکن کا خودمختار حکمران بنا سکتی ہے۔ اس کے خطوط میں یہ عبارت بار بار دہرائی گئی ہے کہ اگر نواب نظام الملک کا کوئی انتظام کر لیا جائے تو جنوبی ہند کو مکمل خطروں سے آزاد کرایا جا سکتا ہے۔"51

نظام الملک کے دہلی پہنچنے سے قبل، اس کو مرہٹوں کو پسپا کر دینے کی شرط پر آگرہ اور مالوہ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرہٹوں کے خلاف مہم کی کامیابی پر، الہ آباد گجرات اور اجمیر کے صوبوں کو نظام کے احباب اور اس کے نامزد لوگوں کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ 52 یہ بالکل واضح تھا کہ شہنشاہ کے لیے اب ان دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے زیر اثر آئے بغیر چارہ نہ تھا جب تک کہ کوئی غیر متوقع موافق حالات ہی پیدا نہ ہو جائیں۔

نظام الملک 12 جولائی 1737ء کو دہلی پہنچا۔ اس کا شاہانہ استقبال ہوا۔ ماہ اگست میں اسے باجی راؤ کے جگہ پر قانونی طور پر مالوہ کا صوبہ دار بھی مقرر کر دیا گیا۔ بارش ختم ہونے پر وہ مالوہ کی طرف بڑھا اس عزم مصمم کے ساتھ کہ مرہٹوں کے مرض کا پورا پورا علاج کر دیا جائے۔" اس کے پاس 30 ہزار فوج تھی اور بندیل کھنڈ اور راجپوتانہ کے ان حکمرانوں کے فوجی دستے بھی تھے جو بادل ناخواستہ اس کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ 53

پیشوا نے اس کا مقابلہ 80 ہزار افواج سے کیا۔ نظام کو دکن سے اور سعادت خاں سے کمک ملنے کی توقع تھی۔ صفدر جنگ کی سربراہی میں ایک دستہ آکر ضرور شامل

ہو گیا لیکن مرہٹہ افواج دکن کے دستوں کے نظام کے ساتھ شامل ہونے میں حائل ہو گئیں ان حالات میں نظام کی بھاری اسلحہ اور آہستہ آہستہ چلنے والی فوجیں مرہٹوں کی بھاری تعداد والی فوجوں سے گھر کر بھوپال میں محصور ہو کر رہ گئیں۔ اس سے قبل بھی یہ کہانی دہرائی گئی تھی کہ آہستہ چلنے والی شاہی فوجیں مرہٹوں کی تیز قدم اور ہلکے اسلحہ والی فوجوں کے خلاف کامیاب نہ ہو سکیں تھیں۔ نظام کی حالت راجپوت مددگاروں پر شبہ کرنے سے اور بھی خراب ہو گئی۔ م 54

وہ صرف گھونگے یا کچھوے کی رفتار سے چل سکتا تھا اس سے زیادہ تیزی سے وہ آگے بڑھ نہیں سکتا تھا اور نہ میدان میں آکر لڑ ہی سکتا تھا اور اس کی رسد بھی ختم ہوتی جا رہی تھی دوسری جانب مرہٹے نظام کے زبردست اسلحہ کے سبب اس پر دھاوا بھی نہ بول سکتے تھے اس لیے گفت وشنید کا راستہ نکالا گیا اور بہت کچھ سودے بازی کے بعد 7 جنوری 1739ء کو نظام الملک مندرجہ ذیل شرطوں پر راضی ہو گیا۔

(1) (پیشوا کے لیے) مالوہ کی صوبہ داری اور اس پورے علاقہ کا اس کے لیے جاگیر تصور کیا جانا۔

(2) نرمدا اور چنبل کے درمیان کے علاقہ کی خودمختاری اور سپردگی (مرہٹوں کے حق میں)

(3) نظام مندرجہ بالا شرائط کے لیے شہنشاہ سے توثیقی فرمان حاصل کرے اور جنگی اخراجات کے لیے 50 لاکھ کی کسی نہ کسی طرح فراہمی۔ نظام اپنے حالات کے مطابق اس رقم کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا بشرطیکہ شہنشاہ ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ م 55

اس طرح بھوپال کے صلح نامہ کے بعد سے باجی راؤ نے 1736ء میں شہنشاہ کو پیش کی گئی اہم شرائط کی توثیق حاصل کر لی بجز ان شرائط کے جن کا تعلق دکن سے تھا۔ مالوہ اور بندیل کھنڈ کو تو سپرد کر ہی دیا گیا اور وہ پچاس لاکھ جو باجی راؤ نے بنگال کے خزانے سے مانگے تھے، اب شہنشاہ کے ذمہ ان کو بھی کسی خزانے سے ادا کیا جانا تھا۔ مرہٹے اس سے بھی زیادہ مانگ سکتے تھے لیکن جیسا کہ باجی راؤ نے چمناجی کو لکھا تھا "چونکہ نظام بھاری اسلحہ سے لیس تھا اور بندیلے اور راجپوت اس کے بڑی حد تک مددگار تھے میں نے تمہاری صلاح کو قبول کیا اور جن شرائط کو میں

منوا سکتا تھا ان سے کم پر ہی راضی ہو گیا۔ 56

حکومت کے سب سے زیادہ قوی اور با اثر سپہ سالار کی شکست کے بعد یہ زیادہ ممکن اور غالب تھا کہ شہنشاہ خود مالوہ اور بندیل کھنڈ کی سپردگی پر خاموش ہو کر بیٹھ جاتا اور نظام الملک کے کیے ہوئے معاہدہ کو توثیق کر دیتا خصوصاً جب کہ جے سنگھ اور خان دوران اس قسم کے معاہدے کے لیے ایک مدت سے کوشاں تھے۔ لیکن اس کے بعد کیا صورتِ حال وجود میں آئی اس کا تصور ممکن نہیں ہے شاید باجی راؤ مالوہ کو مستقر بنا کر دوآب پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا لیتا یا شاید وہ شہنشاہ سے صلح کر لیتا اور اپنے منصوبوں کو دکن میں پورا کرنے کی کوشش کرتا یعنی دکن پر مکمل تسلط جما لیتا اور متعلقہ صوبوں کی نظامت کو بھی اپنی طرف منسوب کرا لیتا۔ 57 اب جلد یا بہ دیر مکمل ہندوستان مرہٹوں کے تسلط میں آتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اس ممکن و غالب صورت حال کو نادر شاہ کے حملے نے ایک نئی سمت پر ڈال دیا یہ حملہ متعدد مشاہدین کی نظر میں قہر خداوندی سے کم نہیں تھا اس لیے کہ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحدوں کو وہ مغل طاقت کے سبب ناقابل تسخیر سمجھے ہوئے تھے۔

مرہٹوں کے لیے نادر شاہ کا حملہ اس میدان میں دخل اندازی بن کر ثابت ہوا جہاں پر مرہٹے اپنا تسلط جمانے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور نادر شاہ ہندوستان میں قیام پزیر ہو کر، چغتائیوں کی جگہ کسی نئی نسل کی حکمرانی کی بنیاد ڈالنے والا تھا اور یہ افواہیں بھی تھیں کہ وہ خود کو شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان کر کے جنوبی ہند پر حملہ آور ہونے کا بھی ارادہ رکھتا تھا تو اس کا یہ منصوبہ مرہٹوں کے ارادوں کے لیے ایک صدمۂ عظیم ثابت ہوتا اور نرمدا سے آگے بڑھ کر ان کی نئی فتوحات کا راستہ رک جاتا۔ ان حالات میں ایک نئے طریقۂ کار کی سخت ضرورت لاحق ہو گئی۔ شاہو نے باجی راؤ کو شہنشاہ کی کمک کے لیے جلد از جلد اقدام کرنے کی صلاح دی اور اورنگ زیب کو دی ہوئی اس ضمانت کے پیش نظر کہ جب کبھی شاہی حکومت کو خطرہ لاحق ہوگا ہم ضرور مدد کریں گے۔ 58 راجپوتوں اور بندیلوں کی افواج کا پیشوا کی افواج سے اشتراک کا منصوبہ بھی زیر بحث آیا۔ 59 ناصر جنگ کو خطوط لکھے گئے۔ لیکن مرہٹے

فوج باسین کے محاصرہ میں لگی ہوئی تھی راکھوجی بھونسلے اپنے ہی منصوبوں میں الجھا ہوا تھا۔ دابھاوے مفاہمت سے کترا رہا تھا اس لیے بغیر ایک بھاری فوج کے باجی راؤ نے اقدام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ 60

جب کہ پیشوا کی فوجیں باسین کے محاصرہ میں لگی ہوئی تھیں، نادر شاہ ایران کو واپس چلا گیا۔ اس نے باجی راؤ کو ایک دھمکی آمیز خط لکھنے ہی پر اکتفا کیا اس کو مغل حکمراں کا فرمانبردار رہنے کا حکم دیا ورنہ وہ واپس میں آکر اس کی سرزنش کرے گا۔ باجی راؤ نے بہت سوچ بوجھ کا جواب دیا اور ایک سو ایک مہر بطور نذر کے بھجوا دیں۔ 61

نادر شاہ کے حملے نے دنیا کی نظروں میں مغل سلطنت کی کمزوری کا پردہ فاش کر دیا اور مرہٹے تو ایک مدت سے اس کمزوری سے باخبر ہو ہی چکے تھے لیکن اس سے مؤخر الذکر کی نظر میں بیرونی حملہ کے خدشے کے امکان کا ضرور احساس ہو گیا۔ اس کے سبب سے باجی راؤ نے ایک دلچسپ تجویز سامنے رکھی۔ اس نے تجویز کیا کہ تمام امرا چاہے بڑے ہوں یا چھوٹے وہ سب اپنی فوجوں کو ایک وفاق کی صورت میں ملا کر تیموری حکومت کو ایک بہتر تنظیم کی صورت دیں اور دشمن یعنی بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کریں 62 محمد خان بنگش ان امرا میں تھا جس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی۔ باجی راؤ مالوہ تک پہنچا اور اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ شہنشاہ سے ملنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس نے محمد خاں کو یہ بھی اطلاع دی کہ جادو رائے کو شہنشاہ کے پاس بھیج دیا گیا تھا اور اب وہ امرا میں اختلاف کے ختم کیے جانے کی تجویز کے جواب کا انتظار کر رہا تھا 63 جیسا کہ متوقع تھا کہ باجی راؤ کے منصوبے کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی مرہٹوں کی جانب سے ایک نئے سیاسی طریقۂ کار کا آغاز ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ باجی راؤ کو شہنشاہ کی مفاہمت اور اس کے وزرا شمالی ہند کے اور سربر آوردہ امرا کی مدد کی شمالی مغربی سرحد کی حفاظت کے پیش نظر ضرورت کا احساس ہو چلا تھا اس کے منطقی نتیجہ کی روشنی میں یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ پیشوا کی رہنمائی میں اس نئے طریقۂ کار میں ایک فوجی وفاق کا قیام عمل میں آنا تھا اس میں شامل طاقتوں کی بہت کچھ خود مختاری کی تجویز بھی

شامل تھی اور ساتھ ہی ساتھ اتحاد کی علامت اور بیرونی حملہ کے خطرہ کے دفاع کے مرکز کے طور پر تیموری شہنشاہیت کو باقی رکھنا بھی تھا۔64 اس طرح کے قدیمی اتحاد اور علاقائی آزادی کے مابین ایک توازن کے پیدا کیے جانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

مالوہ اور بندیل کھنڈ کی مکمل سپردگی

نادر شاہ کے حملے کے بڑے دوررس نتائج نکلے جس سے دربار کے مختلف گروہ اثرورسوخ کے اعتبار سے بدلنے لگے۔ سعادت خاں جو کہ مرہٹہ دشمن جماعت کے عمائدین میں سے نہایت اہم تھا دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور نظام الملک اور قمر الدین خاں دونوں محمد شاہ کی نظروں سے گر چکے تھے۔ نظام الملک نے دربار کو خیرباد کہا اور اس نے دوبارہ مرہٹوں سے مفاہمت کر لی۔ 65 مخالف گروہ میں خان دوراں بھی مارا جا چکا تھا۔ اب پرانے امرا میں سے صرف جے سنگھ سوائی ہی اہم ترین شخص رہ گیا تھا۔ 1741ء میں اس کے مشورے سے مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی گئی لیکن اس سے قبل شہنشاہ نے مالوہ اور گجرات کو واپس لینے کی ایک آخری کوشش اور کی اس سے نئے پیشوا بالاجی راؤ کی طرف سے ایک نئے حملے کا مزید خدشہ پیدا ہو گیا۔ 66

جے سنگھ کی وساطت سے جو شرائط آخری طور پر مرہٹوں کے ساتھ طے پائیں وہ تقریباً وہی تھیں جو 1736ء و 1738 میں باجی راؤ نے پیش کی تھیں۔ مالوہ حوالے کر دیا گیا۔ اگرچہ شہنشاہ کے وقار کو بچانے کے لیے اس کو صرف اس صوبے کی نائب صوبے داری سے تعبیر کیا گیا گویا کہ اس صوبہ کا صوبہ دار شہنشاہ کی طرف سے مقرر کردہ شہزادہ تھا جو صرف رسمی طور پر صوبہ دار تھا۔ پیشوا کے منصب میں تمام فوجداری یعنی اس صوبہ پر مکمل اختیارات اور اس کی تمام ریاستوں پر بھی اختیارات شامل تھے۔ چنبل کے جنوب کی تمام ریاستوں سے چوتھ وصول کرنے کے اختیارات بھی قبول شدہ معلوم ہوتے ہیں۔ پیشوا کے 50 لاکھ نقد کے مطالبہ کے عوض بنگال، بہار اور اڑیسہ کی چوتھ بھی اسی کے سپرد کر دی گئی۔ دکن کے سلسلے میں کسی معاہدہ کا پتہ نہیں چلتا شاید اس لیے کہ نظام الملک اور پیشوا دوبارہ اچھے تعلقات قائم کر چکے

تھے۔ 50 لاکھ کی نقد رقم پیشوا کو تین قسطوں میں دی جانی تھی اس کے بدلے میں پیشوا نے یہ تحریری ضمانت دی۔ (1) یہ کہ وہ شہنشاہ سے ملاقات کرے گا (2) یہ کہ مرہٹے نرمدا کے پار نہیں آئیں گے اور اگر کسی گروہ نے ایسا کیا تو وہ خود ذاتی طور پر اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا (3) یہ کہ مالوہ کے علاوہ کسی اور صوبہ میں بدامنی کی صورت پیدا نہ کی جائے گی۔ (4) یہ کہ منظور شدہ رقم سے زیادہ مستقبل میں کوئی مزید رقم نہ مانگی جائے گی (5) یہ کہ ایک مرہٹہ سپہ سالار 500 سواروں کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت کے لیے مقرر کیا جائے گا۔ (6) اور یہ کہ وہ 4 ہزار نفر کی فوج لے کر ہر شاہی مہم میں شریک ہوگا اور اگر اس سے زیادہ کی کمک طلب کی گئی تو اس کا نقد معاوضہ دیا جائے گا۔ 67

ان شرائط کے پیش نظر شہنشاہ اور پیشوا کے درمیان ایک قسم کا تعلق واتحاد تصور کیا جا سکتا ہے۔ مرہٹوں کو دکن میں پوری آزادی دے دی گئی تھی اور اس کے بدلے میں شہنشاہ کے شمالی علاقوں میں بدامنی پیدا نہ کرنا بلکہ ضرورت میں اس کو کمک بہم پہنچانا شامل تھا (بشرطیکہ کسی غیر ملکی حملہ کا خدشہ ہو) اس کے بعد سے ایک معتبر اور معتمد مرہٹہ ترجمان، مہادیو بھٹ ہنگانے دہلی دربار میں رہنے لگا اور شاہی سیاسیات کا ایک با اثر جزو بن گیا۔

مرہٹوں کو آخری طور پر مالوہ اور بندیل کھنڈ کا سپرد کیا جانا مغل مرہٹہ تعلقات کا ایک مرحلہ ختم کر دیتا ہے اور اس کے بعد سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے جب کہ مرہٹوں نے ہندوستان میں اختیار کلی حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور دربار کی سیاسیات اور گروہ بندی کو بڑی حد تک متاثر کرنا شروع کر دیا لیکن اس نئے عہد کا مطالعہ اس کتاب کے سیاق و سباق سے غیر متعلق ہے۔

ضمیمہ الف

کیا 1735ء ، 1736ء میں کسی شاہی مہم کا وجود تھا؟

اروِن جلد 2 صفحات (84 - 283) میں 36-1735ء کے دوران محمد شاہ کے اٹھارہویں سال، ایک شاہی مہم کا ذکر کرتا ہے اور اس کے بعد شہنشاہ نے جے سنگھ کی پیش کی ہوئی اس تجویز کو قبول کر لیا کہ اسے پیشوا باجی راؤ کے حق میں مالوہ کی حکمرانی سے دستبردار ہو جانا چاہیئے۔

سرکار بھی (دیکھئے "افعال علی" (صفحات 78-277) اروِن ہی کا تتبع کرتا ہے۔ ڈاکٹر رگھبیر سنگھ (دیکھئے "مالوہ" کے صفحہ 239 کا فٹ نوٹ نمبر1) کو اس بات میں شک ہے کہ فروری 1736ء میں مذاکرات شروع ہونے کے بعد اس مہم کو روک دیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے اس مسئلہ کو غیر فیصل ہی چھوڑ دیا ہے۔

بہرحال یہ بات بالکل صاف ہے کہ اس سال کسی قسم کی بھی مہم نہ ہوئی ہوگی صرف ایک مورخ آشوب ہے جس نے ایک مہم کا تذکرہ کیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی حالات کی شہادت سے یہ بات واضح ہے کہ دراصل آشوب سترہویں سال کی 1734، 1735 والی مہم کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس کی تفصیلات یا تو خود مصنف کے ہاتھوں یا کسی بعد کے کاتب کے ہاتھوں مخلوط ہو گئی ہیں۔

آشوب 1735ء 1736ء میں یعنی اٹھارہویں سال میں دو مہموں کا تذکرہ کرتا ہے پہلی تو وہ جس میں وزیر قمر الدین خان کی سربراہی میں براستہ میواڑ، پیلاجی گائیکواڑ سے متعدد ٹکراؤ ہوئے (دیکھئے آشوب صفحات 355 ۔ 362) لیکن یہ ناممکن ہے کیونکہ اس سال پیلاجی بیمار تھا اور اس نے شمالی ہند کا رخ کیا ہی نہ تھا (بحوالہ ایس پی. ڈی جلد 22 نمبر 306-309 صفحات 168 - 170 دیکھیے فٹ نوٹ نمبر9 صفحہ 123) اس کے بعد تال کٹورا کے مقام پر ملہر ہولکر کے خلاف جے سنگھ اور خان دوراں کی جنگ کا مفصل ذکر ہے دیکھئے آشوب (صفحات 74-363) یہ دراصل پچھلے سال کی مہم کی طرف اشارہ ہے کیونکہ (1) 1734-1735ء خاص اسی مقام پر اس قسم کی ایک جنگ ہوئی تھی (2) آشوب نے باجی راؤ کی کسی نقل و

وحرکت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ جسے کونکن کے سلسلے میں مشغول دکھایا گیا ہے (3) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جے سنگھ سے چوتھ کے سلسلے میں ایک معاہدہ مکمل کرکے ملہار دکن کو لوٹ گیا (دیکھئے آشوب صفحہ 374) لیکن ہمیں یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ اپریل 1736ء میں ملہار ایک مہم لے کر مارواڑ میں پہنچا اور پوری برسات اسی مہم میں مصروف رہا (4) جنوری میں ہنگاتے جے پور میں جے سنگھ سے ملا (بحوالہ ایس پی۔ڈی نمبر 14 صفحہ 50) فروری میں خان دوراں دہلی میں تھا (جلد 14 صفحہ 56) مارچ میں باجی راؤ جے سنگھ سے ملا (بحوالہ ایس.پی.ڈی نمبر 30 صفحات 22.3 -24) اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر یہ مہم مذکور کب وقوع پذیر ہوئی ہوگی؟

مرہٹوں کی مہموں سے متعلق آشوب کی تاریخیں غیر یقینی ہیں جیساکہ وہ خود (صفحہ 219 پر) کہتا ہے کہ اس کے کاغذات ایک سیلاب کے دوران مخلوط ہو گئے۔ سترہویں سال کے حالات میں (جو کہ صفحات 347 - 353 تک میں اور جن کی تاریخ 1147ھ لیکن جس کو غلط طور پر اٹھارہویں شاہی سال کے تحت درج کر دیا گیا ہے) بندیل کھنڈ میں قمرالدین کی کارروائی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

خان دوراں اور جے سنگھ کی کارروائیوں سے متعلق بیان دفعتاً صفحہ 363 پر ختم ہو جاتا ہے (جو کہ 1148ھ کے تحت درج کر دیا گیا ہے) یہ بالکل واضح ہے کہ آشوب کے وہ بیانات جو صفحہ 347-353 تک میں اور مورخہ 1147ھ میں وہ ایک ہی سال یعنی 1147ھ مطابق 1734ء 1735ء سے متعلق ہیں۔

اس سے ثابت ہے کہ 1735ء - 1736ء میں کسی شاہی مہم کا ثبوت نہیں ملتا۔

ضمیمہ (ب)

بنام شری مہاراج دھراج مرزا راجہ سوائی جی سنگھ جیو مدظلہ العالی

فدوی خانہ زاد پنچولی جگجیون داس بعد ادای تسلیمات و کورنش (جیسا کہ صحیح الاعتقاد خانہ زادوں کا طریقہ چلا آیا ہے) حضور لامع النور ادر قبلہ عالیان کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ اس عریضہ سے قبل عثمان خاں قراول کے پہنچنے کی حقیقی کیفیت اور زبانی تفصیلات آپ کے علم میں آچکی ہوں گی۔ نواب امیر الامرا بہادر نے عثمان خاں کی زبانی تفصیلات کو حضرت ظل سبحانی کے گوش گزار کر دیا۔ حضرت سبحانی بہت زیادہ برافروختہ اور پریشان ہوئے چنانچہ نواب قطب الملک خاندوراں بہادر اور میر جملہ کو تنہائی میں بلایا اور فرمایا کہ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ مرزا راجہ سوای جی سنگھ اظہار بندگی میں صادق ہے عثمان خاں کے بیان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہاراجہ اجیت سنگھ سے متفق ہے۔ اور اس وقت تک حکمت عملی سے بات کو ٹالتا رہا ہے۔ جہاں تک گجرات اور مالوہ اور برہان پور کی صوبہ داری کے بارے میں التماس کا تعلق ہے تو یہ امر ممکن العمل نہیں ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی جانب بھیج دیں اگر یہ درخواست ہم نے قبول کر لی تو اس سے سلطنت میں انتشار پیدا ہو جائے گا حضرت نے امیر الامرا بہادر سے دریافت فرمایا کہ اب تمہاری روانگی میں تاخیر کا سبب کیا ہے! چنانچہ نواب امیر الامرا بہادر کی روانگی کے بارے میں سخت تاکید فرمائی نواب امیر الامر کے ہمراہ جو فوج روانہ کی جائے گی اس کی تفصیل علیٰحدہ آپ کی خدمت میں عرض کی جائے گی۔ نواب امیر الامرا بہادر کی روانگی کے بارے میں بارگاہ شاہی سے سخت تاکید ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ رمضان کے بعد روانگی عمل میں آئے گی۔ فدوی کو نواب صاحب نے بلا کر بھیا تولا رام کی معرفت یہ تمام تفصیلات بتائی ہیں اور یہ حکم دیا کہ اس کو اس طرح قلم بند کیا جائے کہ زبانی اصلاح کا پتہ نہ چلے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ دونوں اصحاب کو ایک ہی جانب صوبہ داری عطا کی جائے۔

ہوا خواہی اور خیر اندیشی کے خیال سے عرض ہے کہ اگر آپ کی رائے ہو اور آپ ارشاد فرمائیں تو لاہور، الہ آباد، اودھ یا بنارس میں سے کسی ایک کی صوبہ داری مہاراجہ

اجیت سنگھ جیو کے نام اور مالوہ یا برہان پور کی صوبہ داری آپ کے نام کے بارے میں نواب صاحب سے عرض کیا جائے لیکن گذارش یہ ہے کہ فدوی کی یہ عرض داشت کسی پر ظاہر نہ ہو۔

یہاں کے حالات کی نوعیت یہی ہے۔ جو آپ کی خواہش ہو اس سے جلد مطلع کیا جائے اور ہر مضمون کا پروانہ الگ الگ روانہ فرمایا جائے تاکہ مناسب موقع پر نواب صاحب کے گوش گزار کیا جائے۔ نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ ہمارے اور مرزا راجہ جیو کے درمیان جو معاہدہ ہو چکا ہے اس میں کسی قسم کے فرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ مردوں کے عہد میں جان ہوتی ہے لیکن عثمان خاں کے زبانی بیان سے اس حقیقت میں نام کے لیے بھی اصلاح نہیں ہوتی۔

سری رانا جیو وسری مہاراجہ اجیت سنگھ جیو نے اپنے دکلا کو لکھ دیا ہے کہ نواب صاحب کی فوج کے ساتھ آجائیں۔ فدوی کو جس طرح حکم ہو گا اس کی پابندی کرے گا اور خانہ زاد دھرام کو روانگی کے بارے میں دربار سے اطلاع ملی ہو گی اس لیے کہ حضرت سبحانی نے سخت تاکید کر دی ہے لہٰذا عنقریب روانگی ہو گی۔ اس سے زیادہ عرض کرنا میرے امکان سے خارج ہے۔

خدا کرے دولت و جاہ کا سورج، خوش بختی اور بزرگی کے مطلع سے ابرالآباد تک چمکتا رہے۔

ضمیمہ ج

بتاریخ ہفتم رمضان سنہ 2 ھجری کیا گیا

فدوی کو جو اس بارگاہ عالی کا خادم ہے، صوبہ مالوہ کے مرہٹوں کی تنبیہ کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم اور بادشاہ کی خوش بختی سے ان کی تنبیہ میں مصروف ہو جاؤں گا۔ عرصہ دراز سے اس جماعت کا تعلق اس مبارک فال صوبہ سے ہے۔ اگر امسال بھاری فوج کی بنا پر ان کو دخل حاصل نہ ہوا یا ان کی تنبیہ ہو گئی تو اس طرح ہر سال ان پر ایک بڑی رقم کا خرچ ہونا ظاہر ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ راجہ ساہو کو جو خلد مکان کے زمانہ سے بندگی کے شرف سے مشرف ہے۔ ان کے بیٹے کس سنگھ

کے نام سے دس لاکھ روپیہ کی جاگیر عطا کی جائے اس شرط کے ساتھ کہ صوبہ مالوہ میں کسی قسم کی شورش نہ ہو گی اور وہاں کے ناظم کی امداد کے لیے تو فوج مہیا کی جائے گی۔ اس صورت میں بادشاہ کا ملک محفوظ ہو جائے گا اور فوج کشی کے مصارف میں بھی کفایت ہو جائے گی اور اگر اس کے باوجود روگردانی کی تو سزا پائے گا۔ مجھے توقع ہے کہ فی الحال اگر کچھ کم یا زیادہ بھی سفر رہو جائے گا تو منظور ہو جائے گا اور آئندہ اہل غرض کی باتوں کی طرف توجہ نہ کرے گا۔

باب نہم

حاشیے

1. بحوالہ جے پور ریکارڈس دیکھئے آیامل کا خط مورخہ 13 اسوج بدی 1789 ہندی مطابق 6 ستمبر 1732ء ہندی خطوط جلد 3۔ نمبر 28 ، 29 صفحات 48 - 51

2. بحوالہ فجستہ کلام مرتبہ صاحب برائے صفحہ 314 - 15، ورشن 321، 22 وار 115، 16

3. بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی۔ جلد 14 نمبر 2، 7، 9 جلد 15 نمبر 6 وجلد 33 صفحات 310۔ 11 وی، وی جلد 2 صفحہ 1218، 12 - 1220

4. بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی۔ جلد 14 نمبر 10، 13، 18 (جلد 14 کی صحیح تاریخ 9 اپریل 1734ء ہے)

5. بحوالہ اقبال صفحہ 194 - 96 ، ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 نمبر 9

6. بحوالہ تاریخ ہندی صفحہ 525 سیر 467 ، ارون جلد 2 صفحہ 279۔ آشوب کے قول کے مطابق دیکھئے صفحہ 286 - 87 جب مظفر خاں مالوہ پہنچا اس نے اپنے خیموں کے چاروں طرف خندقیں کھودلیں اور مرہٹوں کے حملے کا انتظار کرنے لگا لیکن مرہٹوں نے اس کی آرزو کو پورا کرنے سے احتراز کیا اور اس کی بجائے اس نے اس کے پڑاؤ کو گھیر لیا اور اس کی رسد کے راستے بند کر دیئے۔ بالآخر برسات کی آمد پر مرہٹے نرمدا کے پار لوٹ گئے اور مظفر خاں دلی واپس آگیا۔

7. بحوالہ وی۔ وی صفحات 1220 - 21

8. بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی۔ جلد 14 نمبر 22 - 23۔ مرہٹہ وکیل نے دھار نارو اور شیو دیو کے مقام پر جے سنگھ اور خان دوراں کی افواج کا 2 لاکھ سوار اور لاتعداد پیادوں کا اندازہ لگایا تھا اس سنگرہ (ایت چریتی خط نمبر 68) اس تعداد کو پچاس ہزار بتاتا ہے۔ جو زیادہ قابل قبول ہے۔

9. بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 نمبر 23، 21، 29، 27، 24، 26، 57 جلد 22 صفحہ 284، تاریخ ہندی صفحات 526 - 27 آشوب پر مبنی، ارون کا بیان نہایت ہی الجھا ہوا ہے۔ دیکھیے ضمیمہ الف۔ قاسم (بحوالہ مخطوطہ سرکار 385) کا اندازہ ہے کہ مرہٹوں نے خود جے سنگھ کے اشارے ہی پر حملہ کیا تھا۔ جے سنگھ نے نظام پر مرہٹوں کو اکسانے کا الزام

لگایا اور مصنف کے بقول خان دوران کو مرہٹوں سے تصفیہ کر لینے پر آمادہ کیا تاکہ آیندہ مرہٹوں کے حملوں کا مستقل طور پر سد باب ہو سکے۔ چنانچہ سالانہ 22 لاکھ دینا منظور کیے گئے اور ملہار راو بھٹ خان دوراں کے ساتھ دلی تک گیا۔

9-الف بحوالہ تاریخ ہندی صفحات 528-29

10 بحوالہ ایس.پی.ڈی جلد 20 صفحہ 134۔ سربلند خاں کو ایک ہزار دن کے لیے دربار سے خارج کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ ابھے سنگھ کے گجرات کا صوبہ دار مقرر ہونے پر ابھے سنگھ سے غیر قانونی طور پر لڑ بیٹھا تھا (دیکھیے سعادت جاوید مصنفہ ہرنام داس ولیمیٹ جلد 8 صفحہ 340) اب وہ مدت پوری ہونے پر دربار میں واپس آگیا تھا۔

11 بحوالہ ایس.پی.ڈی جلد 14 نمبر 47 محمد خاں بنگش نے بتایا کہ سعادت خاں نے چار صوبوں اور میر بخشی کے عہدے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن شہنشاہ اس کو دو صوبے دینے اور دو کروڑ روپے ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا (دیکھیے ایس.پی.ڈی جلد 30 نمبر 134) اور بہت سی تجویزیں بھی سامنے آئیں کہ محمد خاں کو آگرہ اور مالوہ اور سعادت خاں کو پٹنہ دے دیے جائیں یا یہ کہ محمد خان کو الہ آباد ملنا چاہیے۔ سعادت خاں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ خان دوراں کو الہ آباد کے صوبہ کی صوبہ داری دلانے کے لیے 15 لاکھ روپے کی رشوت دینے کو تیار تھا۔ (دیکھیے ایس.پی.ڈی جلد 14 صفحات 39-42 وخجستہ صفحات 129-140)

11 الف ایس.پی.ڈی جلد 14 صفحہ 47

12 دیکھیے پی.آئی.ایس-ایم سہ ماہی جلد 12 صفحہ 4، دیکھیے ہر صفحہ 141

13 اس موقع پر رستم علی کے الفاظ سے تقابل کیجیے۔ نظام الملک اسلام کی طرف سے انتہائی عداوت کی بنا پر ہمیشہ غیر مسلموں اور قانون شکنوں کی ہمت افزائی کرتا رہتا تھا۔ دیکھیے تاریخ ہندی صفحہ 565

14 دیکھیے ایس.پی.ڈی جلد 14 صفحہ 39

15 دیکھیے خجستہ صفحات 228-230-233-256-259، 283-84 جے.اے.ایس.بی 18.78٪ صفحات 337-28-

16 دیکھیے ایس.پی.ڈی جلد 14 صفحہ 47 و 51، جلد 20 صفحہ 134

17 ملاحظہ ہو سرکار کی تصنیف "زوال" (صفحہ 263-64) سرکار نے وشن کے غیر معتبر بیان کا اعتبار کر کے (صفحہ 32.39) لکھ مارا ہے کہ جے سنگھ بھمبولاؤ کے مقام پر باجی راؤ سے

ملا اور اسے بتایا کہ ابھی دہلی پر حملہ کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ پیشوا اس ارادہ سے ہے۔ ے سال آئے تو اچھا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن ایس پی۔ ڈی کی نظر میں اس بیان کی یہ تشریح غیر درست ہے۔

18 دیکھیے ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 صفحہ 47 جے سنگھ نے جو اپنے اخیر کے ذریعہ شرائط رکھی تھیں وہ یہ تھیں 20 لاکھ کی نقد ضمانت چوتھ کی بجائے مالوہ میں 40 لاکھ روپیے کی ایک جاگیر اور دوست محمد روہیلہ کے علاقہ پر ایک تنخواہ (بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 صفحہ 50

19 ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر الف

20 دیکھیے ایس۔ پی۔ ڈی جلد 30 صفحات 321-22 - فروری سے لے کر اپریل 7 32 تک ایک لاکھ سات ہزار پانچ سو روپے مل چکے تھے۔

21 دیکھیے ایس۔ پی۔ ڈی جلد 12 صفحہ 168، جلد صفحہ 42، 50، جلد 30 صفحہ 41 رہنگا دفتر نمبر 3، دیکھیے صفحہ 124 اودے پور سے باجی راؤ نے اپنی ماں کو لکھا دہلی کے معاملات زیادہ امید افزا معلوم ہوتے ہیں۔ نجابت علی، خان دوراں سے اور آیا مل، جے سنگھ سے کے اخراجات لے کر پہنچ رہے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ شہنشاہ ہماری دوستی کا طالب ہے (دیکھیے ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 صفحہ 50)

22 بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 20 صفحات 322 - 24 اس حوالے کو دیکھنے کے بعد اس سلسلے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ پیشوا جے سنگھ کے ساتھ 18 دن مارچ تک رہا۔ چنانچہ اروں کی دی ہوئی تاریخ 8 ربیع الاول مطابق 16 جولائی 1736ء کو نیز جائے ملاقات دھول پور کو ناقابل یقین سمجھنا چاہیے دھول پور میں کسی دوسری ملاقات کا بھی سوال نہ ہے کیونکہ مئی کے اواخر میں پیشوا مالوہ میں دو ماہ کے قیام کے بعد دکن کے لیے روانہ ہوا
بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 22 نمبر 333، رہنگان دفتر 1، 2، 3۔

23 بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 نمبر 31، 41 اس نے مرہٹہ وکیل سے کہا "اگر تورانیوں نے دکنی لوگوں کو ہموار کر لیا تو وہ مجھے پس پشت ڈال دیں گے۔ اس لیے میں تو تمام معاملات میں پیشوا کی ہم نوائی کروں گا۔"

24 بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 14 صفحہ 54

25 بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی جلد 15 صفحہ 89، 91

26 باجی راؤ کے مختلف اوقات میں مانگے ہوتے مطالبات بمع جواب کے الگ یادیوں یادداشتوں میں محفوظ ہے کیونکہ ان یادیوں پر تاریخیں پڑی ہوئی نہیں ہیں ان کی ترتیب اندرونی ثبوتوں کی بنا پر ہی مقرر کی جاسکتی ہے۔

27 یہ بات قابل غور ہے کہ کس طرح باجی راؤ، شاہو اور اس کے اہل خاندان کو شہنشاہ کی دی ہوئی مراعات سے محروم کرتا چلا جاتا ہے۔ 1730ء میں خاص مطالبہ شاہو کے متبنّیٰ بیٹے فتح سنگھ بھونسلے کے لیے 10 لاکھ کی جاگیر کے لیے تھا دیکھئے اصل کتاب کا صفحہ 204 205

28 اس کو تین قسطوں میں ادا ہونا تھا (بحوالہ ایس۔پی۔ڈی۔ جلد 15 صفحہ 93) بعد کو ایک الگ یادی میں دو لاکھ باجی راؤ کے بھائی چمناجی کے لیے طلب کیے گئے (دیکھئے پچھلا حوالہ) ایک دوسری یادی سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ باجی راؤ کو 15 لاکھ دینے کو راضی ہو گیا اس کے دربار میں حاضر ہونے سے قبل حاضری کے دوران اور حاضری کے بعد (بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 15 صفحہ 94، 97) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق جنگ کے ان اخراجات سے ہے جس کا پہلے ہی مطالبہ کر لیا گیا تھا اور جس پر باہمی رضامندی بھی ہو گئی تھی۔ 29۔ دیکھئے تاریخ ہندی صفحہ 350۔ 30۔ بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 15 صفحات 92۔93

31 بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 15 صفحات 92، 95، 96۔ شہنشاہ اس امر پر 6 لاکھ روپئے کے بدلے میں راضی ہوا (بحوالہ ڈفرن جلد 1 صفحہ 433)

32 دیکھئے اقبال صفحہ 192

33 بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 14 صفحہ 94، سیر صفحہ 468، 474 اور ڈفرن (جلد 1 صفحہ 432) کہتا ہے کہ یادگار خاں یعنی خان دوراں کے سفیر کو دہلی سے چیتوا کے پاس گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا۔ ان کو پوشیدہ طور پر مالوہ کے چوتھ اور سردیش مکھی جمع کرنے اور راجپوت ریاستوں یعنی بندی اور کوٹہ سے لے کر بھدا وارتک کے علاقے سے دس لاکھ ساٹھ ہزار روپے تک کا خراج وصول کرنے کے فرمان دے دئے گئے تھے۔ اس کا مقصد مرہٹوں اور راجپوتوں کے درمیان مخاصمت پیدا کرانا تھا۔ یادگار خاں کو حکم تھا کہ سخت ضرورت نہ پڑنے کی صورت میں یہ شرائط ظاہر نہ کرے۔ مغلوں کی بدقسمتی سے مرہٹوں کے ایجنٹ نے اس مقصد کو بھانپ لیا اور اس نے اپنے مالک کو باخبر کر دیا۔ باجی راؤ نے اس کو مجبور و معذور پاکر اپنے مطالبات میں اضافہ کر دیا۔

34. بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد 22 صفحہ 134 ظاہر ہوتا ہے کہ 20 لاکھ نقد اور مالوہ میں 40 لاکھ کی جاگیر اور بھوپال کا بطور تنخواہ کے دیا جانا منظور ہو چکا تھا۔ شیو داس (بحوالہ اقبال صفحہ 193) لکھتا ہے کہ باجی راؤ کو دکن پر 7 لاکھ روپے سالانہ تنخواہ اس کے دربار میں پہنچ کر وفاداری کا عہد کرنے پر دی جانی طے ہوئی تھی باجی راؤ کو مالوہ کی نائب صوبہ داری کا فرمان 29 ستمبر 1736ء تک جاری نہ کیا گیا تھا (بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد 15 صفحہ 86 مرتب کی دی ہوئی انگریزی تاریخ غلط ہے) یہ بھی افواہ تھی کہ شہنشاہ نے باجی راؤ کو سات ہزاری اور چلاجی راؤ کو پانچ ہزاری منصب بھی بخش دیا تھا۔

35. بحوالہ ایس. پی. ڈی. جلد 15 صفحہ 94، 95 یہ مطالبات دو علیحدہ علیحدہ یادیوں میں محفوظ ہیں جس میں سے پہلی نظام الملک کو تحریر کی گئی تھی۔ یہ واضح نہیں کہ نظام کو یہ مطالبات کب پیش کیے گئے شہنشاہ کا جواب کہیں تحریر نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مطالبات رد کر دیے گئے تھے۔

36. دکن کے لیے مغل نائب حکمراں کی نامزدگی کا حق مرہٹوں نے مبارز خاں سے گفتگو کے وقت 1724ء ہی میں طلب کر لیا تھا (بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد نمبر ا) حیدر آبادی کی صوبہ داری اور متعدد اہم قلعوں کی حوالگی کے مطالبے بھی کیے جا چکے تھے۔ 1733ء میں سعادت نے یہ موضوع پھر چھیڑ دیا جس نے دکن اور مالوہ پر مرہٹوں کے ذریعہ صوبہ داروں کے نامزد کیے جانے کے حق کو تسلیم کر لیا بشرطیکہ وہ نظام کے خلاف مہم کا آغاز کرتے (بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد 23 ؛ 9) اس پس منظر میں 1736 کے دکن سے متعلق مطالبات کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتے۔

37. بحوالہ ایس. پی. ڈی. جلد 15 صفحہ 95-96

38. بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد 5 صفحہ 89، 91 جلد 30 صفحہ 196

39. بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد 12 صفحہ 33، رہنگان دفتر 3-6 پیشوا نے شکایت کی کہ یادگار خاں کی آمد پر 20 روز کی مدت میں مطالبات کا جواب بھیج دیا جائے گا۔ وہ مالوہ میں دو ماہ تک منتظر رہ چکا تھا لیکن کوئی جواب اسے نہ مل سکا جبکہ وہ پڑاؤ میں اپنے اخراجات کے سبب تباہ ہو چکا تھا۔

40. بحوالہ ایس. پی. ڈی جلد 15 صفحہ 94، 96-87، 89، 44. بحوالہ ایس. پی. ڈی. جلد 33 صفحہ 196

41. دیکھئے برٹش کرانکل نمبر 27 پیشوا کا خط اپنے بھائی چمناجی کے نام دیکھئے انگریزی ترجمہ

پیشواؤں کا عروج مصنفہ ایچ۔ این سنہا صفحات 136- 139

42 1735ء میں مرہٹہ وکیل جے پورتے ایک اشارہ پیشوا کو ان الفاظ میں بھیجا تھا "پیشوا کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ دہلی پر قبضہ جمانے کا یہ وقت نہایت ہی مناسب ہے اور اب اس حکومت کو باسانی چھتوپتی کے حوالے کیا جاسکتا ہے (بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی نمبر 30 صفحہ 134) لیکن بظاہر باجی راؤ سے اس کا کوئی جواب موصول نہ ہوا سردیشی لکھا ہے کہ ہندو۔ پد۔ پادشاہی کا خواب علاقائی خواہشات سے نہیں بلکہ مذہبی خواہشات سے منسلک تھا (دیکھئے دی نیو ہسٹری آف مرہٹی پیوپل جلد 2 صفحات 35

43 دیکھئے ایس۔ پی۔ ڈی نمبر 30 صفحہ 196 تاریخ ہندی 539

44 بحوالہ برٹش کرانکل صفحہ 27 پیشوا جی نے چمناجی کو اپنے ردیے کی ان الفاظ میں وضاحت کی۔ میں شہنشاہ کو حقیقت سے آگاہ ہو جانے پر مجبور کر دینا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں ابھی ہندوستان میں ہوں اور یہ کہ مرہٹے پایۂ تخت دہلی کے دور دراز تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ خان دوراں اور بنگش آگرہ پہنچ گئے اور سعادت خاں کے ساتھ شریک ہو گئے جو پہلے ہی فوج لے کر آگرہ پہنچ چکا تھا۔ میرا وکیل ڈھونڈو نیت خان دوراں کے ساتھ ہی تھا۔ سعادت خان نے اس کو پیغام بھیجا کہ باجی راؤ کی فوج کو پسپا کر دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ چنبل کے اس پار جاچکا ہے اور اب اس کے سفر کا لحاظ کرنا ضروری نہ تھا اس لیے اب اس کو فوراً برخاست کر دینا چاہیئے چنانچہ ڈھونڈو نیت کو واپس بھیج دیا گیا اور وہ میرے پڑاؤ میں پہنچ گیا۔ اب میں نے پایۂ تخت کو لوٹنے کا خیال بدل دیا۔ میں جانتا تھا کہ خان دوراں میرے مطالبات پورے کرنے پر مائل ہیں لیکن مغلوں کا گروہ امن پسندی کی پالیسی کا مخالف ہے۔ ان میں پایہ تخت کی لوٹ مار کر کے اپنے حامیوں کو شرمندہ اور مجبور کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے شہنشاہ کو یقین دہانی کے خطوط لکھے۔

45 بحوالہ ایس۔ پی۔ ڈی نمبر 15 صفحہ 29 تاریخ ہندی صفحہ 542۔ آشوب (بحوالہ نسخہ نمبر 125 الف) کہتا ہے کہ حملہ کے بعد خان دوراں نے شہنشاہ سے باجی راؤ کو مالوہ کی صوبہ داری اور 13 لاکھ نقد دینے کی طرف مائل کیا جیسا کہ وعدہ تھا۔ قاسم صفحہ 359 پر (نسخہ سرکار) یں کہتا ہے کہ حملہ کے بعد وزیر نے ہنگامے کو صلح کے لیے طلب کیا۔ مواخرالذکر نے مالوہ، اجین (بندیل کھنڈ) اور گجرات کی چوتھ کا مطالبہ کیا۔ صاحب سیر کے مطابق بھی صلح کی گفتگو کے آغاز ہو جانے کا ذکر ملتا ہے لیکن دوسری طرف مرہٹہ وکیل نے لکھا کہ جے سنگھ کے ذریعہ سے جو صلح کی گفتگو شروع ہوئی تھی۔

وہ ناکام یاب ہو چکی تھی نظام آ رہا تھا اور اس آنے پر ہی ہر بات کا فیصلہ ہو سکتا تھا (بحوالہ ایس. پی. ڈی نمبر 15، 33

46 بحوالہ ایس. پی. ڈی نمبر 15 صفحات 36، 23، 3.3 رنمبر 10 صفحہ 7 2 نظام الملک دہلی کے لیے 17، ذی الحجہ مطابق 7، اپریل 1737ء کو روانہ ہوا مرہٹہ وکیل نے لکھا کہ اس نے باجی راؤ کے لیے بہت کچھ دوستی کے جذبات ظاہر کیے لیکن اس کے اصل ارادے بالکل مختلف تھے اس کا خیال ہے "اگر باجی راؤ دہلی جا کر شہنشاہ سے ملتا ہے تو میرا کیا ہوگا؟ دکن کے لیے ایک نئے صوبیدار کا تقرر ہو جائے گا۔ اس سبب سے اس نے تمام امراء کو اور شہنشاہ کو لکھا ہے کہ وہ خود آ رہا ہے۔ شاہی خزانے کی مدد و نصرت سے، لوٹ مار کرنے والو (غنیموں کو) پسپا میں کون سی دشواری حائل ہو سکتی ہے اس پر شہنشاہ نے باجی راؤ کی ملاقات کو ملتوی کر دیا اور نظام کو نان کا ایک پارہ (روٹی کا ایک ٹکڑا) (آنے کی دعوت کے اشارے کے طور پر) بھیجا۔"

47 بحوالہ برٹش کرانکل صفحہ 33- 35 و "ریاست" صفحہ 71 3- 72۔ اس کے مطابق یہ خیال غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک کو پال کھنڈ میں شکست دے کر (1727ء میں) باجی راؤ نے دکن پر پورا تسلط حاصل کر لیا تھا۔ دیکھئے "ڈیگھے" صفحہ 20

48 بحوالہ ایس. پی. ڈی نمبر 51 صفحہ 53

49 بحوالہ ایس. پی. ڈی نمبر 10 صفحہ 27 نمبر 15 صفحہ 56 -58 نمبر 30 صفحہ 207 (نمبر 10 کی صفحہ 27 کی صحیح تاریخ 10 جنوری 1737ء ہے نہ کہ 10 جون 1724ء) کہا جاتا ہے اس کے افواج بڑھ کر 70 ہزار تک پہنچ گئی تھی لیکن پیشوا اپنے خطوط میں 35 ہزار لکھتا ہے (برٹش کرانکل 134) کہا جاتا ہے کہ اس وقت سعادت کی فوج کا ایک دستہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ (نمبر 20 صفحہ 707) ارون رجلد 2 صفحہ 204) قرن کے حوالے سے (جلد ا صفحہ 397) لکھتا ہے کہ صفدر جنگ کی سربراہی کے دستہ کو ملہر ہولکر اور جسونت پوائے راستہ ہی میں روک کر شکست دے دی۔ لیکن ایس. پی. ڈی نمبر 30 صفحہ 207) قطعی طور پر لکھتا ہے کہ سعادت خاں کی بھیجی ہوئی افواج نے 20 ستمبر کو شرکت کی بحوالہ (این. ایس)

50 یحیٰی حسین خاں (دیکھئے کتاب "آصف جاہ" صفحہ 123) کہتا ہے کہ نظام الملک کامیابی کے ساتھ حملہ آور نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس نے راجپوتوں اور بندیلوں کو ناقابل اعتبار پایا وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ یلغار کی ضرورت ہو۔ دراصل وہ دشمن کو نظام الملک کی تدابیر اور عزائم کے سلسلے میں

پوشیدہ طور پر اطلاع بہم پہنچا رہے تھے ۔" خود پیشوا نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ نظام اور راجپوت ایک دوسرے کے سلسلے میں مشکوک تھے (بحوالہ برٹش کرانکل صفحہ 33) لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ مرہٹوں اور راجپوتوں کے درمیان پوشیدہ طور پر کوئی معاہدہ قائم تھا ۔ درحقیقت راجپوتوں نے تو جنگ کے اصل حملہ کو اپنے سینے پر روکا جس کے نتیجے میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں (برٹش کرانکل 33) پیشوا نے چمناجی کو لکھے ہوئے خطوط میں جنگ کی پوری تفصیل دی ہے ۔ اس نے ان خطوط میں راجپوتوں کی کسی مدد یا کسی اطلاع کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن جب نظام کے پڑاؤ میں قحط پڑا تو ہر شخص نے راہ فرار اختیار کی اور راجپوت بھی وہاں سے رخصت ہو گئے (دیکھئے پچھلا حوالہ) یہی حسین خاں مزید لکھتا ہے (صفحہ 214 پر) کہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ امیرالامرا صمصام الدولہ نے جو نظام الملک سے حسد رکھتا تھا اور مرہٹہ کے خلاف اس مہم کو ناکام دیکھنا چاہتا تھا ۔ نظام کو ناکام بنانے کے لیے راجپوتوں کے ساتھ یہ صورت حال تشکیل کی ہو" معاصر مورخین نے متعدد عذر کے ماتحت اس قسم کا کوئی بیان قلم بند نہیں کیا ہے ۔ رستم علی نے (بحوالہ ہندی صفحہ 549 - 50) اس قسم کا اشارہ دیا ہے کہ خود نظام مرہٹوں سے جنگ کرنے میں سنجیدہ نہیں تھا ۔ وہ لکھتا ہے "چونکہ نظام کا کج دماغ ایسی صورتوں کی طرف مائل تھا جو اس کے نام کے عین متضاد ہیں یعنی حسن انتظام کے اس نے ملک میں بدامنی کو فروغ دیا اور ایک دور دور تک اپنے خیمے میں اناج کو فی روپیہ ایک سیر بکوایا ۔ اس کے پیدا کیے ہوئے جھگڑوں کے سبب سے بہت سے لوگ فاقہ کشی کی وجہ سے اپنی قبر تک پہنچ گئے اور بہت سے مسلمان اس بے اصول شخص یعنی نظام کے سبب سے دشمن کے ہاتھوں میں پڑ گئے اور تباہی کے گھاٹ اتر گئے ۔"

51 بحوالہ برٹش کرانکل 35 ، 36 دایس ۔ پی ۔ ڈی جلد 15 صفحہ 87

52 برٹش کرانکل صفحہ 35 ، 36

53 ایک باقی ماندہ دستاویز میں نظام الملک کو پیش کیے گئے مندرجہ ذیل مطالبات کا ذکر ہے ۔

شواجی کے قدیمی سوراجیہ کے اٹوٹ علاقے ، چنداور کو سپرد کر دیے جائیں ۔ پیشوا کے قرضوں میں ادائیگی میں مدد کی جائے اور اسے خاندیش بیجاپور اور اورنگ آباد میں 50 لاکھ کی قیمت کی جاگیر دے دی جائے مال گذاری کے 5% کی برابر پیشوا کو سردیش پانڈے کا موروثی منصب دیا جائے اور دکن کا انتظام پیشوا کے سپرد کر دیا جائے ۔ بطور انعام کے شونر کا قلعہ اور کچھ گاؤں

دے دیتے جائیں۔ بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 15 صفحہ 94، 95 ۔ اس سلسلے میں ایک زبانی گفتگو کے وقوع پذیر ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کا کچھ تذکرہ نہیں کہ یہ مطالبات کب پیش کیے گئے تھے 1732ء والے پیشوا کے خطوط میں ان مطالبات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

54 بحوالہ ایس۔پی۔ڈی نمبر 30 صفحہ 222

55 بحوالہ ایس۔پی۔ڈی نمبر جلد 15 صفحہ 75، 72، نمبر 20 صفحہ 385، دیکھیے صفحہ 52

56 دیکھیے ڈیگھے صفحہ 152

57 سردیسائی کا مصنفہ لائف آف باجی راؤ صفحہ 335

58 دیکھیے نجستہ صفحہ 37، 219، 244، جے۔اے۔ایس۔بی 1878ء صفحہ 333 ۔
باجی راؤ نے لکھا تھا، درآن وقت، وقت است کہ ہمان سرداران نام دار دولتِ سالِ صاحب اقتدار بہ اجتماع افواج و اتفاق ہم دیگر بہ یہ داختہ مستعد و متوجہ برآت مقاومت مختلف باشند۔

59 دیکھیے مصنف نجستہ صفحہ 376۔76

60 ملاحظہ ہو، باجی راؤ کی وفات کے بعد، شاہو کا باجی راؤ کے بارے میں یہ خیال کہ اس کا (باجی راؤ کا) منصوبہ مغل سلطنت کی حفاظت کرنے اور ساتھ ہی ساتھ پورے ہندوستان پر تسلط جمانے کا تھا۔ بحوالہ برٹش کرانکل صفحہ 117، 120

61 1740ء میں نظام مالوہ میں پیشوا سے ملا اور اپنے بیٹے کے خلاف مرہٹہ کمک مانگی جو بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 21)

62 دیکھیے "کتاب رجواڑے" جلد 6 صفحات 145، 149، ایس۔پی۔ڈی نمبر 13 صفحہ 4 "مالوہ" مصنفہ آر سنگھ صفحات 266-268، تاریخ مظفری صفحہ 320

63 بحوالہ ایس۔پی۔ڈی جلد 15 نمبر 86 صفحات 97-98 و "رجواڑے" جلد 2 صفحات 91-95 ان مضامین کی تاریخ 1741ء ہونی چاہیے (ایس۔پی۔ڈی جلد 10 نمبر 186 کو 28 ستمبر 1741ء ہونی چاہیے یا 17 ستمبر بقاعدۂ قدیم) اور جلد 15 صفحہ 97 کو 15 جولائی یا 4 جولائی بقاعدہ قدیم ہونی چاہیے۔

باب دہم

مغل سیاست اور نادر شاہ

عظیم مغلوں نے اپنی شمالی مغربی سرحدوں پر جہاں ایک طرف ایران اور دوسری طرف توران کی ریاستیں تھیں، برابر نظر رکھی ان حکومتوں کی طرف سے حملے کے پیش نظر انہوں نے کوشش کی کہ:

(1) مغربی اور وسط ایشیاء میں حکومت کے خلاف کسی قسم کی طاقت کو ابھرنے کی کوششوں کو سفارتی طریقوں پر ختم کرنے کی طرف قدم اٹھائیں۔

(2) کابل میں ایک بہتر اور منظم حکومت کا قیام ہو قندھار کی حفاظت کے پورے انتظامات ہوں کیونکہ قندھار کو کابل میں داخلہ کا دروازہ کہا جاتا ہے۔

(3) افغانستان اور قبائل میں ایک آسودہ حال و مطمئن آبادی کو تیار رکھنا تاکہ کسی بھی ضرورت کے وقت وہاں سے معاشی مدد دی جاسکے۔

اس پالیسی کے قیام کے لیے لائق ترین گورنروں کو کابل بھیجا گیا اور ان کے ساتھ بڑی بڑی افواج کو رکھا گیا۔ ان فوجوں پر گورنر کی طرف سے بھاری رقوم خرچ کی گیئں۔ اسی طرح قبائل پر خرچ کرنے کے لیے مرکزی انتظامیہ نے ہر قسم کی مدد کی۔ ایران کی چھیڑ چھاڑ اور قبائل میں بے اطمینانی کے باوجود اس پالیسی نے مغل سلطنت کو ان علاقوں سے حملے کے خطرہ سے دور رکھا۔

16:77 ء میں امیر خاں کابل کا گورنر تھا جو نہایت قابل اور اورنگ زیب کا معتمد تھا 1698ء میں اس کی موت کے بعد شاہ عالم گورنر مقرر ہوا اور ناصر خاں کو اس کا نائب مقرر کیا گیا 17:00 ء میں شاہ عالم کو لاہور کا بھی گورنر بنایا گیا۔ شہزادہ کے بڑے صاحب زادے جہاندار شاہ بدستور ملتان پر فائز رہے۔ اس طرح شمالی مغربی سرحدوں کی حفاظت کا کام شہزادے شاہ عالم کے سپرد ہوا۔ ان ریاستوں کے معاملات پر خود اورنگ زیب نے گہری نظر رکھی۔ شاہ عالم کے انتظام نے بھی شہزادہ اکبر

کے حملہ کو ناکام رکھا جس نے ایران میں پناہ لی تھی اور برابر حملہ کی کوشش کر رہا تھا۔

بہادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد علی مرداں خاں کا بیٹا ابراہیم خاں کابل کا گورنر بنایا گیا لیکن وہ صحیح انتظام کرنے میں ناکام رہا اس لیے اسے ہٹا دیا گیا اور ناصر خاں کو اس کی اپنی جگہ پر واپس بھیجدیا گیا۔ 1129ھ / 1717ء تک جب ناصر خاں کی وفات ہوئی وہ اس عہدہ پر فائز رہا اس کے بعد اس کا بیٹا اس عہدے پر فائز ہوا ناصر خاں دوم کی ماں افغان تھی اس لیے اس کے تعلقات افغانوں سے اچھے تھے اس نے انتظامیہ میں بہتری کی اور تمام علاقہ کو بہتر بنایا۔ 1719ء میں سربلند خاں نے سید عبداللہ کی مداخلت سے ناصر خاں کی جگہ حاصل کی۔ قبائل بظاہر اس سے غیر متعلق رہے لیکن سربلند خان کا بیٹا خاں اعظم خاں جب کابل سے پشاور کی طرف لوٹ رہا تھا تو وہ قبائل کی حرکات سے حیران رہ گیا اور اپنے سامان اور آدمیوں کو گنوا بیٹھا۔ سید برادران کے زوال کے بعد ناصر خاں دوم کو پھر واپس بلا لیا گیا۔

اسی درمیان مغربی ایشیا کی سیاست میں تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ مغل افغانوں کو جو قندھار کے قریب فردکش تھے اپنے آپ کو اور اپنی طاقت کو منظم کرنے کا موقع ملا۔ 1709ء میں نسل زبتی کے سربراہ میر وائس نے فارسوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر دیا اور قندھار کے قلعہ پر قبضہ کر لیا لیکن 1715ء میں اس کے بیٹے محمود نے صفوی حکومت کا خاتمہ بالجبر کیا اس نے اصفہان کے مقام پر شاہ سلطان حسین مصفی کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اس نے 22 اکتوبر 1722ء کو صفوی بادشاہ کو معزول کر کے خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

ان تمام واقعات پر دہلی کی حکومت کی حیثیت محض خاموش تماشائی کی تھی سرحد پر کابل کی آزاد سلطنت کے قیام کے تصور کو یہ ختم نہ کر سکی۔ جب نظام الملک دربار میں دکن سے واپسی پر حاضر ہوا اس نے اس کی خواہش ظاہر کی کہ وہ وہاں جا کر دوبارہ صفوی حکومت کے قیام کی کوشش کرے لیکن دربار کی نہ تو خواہش ہی تھی اور نہ اتنی طاقت تھی کہ اس قسم کی مہم کے بارے میں کوئی قدم اٹھایا جا سکتا۔ اس کی بجائے انھوں نے محمود سے دوستانہ تعلقات قایم کرنے کے لیے خط و کتابت شروع

کی۔ محمود کی فتح نے روس اور ترکی کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

جب کہ سرحد پر اس قسم کے واقعات پیش آ رہے تھے مغل دربار اندرونی جھگڑوں کا شکار رہتے۔ پچھلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مرہٹوں سے جنگ اور امن کے مذاکرات شروع ہو چکے تھے۔ خان دوراں بخشی اور وزیر قمر الدین خاں جس میں پیش پیش تھے اسی درمیان امراء کے طبقہ میں آپسی جھگڑوں نے نئی صورت حال اختیار کر لی تھی اور جاگیروں پر قبضہ کے لیے اندرونی جنگ چھڑ چکی تھی۔ اس زمانے میں مغل فوج میں بھی دو طاقتور گروپ تھے مغل اور افغان اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی امراء کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

وزیر قمر الدین خاں اور سعادت خاں اودھ کے گورنر مغل فوج میں بہت طاقتور سمجھے جاتے تھے۔ سیدوں کے عروج کے زمانہ میں بھی مغلوں اور غیر مغلوں میں اختلافات بڑھ گئے تھے لیکن نظام الملک کی وزارت تک یہ سامنے نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد ان میں زیادتی ہوتی گئی اور یہ اختلافات خطرناک صورت حال اختیار کر گئے۔

1228 1237 کے درمیان سیاست اور گروہ بندیاں

امیروں کی گروہ بندیاں اور وزارت کے سلسلے میں ہونے والی کشمکش میں حکومت کی حکمت عملی اور حکومت کی شکل کا سوال بھی خود بخود اٹھ کھڑا ہوا اس طرح راجپوتوں کے سلسلے میں پالیسی، ہندوؤں کی حیثیت اور جزیے کا سوال مرہٹوں اور جاٹوں وغیرہ کے لیے پالیسی وغیرہ کے بھی سوال اس کش مکش سے جڑ گئے حقیقت میں اس تمام کش مکش کا پس منظر یہی تھا کہ امیروں کی ایک جماعت یہ چاہتی تھی کہ مغل سلطنت کی بنیاد صرف مسلمان ہوں اور ان میں بھی اختیارات خاص طور سے مغل یعنی ایرانی اور تورانی امیروں کے ہاتھ میں رہیں۔ دوسری جماعت سمجھتی تھی کہ حکومت کا انحصار ہندو و مسلمان دونوں پر ہے اور حکومت کا کوئی خصوصی تعلق اسلام سے نہ ہو بہادر شاہ کے زمانے سے ہی راجپوت اور بندیلہ راجاؤں کو عایتیں دینی شروع ہو گئی تھیں اور جزیہ وصول کرنے میں کافی ڈھیل آ گئی تھی۔ جہاندار شاہ کے دور حکومت میں ذوالفقار خاں نے جزیہ ختم کر دیا جے سنگھ و

اجیت سنگھ کو بڑے بڑے منصب دے کر انھیں صوبے دار کے عہدے دیئے۔
چوڑامن جاٹ کو بھی منصب دیا گیا اس سے قبل بہادر شاہ کے زمانے میں ہی ذوالفقار خاں نے ساہو کو دکن کی چوتھ دسر دیش مکھی دینے کا ایک خفیہ معاہدہ کر لیا تھا۔ ذوالفقار خاں کے زوال کے بعد یہی پالیسی سید برادران نے بھی اپنائی انھوں نے راجپوت راجاؤں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مرہٹوں اور جاٹوں کے ساتھ بھی معاہدے کیے۔ دربار میں انھوں نے مغلوں وغیرہ کا تعاون بھی حاصل کرنے کی کوشش کی اس طرح حاکم طبقے میں سب عنصر شامل ہو گئے اور حکومت کے کاموں میں ان سب عناصر کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ اعتراض کرنا کہ یہ رعایتیں سیدوں نے حالات سے مجبور ہو کر دیں ہمارے لیے اہم نہیں ہے یہ رعایتیں حالات کے تحت یا کسی بھی وجہ سے دی گئیں۔ یہ اس وقت کی متحرک طاقتوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں سیدوں کی پالیسیاں امیر طبقے کے کچھ عناصر کو اچھی نہیں لگیں اور انھوں نے سیدوں کو ہندوؤں کا طرفدار اور حکومت و بادشاہ کے لیے اعتماد شکن اور مذہب کا مخالف کہہ کر ان کے خلاف سازشیں شروع کیں۔ لیکن ان کے زوال کے بعد نظام کے پرانے امیروں خاص کر مغلوں کو پناہ دینے اور اورنگ زیب کی دقیہ نوسی پالیسیوں کو نافذ کرنے کی کوشش ناکام رہی۔ اس کی مخالفت کرنے والے نہ صرف بڑے امیر تھے بلکہ چھوٹے منصب دار و عہدے دار جن میں ہندوستانی، کشمیری کائستھ وغیرہ پیش پیش تھے ان سب وجوہات سے ہی نظام دلی چھوڑ کر دکن چلا گیا۔

اس طرح اورنگ زیب کی تنگ نظری سے بھرپور اور کٹر پالیسی مغل سلطنت میں تھوڑی مدت تک ہی چلی 1526 سے لے کر 1739 میں نادر شاہ کے حملے تک اس ہندوستان میں مغلیہ حکومت 198 سال چلی۔ (1540 سے 1555ء تک عنان حکومت افغانوں کے ہاتھ میں تھی) اس مدت میں جزیہ حقیقی شکل میں صرف 53 برسوں تک نافذ رہا۔ مغلیہ حکومت کی مذہبی پالیسیوں کے طے کرنے کے لیے اس قسم کے اعداد و شمار مناسب نہیں ہیں کیونکہ مذہبی پالیسی کے بہت سے دوسرے پہلو ہیں تو بھی مغلیہ حکومت کی آزاد خیال پالیسیوں کو پرکھنے کا ایک ہلکا سا ثبوت ضرور ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ایک دوسرے کے خیالات اور رویے کو سمجھنے اور تہذیبی میل جول کا مزاج

کئی صدیوں سے عمل پیرا تھا۔ سترھویں صدی تک وہ اتنا وسیع اور طاقت ور ہو چکا تھا کہ سیاسی پیمانے پر کٹر اور تنگ نظر پالیسیاں جاری ہونے پر بھی وہ بے عمل نہیں ہو سکتا تھا اسی لیے اٹھارھویں صدی ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق اور باہمی کشمکش کی صدی نہیں کہی جا سکتی ہے۔ سفارتی پیمانے پر یہ زمانہ میل جول کا ایک حصہ ہے اورنگ زیب کے دربار سے بکھرے ہوئے مصور مختلف ریاستوں میں گئے اور انھوں نے تصویر کشی کے فن میں ایک نئی زندگی کی روح پھونکی۔ اٹھارہویں صدی میں راجپوت ریاستوں اور چمبا بھوسلا وغیرہ کو ہستانی ریاستوں میں بنائی ہوئی تصاویر فن اور طرز دونوں ہی نظریوں سے ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ وہ مغل اور ہندوستانی طرز جیسے مغربی ہندوستان جین، راجپوت وغیرہ کے میل جول کے عجیب و غریب نمونے ہیں موسیقی میں محمد شاہ کے دربار میں سدا رنگ وادا رنگ نے خیال گانے کی بنیاد رکھی امیروں اور نوابوں وغیرہ کا ہندوستانی موسیقی کو امیروں اور نوابوں وغیرہ کی سرپرستی دینے کی روایت 19 صدی تک اور کہیں کہیں بیسویں صدی تک چلتی رہی۔ فن تعمیر میں مغلیہ طرز کے اثر کی سب سے بڑی مثال پیشوا کے ذریعے بنائے ہوئے پیشوا محل ہیں ادب کے میدان میں رسلین اور دوسرے مسلمان شاعروں نے ہندی کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اسی زمانے میں شمالی ہندوستان میں اردو کی ابتداء ادبی زبان کی شکل میں ہوئی تعلیم یافتہ طبقے خاص طور سے شہری طبقے کے لیے اردو تعمیر ادب کے لیے ایک اہم ذریعہ بن گئی۔

سماجی پیمانے پر اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا صحیح ڈھنگ سے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا گیا ہے کہ موٹے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ طبقہ چاہے وہ امیر ہو یا راجہ یا زمیندار ان کے رہن سہن اور پہناوا وغیرہ میں بہت حد تک یکسانیت تھی حالانکہ سیاسی پیمانے پر ان میں کش مکش ہوتی رہتی تھی۔ سماجی نقطہ نظر سے ان کے طور طریقے کافی حد تک ملتے تھے سید برادران ہولی اور بسنت کا جشن بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے فرخ سیئر کے ساتھ اجیت سنگھ کی بیٹی کی شادی کے موقعہ پر بہت سے ہندو رسم و رواج اپنائے گئے۔ سیاسی گروہ بندی بھی مذہب کی بنیاد پر نہیں تھی جے سنگھ 1725ء کے بعد مرہٹوں کا دوست تھا لیکن ایسے

سنگھ اُس کا حریف تھا۔ مرہٹوں کے لیے نظام اور محمد شاہ کی پالیسی بدلتی رہتی تھی وقت ضرورت نظام مرہٹوں کا دوست بن جاتا تھا اور مغلیہ سلطنت پر حملہ کرنے کے لیے اپنے علاقے سے گزرنے کی انھیں اجازت دے دیتا تھا۔ مغل بادشاہ نے بھی۔ مرہٹوں کے حملوں کو نظام کے خلاف دکن کی جانب موڑنے کی کوشش کی مرہٹوں نے رفتہ رفتہ ہندو بادشاہی کے نعرے کو چھوڑ دیا اور مغل بادشاہ کو تخت سے ہٹانے کی کوشش کے بجائے اپنے آپ کو مغل بادشاہ کا ہمدرد اور سرپرست ظاہر کیا پانی پت کی جنگ سے قبل انھوں اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش کی جاٹ اور راجپوت راجاؤں کی جانب مرہٹوں کا رویہ کبھی دوستانہ رہا تو کبھی دشمنانہ حقیقت یہ ہے کہ .... نہ ہندو حاکم طبقہ ایک تھا اور نہ ہی مسلم حاکم طبقہ مختلف عناصر کی کس وقت کس عنصر کے ساتھ دوستی یا کش مکش ہوگی یہ ان کے مذہبی خیالات پر نہیں بلکہ ان کے مفادات پر منحصر تھا۔ اس کش مکش میں کبھی کبھی مذہب کا سہارا دونوں فریق لیتے تھے لیکن مذہب ذریعہ تھا مقصد نہیں۔

دیہاتی زندگی میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہمیں کشمکش کی بجائے "جیو اور جینے دو" کا جذبہ دکھائی دیتا ہے شاید اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں قابلِ کاشت زمین کی کمی نہیں تھی جن سیدوں، عالموں، وغیرہ کو مغلیہ سلطنت کی جانب سے مدمعاش زمین دی گئی وہ اکثر وبیشتر دیہاتوں میں آباد ہوگئے اور دیہاتی سماج میں گھل مل گئے روہیلہ افغان وغیرہ بھی کسانوں کی شکل میں مقیم کیے جاتے تھے لیکن دیہاتی سماج کی کش مکش کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے۔

جہاں تک درمیانی طبقے اور شہری زندگی کا سوال ہے وہاں ہمیں جگہ جگہ ہندو مسلم تنازعہ اور جھگڑے کی مثالیں ملتی ہیں ایسی ہی ایک مثال احمد آباد شہر سے دی جا سکتی ہے فساد کی وجہ ایک معمولی وجہ سے ہوئی ہولی کے موقعے پر شہر کے ایک بڑے جوہری کپور چند نے ایک مسلمان راہگیر پر رنگ چھڑک دیا میراتِ احمدی کے مطابق اس جوہری کی دوستی شہر کے حاکموں سے تھی اس لیے وہ بڑا مغرور ہوگیا تھا مسلمانوں کی اشتعال انگیزی کا فائدہ اٹھا کر کپور چند کے

مخالفین نے جن میں سب سے پیش پیش ایک مسلمان بوہرہ تھا کپور رچند کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ، دونوں جانب سے ہجوم اکٹھا ہو گیا اور لوٹ مار آگ زنی شروع کر دی ۔ مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ کپور رچند جوہری کو سزا دی جائے لیکن مسلمان حاکموں نے اسے تسلیم نہیں کیا آخر میں کپور رچند کا ایک مخالف دلی گیا اور اس نے کسی طرح محمد شاہ کو متاثر کر لیا ۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کپور رچند اور بوہرہ دونوں تجار قید کر لیے گئے آخر میں انھیں آپس میں سمجھوتہ کرنا پڑا ۔ دو دوسری مثالیں دلی سے ہیں جوتے والوں (پاموشان) کے جھگڑے کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں اس میں شوبھ کرن کا ساتھ شیر افگن خاں روشن الدولہ اور ظفر خاں پانی پتی وغیرہ نے دیا تھا اور جھگڑے نے مغلوں و ہندوستانیوں کے جھگڑے کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک دوسرا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ایک ہندو مسلمان بننے کے بعد پھر سے ہندو بن گیا ۔ یہ سن کر شہر کے کچھ ملاؤں نے اسے غیر قانونی بتایا اور مطالبہ کیا کہ اسے سزائے موت دی جائے یہ معاملہ شیخ الاسلام کے پاس گیا لیکن اس نے تبدیلیٔ مذہب کو ذاتی معاملہ ٹھہرایا ۔ اس کے اوپر ملاؤں اور فرقہ پرستوں نے شہر میں جمعہ کی نماز نہ ہونے دینے کا اعلان کر دیا ایک بڑے ہجوم نے وزیر قمر الدین خاں کو مسجد میں داخل نہیں ہونے دیا معاملہ بڑھتا ہی گیا آخر میں بادشاہ نے اشتعال کم کرنے کی غرض سے اس ہندو کو خاموشی سے شہر سے فرار کر دیا اور شیخ الاسلام کو برخاست کر دیا ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہروں میں خاص طور سے بڑے شہروں میں جہاں مالدار ہندو بیوپاری بھی رہتے تھے ہندو مسلم فساد کا خطرہ رہتا تھا لیکن یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ مسلمان حاکموں کا رویہ کافی غیر جانبدار ہوتا تھا یہاں تک کہ کچھ ملا طبقے نے ان کے خلاف تحریک چلائی ۔ ہندو مسلم تنازعے کے ساتھ ہی شیعہ سنی تنازعے کی مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں ۔

ان سب سے ظاہر ہے کہ دورِ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں بہت ہی اختلافات تھے لیکن ان سب کا سیدھا سیاست سے تعلق جوڑنا مناسب نہیں لگتا ۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

اٹھارہویں صدی کے اوّل نصف حصے میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت

اوران کے خلاف فوجی کارروائیوں کی ناکامی اور مغل امیروں کی بے عملی کی وجہ سے یہ خیال کافی مستحکم ہوگیا ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کی خاص وجہ خود امیر طبقہ کی نالائقی اوران کا زوال پذیر ہونا تھا مغلیہ امیر طبقے کے زوال پذیر ہونے کی وجوہات کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے۔

عیش وعشرت کی زندگی،شراب وشباب میں گم رہنا اور بڑے بڑے حرم رکھنا، ہندوستانی آب وہوا کا اثر جو آدمی کو کاہل بنا دیتی ہے۔ اورنگ زیب کی پالیسی جس کی وجہ مغل امیر اور سب پیشوں کو چھوڑ کر صرف سپہ گری کرنے لگے تھے جو کہ ذہنی ارتقا کا موقعہ نہیں دیتی،مغل امیر طبقے کا مختلف ممالک و مذاہب کا ہونا جس کی وجہ سے گروہ بندی کو سہارا ملا، وسطی ایشیاء سے قابل لوگوں کا آنا رک جانا وغیرہ حاکم طبقے کے زوال پذیر ہونے کی مندرجہ بالا وجوہات الگ الگ یا مجموعی طور سے ہندوستان میں ترکوں کی آمد کے وقت سے نادرشاہ کے حملے تک ہر اہم موڑ کو سمجھانے کے لیے پیش کی جا رہی ہیں اس لیے ان کی جانچ ہوشیاری سے کرنا ضروری ہے حقیقت میں زوال پذیر لفظ کا استعمال صرف حاکم طبقے اور لوگوں کے کردار کے پس منظر میں کرنا مناسب نہیں ہے زوال پذیر لفظ تمام سماجی و اقتصادی ردّعمل کی تشریح کرتا ہے۔ تاریخ میں ایسا زمانہ شاید ہی ہوا ہوگا جس میں قابل و لائق لوگوں کی پوری طرح کمی ہو اگر قابل آدمیوں کی کمی ہی زوال پزیر ہونے کی بنیاد ہو تو اٹھارہویں صدی کو زوال پذیر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس صدی میں ہمیں سید برادران ، اور نظام الملک،عبدالصمد خاں، ذکریا خاں، سعادت خاں، صفدر جنگ، مرشد قلی خاں سوائی جے سنگھ جیسے ہوشیار جنگ جو اور منتظم ملتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ان قابل و لائق لوگوں میں سے بیشتر مغلیہ سلطنت کی خدمت کرنے اور اسے طاقتور بنانے کی بجائے اپنی قوت بڑھانے میں اور الگ الگ ریاستیں قایم کرنے میں مشغول رہے۔جب تک یہ لائق لوگ زندہ رہے، تب تک ان کے اپنے اپنے علاقوں میں امن و انتظام خوش اسلوبی سے چلتا رہا کچھ انگریزی تاریخ دانوں نے تقریباً پوری اٹھارہویں صدی کو "عظیم بدامنی کا زمانہ کہا ہے یہ قول مبالغہ آمیز ہے اور حقیقت سے دور اس کا اصلی مقصد ہندوستان پر انگریزی

... کے قیام کو ضروری اور مناسب بناتا ہے۔ پنجاب، اودھ، بنگال اور دکن وغیرہ علاقوں میں 1739ء تک پرانا مغلیہ نظام پہلے جیسا چلتا رہا صرف اس کے اختیارات مقامی صوبے داروں و راجاؤں کے ہاتھ میں رہے۔ مرہٹوں کے حملوں کی وجہ سے گجرات و مالوہ و دیگر علاقوں میں کچھ مدت تک کے لیے بدانتظامی رہی اور وہاں کے عوام کو بہت تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن مرہٹوں کا پورا تسلط قایم ہو جانے کے بعد وہاں کی حالت پھر سدھر گئی۔ 1742ء کے بعد مرہٹوں کے حملوں کی وجہ سے بنگال، دکن، دواب اور پنجاب میں بھی بدنظمی پھیل گئی حقیقت میں بدنظمی کا زمانہ یہی ہے 1772ء کے بعد دلی پر مہادجی سندھیہ کا قبضہ ہو جانے کے بعد ان علاقوں کی حالت میں اصلاح ہوئی لیکن اسی زمانے میں انگریز دکن اور بنگال میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے تھے یہی مغلیہ سلطنت کی تنزلی کا اصلی زمانہ ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے مغل سلطنت کا زوال اتنا اہم نہ ہوتا اگر اس کی جگہ پر ہندوستان میں متعارف عناصر کے ذریعے ایک دوسری طاقتور حکومت قائم ہوتی ایسی حالت میں ہندوستان پر غیر ملکی حکومت قایم ہونا آسان نہ ہوتا حقیقت میں مغلیہ سلطنت کا زوال اور ہندوستان کے وسطی دور کے سماج اور تہذیب و تمدن کا کمزور اور زوال پذیر ہو جانا ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہو گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہماری تحقیق کا مرکزی نقطہ صرف مغل سلطنت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے دور وسطی کے سماج و تہذیب کے ارتقا رکا ردِ عمل ہے سوال یہ ہے کہ کیا مغلیہ سلطنت کی انتظامی اور دوسری کارروائیاں ملک کی اجتماعی ترقی میں مددگار تھیں یا رکاوٹ ڈالنے والی۔ یعنی کیا مغلیہ سلطنت کا زوال ہندوستان کے وسطی دور کے سماج و تہذیب تمدن کے زوال پذیر ہونے کا ایک ضروری حصہ ہے۔

عام طور سے زوال پذیر سماج میں کچھ خاص چیزیں پائی جاتی ہیں اقتصادی ترقی کی رفتار رک جانا یا کمزور ہو جانا جس کے نتیجے میں مالی خطرہ گہرا ہو جاتا ہے مستقبل کی جانب مایوس کن نظریات بڑھنا جس کے نتیجے میں تصورات اور نظریات

کند ہو جاتے ہیں۔ سائنسی و تکنیکی ترقی کا رک جانا وغیرہ۔ یہ بہت سی خصوصیات ہمیں اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستانی سماج کب زوال پذیر ہو گیا اس سوال کا جواب دینے کے لیے زیادہ تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ سائنس و تکنیک کے لحاظ سے سترہویں صدی میں یوروپ نے بہت ترقی کی حالانکہ اس زمانے میں بہت سے مغربی تجارت پیشہ لوگ اور سیاح وغیرہ ہندوستان آئے لیکن ہندوستانی حاکم طبقے نے مغربی سائنس کی جانب کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ مغربی سائنس کا احساس صرف دو حلقوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک جنگی حلقہ دوسرا جہاز رانی۔ مغربی توپوں کا ہندوستانی توپوں سے عمدہ ہونا اکبر کے زمانے سے ہی تسلیم کیا جاتا تھا اکبر نے اپنے کارخانوں میں اچھی اور نئی قسم کی توپیں ڈھالنے کا تجربہ بھی کیا اس تجربے کا سہرا خاص طور سے ایک ایرانی فتح اللہ شیرازی کو دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ فولاد کے بنانے میں بھی ترقی ہوئی ہندوستانی بندرگاہوں میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے جہاز اٹھارہویں صدی تک بنتے رہے اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ملا بار میں بہترین ساگوان کی لکڑی پائی جاتی تھی ہندوستان میں بنے جہاز مغرب میں بنے جہازوں سے بہتر مانے جاتے تھے لیکن جہاز رانی کے بارے میں ہندوستانی کافی حد تک ناجانکار اور نوسکھیے رہے۔ اس کی ایک مثال تھیونو کے سفر کی تفصیل سے ملتی ہے ہندوستانی جہاز کے کپتان کو سمندر میں سمت طے کرنے کی مناسب جانکاری تھی۔ جس کے نتیجے میں بحر عرب سے سورت پہنچنے کی بجائے جہاز دمن بندرگاہ پہنچ گیا۔ جہازی بیڑوں کی جنگ میں ہندوستانی اور بھی اناڑی تھے۔

مغربی سائنس و تکنیک کو ٹھکرانا وسطی دور کے سماج اور حکمراں طبقے کے نظریات میں موجود تھا اس کی تمام تر ذمے داری وسطی دور کی روایتوں پر ہے حقیقت میں سائنس کی ترقی عرب ممالک میں بارہویں صدی سے قبل بے جان ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان میں یہ روایت اس سے پہلے ہی مردہ ہو گئی تھی۔

سائنسی نقطۂ نظر سے پچھڑنے کے ساتھ ہی ساتھ سترہویں صدی کے آخری نصف حصے میں اقتصادی انتظامی و سیاسی خطرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل ہم باب اول میں پیش کر چکے ہیں۔ جہاں تک مغلیہ حکمراں

طبقے کا سوال ہے یہ کہنا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال امیر طبقے کی بدکرداری کی وجہ سے ہوا ٹھیک نہیں لگتا۔ مغلیہ حکمراں طبقے کا متحد نہ ہونا اور اس میں الگ الگ قوموں اور مختلف مذاہب میں یقین رکھنے والے لوگوں کی شمولیت مغلیہ حکمراں طبقے کی کمزوری کی وجہ سے نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گروہ بندی کی بنیاد ذات برادری و مذہب نہ ہو کر ذاتی مفادات تھے حاکم طبقے میں مختلف برادریوں اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے ہونے کی وجہ سے مغل حکومت میں آزاد خیالی اور آزاد پالیسی کو سہارا ملا حکومت کو ایک خاص طبقے کی پالیسی پر منحصر کرنے کی کوشش بیکار رہی۔ حاکم طبقے میں مختلف عناصر کو شامل کرنا اور ان میں ایک مشترکہ سماجی و ثقافتی احساس بیدار کرنا مغلیہ سلطنت کا ایک بڑا کارنامہ کہا جا سکتا ہے اس طرح کے مشترک حاکم طبقے کا اس زمانے کے سماج و تہذیب پر اپنا خاص اثر پڑا جس کی وجہ سے افراط و تفریق سے بالاتر آزاد خیال عناصر کو قوت ملی یہ رجحان اٹھارہویں صدی میں کمزور ہونے کی نسبت اور زیادہ قوی ہو گیا اٹھارہویں صدی کے آخری نصف حصے میں شاہ ولی اللہ جیسے علمار نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کے اتحاد کا نعرہ لگایا لیکن اس کا کوئی خاص اثر اس زمانے میں نہیں پڑا۔

جہاں تک کہ اقتصادی و مالی حالت کا سوال ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس زمانے میں پیداوار پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھی راجستھان میں زراعت سے متعلق دستاویزات وغیرہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سیاسی کش مکش کے باوجود اٹھارہویں صدی کے درمیان تک زراعت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ ملکی اور غیر ملکی تجارت پر مغل سلطنت کی مصیبتوں کا کیا اثر پڑا اس کا ابھی تک مناسب مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے سے ہی حکومت میں مالی خطرہ بڑھتا چلا جاتا ہے بہادر شاہ نے آگرے کے قلعے میں جمع شدہ قدیم خزانے کو تقریباً خالی کر دیا اس کی دور حکومت میں جاگیرداری کی رسم کا خطرہ اور بھی بڑھ گیا چھوٹے منصب داروں کی حالت خراب ہو گئی کیونکہ جاگیر ملنے پر بھی اس کی آمدنی بہت ہوتی تھی بہادر شاہ نے امیروں کو بڑے بڑے منصب اور ترقی دے کر حالات کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا خالصہ زمین کو جاگیر میں تبدیل کرنے کے رجحان کی ابتدا اسی وقت سے ہوتی ہے۔

جہاندار شاہ کے زمانے میں حالت اور خراب ہوگئی پرانے قاعدوں اور دستوروں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ خالصہ زمین بھی اجارے پر دی جانے لگی جس سے کسانوں کی حالت اور ابتر ہوگئی اور حکومت کی آمدنی کم ہوگئی خانہ جنگی نے مالی مشکلات کو اور بڑھادیا۔

سید برادران انتظامی امور میں ہوشیار نہیں تھے عبداللہ خاں نے حکومت کا سارا بار اپنے دیوان رتن چند پر ڈال دیا تھا اور اجارے کی بُری روایت عام ہوگئی تھی گروہ بندی کی وجہ سے نظم ونسق کمزور ہوگیا تھا زمینداروں کو سر اٹھانے کا موقعہ ملا اور ان میں سے بہتوں نے مال گزاری ادا نہیں کی۔ دکن میں چوتھ وسر دیش مکھی کے نام پر مرہٹوں نے آدھی مال گزاری پر قبضہ کر لیا۔ جاٹوں اور سکھوں نے بالترتیب آگرہ اور لاہور کے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سید برادران کے زوال کے بعد نظام نے سارے منصبوں اور جاگیروں کو نئے سرے سے معاینہ کرنے اور نااہل لوگوں کو ہٹانے یا ان کے منصب کم کرنے کی تجویز رکھی لیکن مخالف عناصر کی وجہ سے وہ ناکام رہا۔ اس کے بعد قابل ولائق صوبے داروں میں اپنے اپنے صوبوں پر اپنا اثر بڑھانے اور وہاں کی آمدنی کو خود خرچ کرنے کا رجحان بڑھ گیا۔ بادشاہ کا کنٹرول حقیقت میں ایک محدود علاقے تک رہ گیا۔

اس طرح مالی مشکلات اور انتظامی مشکلات ساتھ ساتھ چلتی ہیں جیسے جیسے سلطنت کی مالی حالت کمزور ہوئی اس کا اثر اندرونی انتظام پر پڑا تو بھی مرہٹوں اور نادر شاہ کے خلاف مغل افواج کی شکست کی وجہ ذرائع کی کمی بتانا مناسب نہیں۔ مالی مشکلات کا سیدھا تعلق سیاسی خطرات سے قایم کرنا تاریخی نقطہ نظر سے حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کو مدنظر رکھتے ہوئے مغل سلطنت کے زوال کی بڑی ذمہ داری اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی پر رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اورنگ زیب کی بہت سی پالیسیوں کو نقصان دہ مانتے ہوئے بھی اس بات کو ہشیاری سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان پالیسیوں کا مغل سلطنت پر حقیقت میں کیا اثر پڑا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اورنگ زیب کی موت کے چھ برس بعد جزیہ اٹھالیا گیا اور ہندوؤں پر لگائی گئی پابندیاں (عربی، ایرانی گھوڑوں پر سواری نہ کرنا اور مقدس مقامات پر ٹیکس وغیرہ) ہٹالیے گئے۔ [illegible] لیے انھیں پھر سے اونچے

منصب اور عہدے دیئے جانے لگے بندیلہ راجپوتوں کو بھی رعایتیں دی گئیں 1715 میں جے سنگھ و بندیلوں وغیرہ نے مالوہ میں مرہٹوں کو ہرا دیا اس طرح راجپوت دوبارہ مغل سلطنت کی حفاظت میں لگ گئے۔ میواڑ کے رانا سنگرام سنگھ کے ساتھ بھی مغل بادشاہ کے دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے جے سنگھ و اجیت سنگھ نے مغل دربار کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مرہٹوں کے ساتھ بھی 1709ء 1710ء اور 1712ء میں صلح ہوئی اور ان کا خاص مطالبہ دکن کی چوتھ و سردیش مکھی تسلیم کر لیا گیا۔

اورنگ زیب کی تنگ نظری کی پالیسی کو بالائے طاق رکھ دینے پر بھی مغل حکومت کو نئی زندگی نہیں ملی اس کی خاص وجہ دور وسطیٰ کی سماجی مشکلات تھیں زمینداروں اور کسانوں میں سے کسی کے بھی مفادات مرکز سے متعلق نہیں تھے جب تک مغلیہ حکومت کسانوں کو امن و انتظام دے سکی تب تک کسان اس کے خلاف نہیں ہوئے جب مرکزی عنان حکومت کمزور ہو گئی تب وہ کسی بھی لائق مقامی حاکم کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھانے کے لیے زمیندار ہمیشہ تیار رہتے تھے تجارت پیشہ لوگ جن کا مفاد بڑی اور طاقتور حکومت کے ساتھ منسلک تھا دور وسطیٰ میں سیاسی پیمانے پر زیادہ با اثر نہیں تھے اس لیے مرکزی حکومت کی حفاظت کی ذمہ داری امیر طبقے پر آتی ہے امیر طبقہ رفتہ رفتہ مغلیہ حکومت کے محافظ کی بجائے مخالف بن گیا۔ اس تبدیلی کے بارے میں ہم گذشتہ ابواب میں لکھ چکے ہیں مغل سلطنت کے زوال میں امیر طبقے کی ذمہ داری کتنی ہے اور مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں، راجپوتوں کی کتنی اس معاملے پر مختلف رائیں ہو سکتی ہیں لیکن امیر طبقے کا کافی ہاتھ ہے یہ بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے۔

بنیادی طور پر مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ ۔۔ دور وسطیٰ کی سماجی و اقتصادی حالت ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں صنعت و تجارت کی ترقی کی رفتار بہت دھیمی رہی اور سائنس و تکنیک کے نقطہ نظر سے ہندوستان دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے پیچھے رہ گیا۔ اس کی وجہ سے جاگیرداری کی روایت کی مشکلات بڑھیں جس کی وجہ سے حکومت میں کمزوری امیر طبقے میں بے اطمینانی اور گروہ بندی

نچلے طبقے میں رشوت خوری بڑھ گئیں اچھی جاگیر حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا یا گروہ بنانا ضروری تھا اس گروہ بندی کی وجہ سے آپسی رنجشیں بڑھتی چلی گئیں اور آخر میں لائق اور اولوالعزم امیروں نے اپنی الگ الگ ریاستیں قایم کرنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل مرہٹوں کی بلند خواہشات کو سمجھنے میں مغلیہ حاکم طبقہ ناکام رہا ان سب کا اثر دربار کی پالیسی اور شمالی مغربی سرحد پر پڑا۔ اس زمانے کے لوگوں کی پالیسیاں اور کردار کی کمزوریاں مغل سلطنت کے زوال کے تجزیے میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں لیکن انھیں اس وقت کے سماجی و اقتصادی حالات اور رجحانات کے حوالے میں جانچنا ضروری ہے۔

اختتامیہ تصریحات

گذشتہ صفحات میں زیر مطالعہ حالات کی روشنی میں، اورنگ زیب کی وفات کے بعد امرا کے کردار وعمل اور اٹھارہویں صدی میں سیاسیات کے رخ کے خاص خاص پہلوؤں پر توجہ مبذول ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آخری مغلوں کے دربار میں امرا کا عمل اور کردار قومی یا سیاسی گروہ بندی پر مبنی تھا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت کے اواخر میں، دربار میں جو گروہ بندیاں وجود میں آئیں وہ یا تو قبیلہ اور خاندان یا تعلقات، وابستگی اور شخصی مفادات پر بنیاد رکھتی تھیں۔ چنانچہ ذوالفقار خاں جو ایرانی تھا۔ اس کی پشت پناہی پر عبدالصمد خاں جیسے تورانی امرا، داؤد خاں پنی جیسے افغان امرا اور راؤ رام سنگھ ہاڑا اور دلپت بندیلہ جیسے ہندو سردار بھی تھے۔ سید برادران جو ہندوستانیوں کے ہمدرد کہے جاتے تھے۔ انھوں نے ایسے تورانی امرا جیسے نظام الملک، محمد امین خاں اور عبدالصمد خاں وغیرہ کی وابستگی کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن فرخ سیر کی معزولی کے بعد نظام الملک نے تسلط جمانے کی کوشش کی۔ اس نے قومیت اور مذہب کے نعرے بلند کیے، اور یہ کہا کہ سید برادران کےخلاف مہم تمام مغلوں کی عزت و ناموس کی خاطر چھیڑی گئی تھی چاہے وہ ایرانی ہوں یا تورانی اور یہ کہ سلطنت اور اسلام، سید برادران اور ان کے اہل ہنود ہمدردوں کے سبب سے خطرے میں پڑ گئے تھے بہرحال دو راجپوت راجا جے سنگھ اور راجیت سنگھ میں سے اول الذکر سیدوں کا سخت ترین مخالف تھا، چھبیلا رام ناگر اور دیا بہادر نے سید برادران کی حاکمیت کا طاقت کی نوک پر مقابلہ کیا، جہاں تک مرہٹوں سے سیدوں کی مفاہمت کا تعلق ہے، خود کٹر مذہبی نظام الملک نے بھی 1724 اور اس کے بعد مرہٹوں سے مفاہمت کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا اور یہ

سب کچھ اس نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کیا۔ اس کے بعد کے عرصے میں وزیر قمرالدین خاں، سعادت خاں، برہان الملک (اودھ کی ریاست کا بانی) محمد خاں بنگش جو ایک افغان تھا اور جودھ پور کے راجہ ابھے سنگھ کا وغیرہ کا ایک اپنا الگ گروہ تھا جب کہ خان دوراں (تورانی نسل کا وارث) اور راجہ جے سنگھ کچھ دوسرے افغان سرداروں کے ساتھ اپنا ایک علیحدہ گروہ بنائے ہوئے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومیت نسل اور مذہب کے نعرے انفرادی طور پر خود غرض امراء کے بلند کیے ہوئے تھے اور اصل گروہ بندی قومیت نسل اور مذہب سے قطعاً متاثر نہیں تھی۔

دربار میں گروہوں کے وجود میں آنے کا پس منظر، شہنشاہیت کے وقار کے زوال کے سبب سے تھا جو مرہٹوں، جاٹوں اور مرہٹوں کی مخالف تحریکوں سے اطمینان بخش حد تک نہ نپٹنے کی وجہ سے معرض وجود میں آیا۔ اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد کی خانہ جنگی نے حکومت کی صورت حال کو مزید کمزور کر دیا خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے بعد سے کوئی کامیاب حکمراں تخت نشین نہ ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ جاگیری نظام کے زوال پذیر ہونے سے جس کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی جاگیروں کی بخشش میں دیر لگنے لگی اور اگر کوئی جاگیر دے بھی دی جاتی تھی تو اس کی دستاویز اور اس کی آمدنی کے درمیان طویل وقفہ حائل ہو جاتا تھا۔ دربار میں گروہ بندیوں کا ایک سبب، آسان اور قابلِ حصول جاگیروں کو حاصل کرنے کی کوشش میں بھی مضمر تھا۔ جو سب سے زیادہ با اثر گروہ ہوتا اسی کے ساتھ اچھی سے اچھی اور زیادہ سے زیادہ جاگیریں لگ جاتیں۔ ہر گروہ با اثر امراء اور اس کے وابستگان پر مشتمل تھا۔ وزارت کے لیے جو کشمکش تھی وہ ایسے ہی با اثر گروہوں کے درمیان تھی۔ یہ با اثر گروہ ملک کے سیاسی حالات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے تھے اور وہ اس صورت میں کہ دربار کے اعلیٰ عہدوں پر قبضہ کر لیتے خصوصاً وزارت اور میر بخشی والے منصبوں پر۔ اسی کے ساتھ ساتھ شہنشاہ پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی اور صورت حال پر قابو رکھنے کے لیے حریف امراء سے شہنشاہ کے میل ملاپ کو محدود کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ چنانچہ وہ ان عہدوں پر بھی قبضہ جمانے کی کوشش میں رہتے تھے جو شہنشاہ

کی رسائی سے وابستہ تھے۔

وزارت کے لیے کش مکش سلطنت اور امرا کے درمیان کی کشمکش نہ تھی کیونکہ امرا کا کوئی مشترک مفاد یا مقصد نہ تھا۔ درحقیقت وہ چند امور جو ان کے درمیان مشترک تھے ان میں سے ایک تیموریوں کے حکومت کرنے کا پیدائشی حق تھا کیونکہ امرا میں سے کوئی گروہ نئی حکومت قایم کرنے لائق مضبوط نہ تھا لیکن تیموری ابھی تک کافی وقار اور عزت کے مستحق سمجھے جا رہے تھے۔ لیکن وزارت کی کوشش میں طاقت اور عہدوں کی کش مکش ہی کو کارفرما سمجھنا غلط ہے۔ ذوالفقار خاں اور سید برادران نے جو عرصہ تک ایک با اثر صورت حال قایم کیے رہے ایسے اقدامات کرنے کی کوشش کی جس سے کہ مغل حکومت کی عمر میں کچھ اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ امرا محض خود اپنے لیے طاقت و اثر اندازی کے خواہاں نہ تھے لیکن ان کی اعلیٰ منصبی کے سبب سے باقی امرا کو ان سے حسد ہونے لگی جنھوں نے ان کے اثر اور ان کے عہدوں میں توڑ پھوڑ کرنے کی کوشش کی۔

یہ بحران ٹل گیا ہوتا اگر وزرا کو اپنے حکمرانوں کا اعتماد حاصل ہوتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وزرا سلطنت کو زندہ رکھنے والی اصلاحات اور صورت حاصل پر عمل پیرا ہو سکتے تھے لیکن چونکہ وزرا اپنا منصب اپنی سیاسی اور فوجی طاقت پر حاصل کرتے تھے تو سلاطین کو خود غرض لوگ یہ سمجھا دیتے تھے کہ ایک با اثر اور طاقت ور وزیر سلطان کو بے اثر اور بے کار کر سکتا تھا اور یہ کہ وہ کسی نئی نسل کو تخت نشیں کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتا تھا۔ اسی لیے سلاطین بجائے توازن و استحکام کا سبب بننے کے خود اپنے وزرا کے خلاف سازشوں کا ایک مرکز بن گئے۔ وزارت کی طرف اس رجحان سے زبردست اندرونی خلفشار پیدا ہوئے جس سے کہ پورے دربار اور امرا میں گروہ بندی ہوتی گئی اور یہ گروہ ایک دوسرے کے مخالف ہو کر تسلط جمانے کی کوشش کی طرف راغب ہو گئے۔ یہی حالات تھے جن سے فائدہ اٹھا کر سید برادران نے تخت نشیں شہنشاہ کو معزول کرنے کی جرات کی تاکہ اس کی جگہ اپنی پسند کا کوئی دوسرا حکمراں تخت نشین کر سکیں اور حکومت کی اصل باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیں۔ لیکن یہ اقدام خود اپنے مقصد کی

ناکامی کا ذریعہ ثابت ہوا کیونکہ تمام ممتاز امراء ان کے خلاف متحد ہو گئے جس سے بالآخر سید برادران کا زوال ہو گیا۔

چونکہ سید برادران سلاطین کی پشت پناہی حاصل نہ کر سکے، انھوں نے اپنے ایسے مددگاروں کی ایک جماعت تیار کرنی شروع کر دی جو اپنے حریفوں نیز شہنشاہ کو مرعوب کر سکے۔ اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ایک کامیاب وزیر ایک نئے خاندان کو تخت نشیں کر سکتا تھا لیکن امراء میں سے کوئی اور جماعت اتنا مضبوط نہ بن سکی کہ باقی پر حاوی ہو سکے۔ اس لیے کسی نئے خاندان کو تخت نشیں کرنے کا سوال پیدا نہ ہو سکا اب اتنا ضروری تھا کہ کوئی بیرونی طاقت مداخلت کر کے حکمران خاندان کو معزول کر دے۔

لیکن اگر کوئی لائق حکمراں حکومت کو چلانے کے قابل نہ ہوتا یا اگر کوئی طاقتور وزیر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لائق نہ ہوتا تب یہ خطرہ ضرور لاحق ہوتا کہ طاقتور امراء آزادانہ طور پر اپنے لیے علاقے انتخاب کر لیتے اور اس طرح حکومت کو تقسیم کر دینے میں معاون ہو جاتے تھے۔ اس طرح شہنشاہوں کے سامنے یہ مسئلہ رہا کہ ایک طاقتور وزیر سلطنت کو تقسیم کر دینے کا سبب بنا رہا۔

نظام الملک کے سامنے سیدوں کے زوال کے بعد یہی صورت حال سامنے آگئی اور سیدوں کو نظام الملک نے حکمران خاندان کا دشمن قرار دے دیا تھا۔ اس کو دربار کے قوی گروہوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور شہنشاہ کی خفیہ دشمنی سے بھی سابقہ کرنا پڑا۔ نظام الملک نے دربار کو چھوڑ دینا پسند کیا اور اس نے دکن میں اپنے لیے ایک الگ علاقہ انتخاب کر لیا اس عمل کا دوسرے امراء نے بھی ارتکاب کیا۔ ان امراء نے بڑے بڑے علاقوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور شہنشاہ کے لیے برائے نام وفاداری کا اظہار جاری رکھا۔

اس طرح وہ ممتاز امراء جو حکومت کو مستحکم و مضبوط بنانے میں معاون و مددگار ہو کر دکھاتے، وہی سلطنت کی تخریب کے ذرائع ثابت ہوئے وزارت کے لیے جد و جہد کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ مغل شہنشاہوں کی جیسی استعماری شہنشاہیت کسی ایسی قسم کی طرز شہنشاہیت میں محدود دائرہ جاننے کی اہلیت

نہ رکھتی جس میں کہ شہنشاہ محض حکومت کر کے اتحاد کی علامت بن سکتا اور وزیر حکومت کی مشین کے مرکزی پرزہ کا کام کرتا رہتا۔ مغل استعماریت کی جگہ یا تو کوئی دوسری استعماریت لے سکتی تھی یا اس کی جگہ مرکزی طاقت کے توازن کے ماتحت ملک کی تمام ریاستیں خود کو منظم کر لیتیں۔ وہ سماجی طاقتیں جنھوں نے کہ انگلستان میں ایک آئینی بادشاہت کو ممکن الوقوع بنا دیا تھا۔ وہ سترہویں صدی کے ہندوستان میں نہایت کمزور اور بے بضاعت تھیں اس لیے جاگیردارانہ نظام میں جو تخریب کارانہ طاقتیں ہوتی ہیں وہ یہاں پر پوری طرح کارفرما تھیں۔

وزارت کی جدوجہد سیاسی صورتِ حال سے متعلق جدوجہد بھی تھی۔ اس الجھاؤ کا تعلق کچھ ایسے بنیادی مسائل سے تھا جن کو مغل سلطنت کو اس وقت سے سابقہ پڑ رہا تھا جب سے اس کا آغاز ہوا تھا اور خاص طور پر اس دوران میں جبکہ اورنگ زیب حکمراں تھا۔ چنانچہ راجپوت ریاستوں اور انفرادی راجپوت راجاؤں کی طرف رجحان، ہندوؤں کا شہری مرتبہ اور جزیہ لگانے کا سوال سے مرہٹوں کے لیے کس قسم کا انداز اختیار کیا جائے اور ایسے جنگجو گروہوں جیسے کہ جاٹ قوم ان سب سے کس سیاسی صورت حال کو وقوع میں لاکر نپٹا جائے، یہ سب مسائل سیاسی گروہوں کے زیر نظر رہتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ سوال تھا کہ کیا سلطنت کی بنیاد مسلمانوں پر یعنی مذہبی اور ملّی نظریات پر اٹھائی جائے یا یہ کہ اس کی بنیاد وسیع النظری، ہندو مسلم اتحاد اور غیر مذہبی اصولوں پر رکھی جائے۔ بہادر شاہ کے دورانِ حکومت میں بھی جاٹوں اور راجپوتوں کی طرف ایک نرمیت کا رجحان تھا۔ چنانچہ جزیہ جمع کرنے کے سلسلے میں کافی لچک سے کام لیا جاتا تھا۔ جہاندار شاہ کی حکومت کے زمانے میں ذوالفقار خاں نے جزیہ منسوخ کر دیا اور راجپوت راجاؤں کو اونچے عہدے اور بڑے بڑے منصبوں کا یقین دلایا۔ اس نے پہلے ہی شاہو سے دکن کی چوتھ اور سر دیش مکھی کی ادائیگی کے بارے میں معاہدہ کر رکھا تھا۔ ذوالفقار کی معزولی کے بعد اس کی طرز سیاست کو سید برادران نے اختیار کیا۔ انھوں نے دوبارہ سلطنت کو ہندو اور مسلم اتحاد کی وسیع النظرانہ بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں، راجپوتوں اور مرہٹوں کی ملی جلی

حکومت کو قایم کرنے کے سخت اقدام کا آغاز کیا۔ انھوں نے جاٹ سرداروں کو بھی مراعات دینی شروع کر دیں۔ (البتہ سکھوں کے لیے اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا) اس بات کی تفصیل میں جانا ہمارے سیاق و سباق سے غیر متعلق ہے کہ حالات کے دباؤ میں آکر ان کو بھی اس قسم کی مراعات دینی پڑیں اور یہ مراعات کسی سوچی سمجھی پالیسی کا نتیجہ نہ تھیں بلکہ ایک قسم کی کمزوری کا مظہر تھیں۔ بہر حالات جو بھی رہے ہوں وہ اس وقت میں کار فرما سماجی طاقتوں کا ایک مؤثر اشاریہ ضرور ہیں یہ نئے رجحانات امرا کی چند ان جماعتوں کی خواہشات کے برعکس تھے۔ جو سیدوں کی مخالف تھیں اور جو ان کو ہندو نوازاور سلطنت اور بادشاہت اور "مذہب و ایمان" کے منافی کہتے تھے۔ لیکن نظام الملک کی وہ کوششیں جن کے ذریعہ وہ اورنگ زیب کی پالیسی کی طرف واپس لوٹ کر جانا چاہتا تھا۔ امرا کی کثیر جماعتوں کی طرف سے اختلاف اور ناراضی کا نشانہ بن گئیں اور ان ماتحت اہل کاروں اور عہدیداروں نے بھی اس سے اختلاف کیا اور کہا جاتا ہے کہ ماتحتوں میں ہندوؤں اور ہندوستانیوں کی تعداد کثیر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک دربار سے رخصت ہو گیا اور اس نے دکن میں اپنے لیے ایک نیم آزاد ریاست کی تخلیق کر لی۔

چنانچہ یہ واضح ہے کہ اورنگ زیب کے نام سے منسوب علیٰحدگی کی پالیسی صرف مختصر مدت تک ہی جاری رہ سکی۔ مغل حکومت کے ایک سو ستانوے سال کے عرصہ میں جو 1526ء سے لے کر نادر شاہ کے 1739ء کے حملے کے درمیان میں گزرا، جزیہ صرف 57 سال ہی وصول کیا جا سکا۔ اگرچہ اس سے ہندوؤں کی طرف حکومت کے رجحان، اور کٹر مذہبی عناصر کے جھکاؤ کا جو اس مدت کے درمیان کی حکمرانی میں شامل تھے کوئی مستقل اشاریہ نہیں ہے پھر کم از کم ایک قسم کا جائزہ ضرور ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کو ممکن الوقوع بنانے والی طاقتیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشترک تمدن یہ سب چیزیں متعدد صدیوں سے کار فرما تھیں اور یہ اتنی طاقتور ہو چکی تھیں کہ عارضی سیاسی مسائل ان کے رخ کو موڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اٹھارہویں صدی کی نمایاں تصویر یہ نہیں ہے

کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے خلاف تخریبی جماعتیں بنا رکھی تھیں بلکہ یہ لوگ تمدنی اور سماجی زندگی میں باہم اشتراک سے کام لیتے تھے اور ان کے سیاسی اختلافات میں مذہبی عصبیت کا عنصر قطعاً کالعدم رہتا تھا۔ البتہ اتفاقیہ واقعات ایسے ضرور ملتے ہیں جن میں مذہبی تفریقی جذبات کارفرما ہوں کچھ مذہبی مفکرین نے معاصر سیاسی کش مکش کی مذہبی اصطلاحات میں تشریح کرنے کی کوشش کی چنانچہ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کو مغل حکومت کی بقا کے لیے منظم ہو جانے کو کہا اور انھوں نے مرہٹوں کو مذہب اسلام کا دشمن قرار دیا۔ ایسا نہ تھا کہ ہندوؤں میں ان کے جیسے متوازی اور ہم مثل مفکرین نہ تھے اگرچہ ہندوؤں میں کسی ایک ممتاز شخصیت کا نام لے دینا ممکن نہیں ہے۔ لیکن منجملہ طور پر شمالی ہندوستان پر تسلط جمانے کی مرہٹوں کی جدوجہد، سماجی زندگی کے معمولات کو غیر متوازن نہ کر سکیں اور نہ اس سے شمالی ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کے تعلقات پر کوئی غیر معمولی برا اثر ہی پڑا۔

سیاسی وفاقی اور سیاسی اختلافات کی بنیاد کے پیچھے سیاسی مفادات کارفرما ہوتے تھے۔ چنانچہ اپنے مفادات کے پیش نظر اور اپنی ضرورت کی مناسبت کے مطابق نظام الملک بھی مرہٹہ طاقتوں کے خلاف مغل سلطنت کی بقا کے حق میں جنگ آزما ہونے کو تیار ہو جاتا تھا دوسری طرف مغل شہنشاہ اور اس کے ہم نوا جب ضرورت دیکھتے خود مرہٹوں کو نظام الملک کے خلاف بھڑکا دیتے تھے۔ شروع شروع میں راجپوتوں اور بندیلوں نے مرہٹوں کی شمالی ہندوستان کی طرف دست درازی کو روکنے کی کوشش کی اس کے بعد بندیلوں نے کبھی تحفظ کی خاطر اور کبھی حملہ آور ہوتے وقت مرہٹوں کے ساتھ رابطہ اتحاد قایم کر لینے کو مناسب جانا دوسری طرف سوائی جے سنگھ، مغل دربار اور اس کے حریفوں کے درمیان صلح اور امن قایم رکھنے میں مددگار ہونے کا فرض انجام دیتا رہا۔ ادھر راٹھور حکمراں، ابھے سنگھ مرہٹہ حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ حد یہ ہے کہ جے سنگھ نے بھی کبھی مرہٹوں کے ساتھ کوئی رابطہ اتحاد مستقل طور پر قایم نہیں کیا اگرچہ اس قسم کے بے بنیاد الزامات غلط سلط مواد کی بنیاد پر اس کے خلاف لگاتے گئے ہیں۔

اس کے ایک عرصے کے بعد ایسا وقت بھی آیا کہ جاٹوں اور اودھ کے نواب نے مرہٹوں سے دوستی قایم کی لیکن موخر الذکر کی لوٹ مار سے تنگ آکر عین جنگ پانی پت کے موقع پر ان سے رشتہ منقطع کر لیا۔

مراہٹوں نے بھی اپنی جانب سے ہندو پد پدشاہی کے فلسفہ کو خیرباد کہا اور اب صرف یہ خواہش رہی کہ ملک پر شہنشاہ کے نام میں حکومت کی جائے اور ہر ممکن طور پر دوسرے مغل امراء کی طرح طرز اور انداز اختیار کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اٹھارہویں صدی کی سیاسیات کا بنیادی رجحان قطعاً غیر مذہبی تھا۔ تمدن کے میدان میں بھی تعصب اور تنگ نظری کا کوئی وجود نہ تھا۔ مرہٹوں نے پوری طرح اور لمبے پیمانے پر مغل دربار کے طرز کو اختیار کر لیا تھا۔ اس سے مرہٹہ سماج میں شمالی ہندوستان کی بہت سی رسومات اور اعمال و افعال داخل ہوتے چلے گئے۔

اٹھارہویں صدی کے دوسرے اور تیسرے اعشاریے (decade) میں شمالی ہندوستان کی طرف مرہٹوں کی تیز قدمی اور مغل دربار کی ان کا مقابلہ کرنے اور ان کو روکنے میں بے بعناعتی اور ذہنی انتشار اس خیال سے ذمہ دار ہے کہ من جملہ طور پر مغل امراء زوال پذیر اور بے روح ہو چکے تھے۔ مغل امراء کے اس نام نہاد زوال کے لیے متعدد اور مختلف اسباب بتائے گئے ہیں مثلاً انتہائی عیش پرستی، لمبے چوڑے پیمانے پر حرم سراؤں کا قیام، ہندوستان کی جرات کش آب و ہوا' اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی جس نے مسلمانوں کو جنگ آزمائی کے دقیانوسی پیشہ میں محدود کر دیا تھا۔ مغل امراء کی گوناگوں نوعیت، اورنگ زیب کے بعد وسط ایشیا کی جنگ جو اقوام کی شمولیت کا خاتمہ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر اسباب تو بالکل ہی بے اصل اور بے بنیاد ہیں اور انفرادی اور اجتماعی طور پر الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ اس نظر سے پیش کیے گئے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں غوریوں کے حملے کے بعد سے جو تبدیلیاں آئیں ان کی تشریح کی جا سکے۔ لیکن زوال پذیری کو سماجی حالات کا نہیں بلکہ اقتصادی حالات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ تاریخ میں ایسا کوئی عہد نہیں گذرا جب کردار اور قابلیت و اہلیت کے جوہر رکھنے والی شخصیتوں کا مکمل فقدان ہو گیا ہو۔ چنانچہ

اگر اسی اصول پر پرکھا جائے تو اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل کو شاید ہی زوال پذیری کا عہد قرار دیا جاسکتا ہو. کیونکہ اس عہد میں ہمیں قابل حکمرانوں، سپہ سالاروں اور صاحبان علوم وفنون کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جس میں بادی النظر ہی میں ہمیں ایسے ممتاز لوگوں کے نام ملتے ہیں جیسے سید برادران، نظام الملک، عبدالصمد خاں اور زکریا خاں سعادت خاں اور صفدر جنگ، مرشد علی خاں اور جے سنگھ سوائی وغیرہ وغیرہ یہ دوسری بات ہے کہ ان حضرات کی قابلیتیں سلطنت کے استحکام کے لیے استعمال نہ ہوسکیں۔ بلکہ انھوں نے اپنے تمام جوہر اپنے انفرادی مفادات اور اپنے علیٰحدہ علیٰحدہ علاقے حاصل کرنے میں خرچ کر دیے[1]

اس لیے تاریخی اعتبار سے زوال پذیری ضرور ہے۔ اگر اس کا مطلب ایک ایسے سماج سے مراد لیا جائے جو اقتصادی طور پر ترقی پذیر نہ رہا ہو۔ ایسے سماج کے اپنے علیٰحدہ ہی خد و خال ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک نہایت عمیق مالی بحران قنوطیت اور مستقبل میں یقین کا فقدان جس سے کہ اکثر غیر معقول اور غیر رجائی فلسفیوں کی بنیا دپڑ جاتی ہے۔ نیز سائنسی اور تکنیکی عمل میں ٹھہراؤ آجانا ——— وغیرہ وغیرہ اس زوال پذیری کے بہت سی علامات تو ستر ہویں صدی کے

---

[1] ان امراء کے عین حیات، من جملہ طور پر ایک مہذب و منظم حکمرانی کے فرائض اپنے اپنے علاقوں میں بخیر وخوبی انجام دیتے رہے۔ وہ "عظیم لاقانونیت" جس کی طرف برطانوی مورخین بار بار اشارہ کرتے آئے ہیں اور جس کو وہ ہندوستان پر برطانوی حکومت کے جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ نہ تو اسقدر عریض وطویل تھا اس قدر طویل المدت جتنا کہ ان لوگوں نے بتایا ہے ان علاقوں میں جو کسی ایک "نواب" کے زیر انتظام لائے جا چکے تھے یا جو مرہٹوں کے اقتدار میں آگئے تھے، جو طرز انتظام پہلے سے چلا آرہا تھا وہی بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہا۔ خصوصاً اضلاعات اور پرگنوں میں اور یہی علاقے بعد میں برطانوی انتظام کے ماتحت آگئے۔ دراصل زیادہ تر علاقوں میں بدنظمی اور لاقانونیت کی تاریخ پانی پت کی تیسری جنگ سے شروع ہوتی ہے اور خصوصاً اس وقت سے جبکہ برطانوی لوگوں اور دیگر غیر ملکیوں نے ہندوستانی ریاستوں کے اندرونی معلامات میں دخل اندازی کا آغاز کیا۔

نصف دوم اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں بھی ملتی ہیں لیکن یہ امر اس کتاب کے سیاق و سباق سے غیر متعلق ہے کہ اس عہد کے اقتصادی رجحانات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اس زوال کی حقیقت یا اس کے اسباب کی تفصیل میں جایا جائے۔ تاوقتیکہ اہل تحقیق کسی اس قسم کی تحقیق کو مکمل کر کے ہمارے سامنے رکھیں۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے سیاسی و سماجی رجحانات سے متعلق ہمارے نتائج کو محض اندازے ہی سمجھنا چاہیئے۔

بہر حال یہ کہدینا بھی بہت زیادہ غلط نہ ہوگا کہ مغل سلطنت کا زوال صرف اس کے امراء کے کردار یا اہلیتوں کی گراوٹ کا نتیجہ نہ تھا اور نہ ہی یہ امراء میں تمدنی تہذیبی، مذہبی یا سماجی عناصر کے باعث وقوع پذیر ہوا۔ وہ گروہ اور جماعتیں جو بعد کی مغل سیاسیات پر اثر انداز ہوئیں۔ ان کو قوم پرستی کے یا تمدن و تہذیب یا معاشرہ کے اصولوں پر ترتیب نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور مذہبی عناصر کے اختلافات نے تو وسیع النظری اور فیاضانہ طرز سیاست کو ممکن بنایا اور کسی ایک گروہ یا جماعت کے علیحدگی پسندانہ تسلط کے قیام کو ممکن الوقوع ہونے سے روک دیا کیونکہ اگر اس قسم کا تسلط قایم ہو جاتا تو بھی مغل شہنشاہیت کے لیے کچھ کم ضرر رساں ثابت نہ ہوتا اور اس سے شاید بہت زیادہ مضر قسم کے نتائج مرتب ہوتے۔ ان مختلف عناصر کا کامیابی سے کسی ایک گروہ کی شکل میں ترتیب پا جانا اور اس جماعت میں ایک مشترک نظریئے اور مشترک معاشرتی اقدار کا اختیار پا جانا اور ان امور کو مغل شہنشاہوں کا زبردست کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک ایسی حکمراں جماعت کی تخلیق ہم عصر ہندوستانی تمدن اور معاشرہ پر بہت صحتمندانہ طریقے سے اثر انداز ہوئی جس سے معاشرہ میں ایک وسیع النظرانہ اور ایک آفاقی اور ایک متحدانہ نظریہ پیدا ہوا۔ یہ نظریہ اورنگ زیب کے دور حکومت میں بھی ختم نہ ہو سکا بلکہ اس کو واضح طور پر اٹھارہویں صدی میں بھی کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔

وہ اقتصادی اور مالی بحران جو سترہویں صدی کی ایک خصوصیت تھی در جو اورنگ زیب کی حکومت کے دوران ایک نازک ــــ شکل اختیار کر گیا۔

وہ اٹھارہویں صدی میں ایک شدید ترین مسئلہ بن گیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے وقت تک (1712ء) پچھلی نسلوں کے جمع کردہ خزانے ختم ہو چکے تھے چھوٹے درجہ کے منصب داروں کے لیے تو اپنی جاگیروں کی آمدنی سے اپنی گزر بسر کرنا بھی دشوار ہوگیا تھا۔ اور یہ آمدنی ان کی کاغذ پر رکھی ہوئی آمدنی کا ایک عشرعشیر بھی نہ تھی اور یہ بھی سال بہ سال بہت مختلف اور غیر معتبر رہتی تھی۔ انعامات اور جاگیریں لٹانے میں بہادر شاہ کا عدم احتیاط یا تو منصبوں کو بے معنی کیے دے رہا تھا (کیونکہ افواج وغیرہ رکھنے کی لازمی تعداد کو برقرار رکھنے کے لیے ذرائع میسر نہ تھے) یا اس سے خالصہ کی زمینوں کے تر دبرد ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوا جا رہا تھا۔

جہاندار شاہ کے زمانے میں یہ عمل اور تیز ہوگیا۔ تجارت کے مقرر کردہ اصولوں کی دھجیاں اڑائی جا چکی تھیں اور خالصہ زمینوں کو زیر کاشت لے آنا بھی گویا عام ہوگیا تھا۔ ایسے حالات میں کاشتکاری کی اصلاح اور اس کی توسیع پر زیادہ توجہ مبذول نہ کی جا سکی۔ اس کے برخلاف مال گذاری کی کاشت سے بٹائی کی کرایہ داری کی رسم پڑ گئی جس سے کاشت کاروں پر بہت برا اثر پڑا۔ اس سے مال گذاری کی اصل رقم اور بھی تقلیل ہو گئی۔ خانہ جنگیوں سے رہے سہے خزانوں کا اور بھی خاتمہ ہوگیا۔

سیدوں نے کسی موقعہ پر بھی مالی اور انتظامی معاملات میں کسی کامیاب پالیسی کا ثبوت نہیں دیا۔ عبداللہ خاں نے اپنے تمام معاملات کو رتن چند کے ہاتھوں میں دے دیا تھا اور رتن چند خالصہ زمینوں کی کاشت کی غلط رسم پر ڈٹا رہا۔ دربار میں جماعتوں اور گروہوں کی تقسیم سے زمیندار اور باغی عناصر کی بہت ہمت افزائی ہوئی اور انھوں نے مال گذاری و محصول کی ادائیگی کو بند کرنا شروع کر دیا۔ دکن میں مرہٹوں نے تقریباً کل کا نصف محصول وصول کرنا شروع کر دیا اور آگرہ اور لاہور میں جاٹوں اور سکھوں نے بدامنی پیدا کر رکھی تھی۔

سیدوں کے زوال کے بعد نظام الملک نے یہ ایک جرات مندانہ اقدام کیا کہ ان جاگیروں کی تفتیش شروع کر دی جو امراء اور ماتحت اہل کاروں کے ہاتھ میں تھیں اور اس نے خالصہ زمینوں کی کاشت کو منسوخ قرار دیا۔ لیکن وہ اپنے منصوبوں پر عمل درآمد نہ کر سکا اور اسے حکومت میں اصلاح کرنے کی کوشش کو چھوڑ دینا پڑا۔

اس کے بعد صوبے داروں اور امراء نے نیم آزاد ریاستوں کو قایم کرنا اور زمینداروں نے محصول دینا بند کر دیا۔ نتیجتاً شہنشاہ کا اصل اثر و رسوخ دہلی کے قرب و جوار ہی تک محدود ہو کر رہ گیا اس کی آمدنی کا صرف یہی محدود ذریعہ رہ گیا تھا یا وہ خراج جو اس کے "ماتحت" حکمراں اس کو کبھی کبھی بھیجدیا کرتے تھے۔ اس طرح سیاسی بدحالی کے ساتھ مالی اور انتظامی بحران تیز ہوتا گیا اور اس کے نتیجہ میں سیاسی صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

اس عرصے کے حالات کی تبدیلیوں کے پیش نظر مغل شہنشاہیت کے زوال کا سب سے بڑا سبب اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو قرار دینا غیر تاریخی اور غیر واقعی معلوم ہوتا ہے۔ ان جدید ذہنوں کو جن کی پرورش بے تعصبی کے غیر مذہبی ماحول میں ہوئی ہے، اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے کچھ خد و خال کتنے ہی غیر مناسب اور زوال پذیرانہ معلوم ہوتے ہوں، تاریخ کی جانب ایک حقیقت پسندانہ نظریے کا تقاضہ ہے کہ اسباب اور نتائج کے درمیان کی حد فاصل کو گرا دیا جائے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بمشکل تمام چند ہی برسوں کے بعد اس قسم کے متعصبانہ او تفریقی رسوم کو ترک کر دیا گیا تھا جیسے کہ جزیہ یا ہندوؤں کو عراقی اور عربی گھوڑوں کے استعمال کی اجازت نہ ہونا یا گلال یا ریس ان کے پالکی کے استعمال پر پابندی ہونا وغیرہ وغیرہ جودھ پور سے مغل افواج کو واپس بلا لیا گیا تھا اور راجپوت راجاؤں کو دوبارہ اونچے اونچے منصب اور جاگیریں دی جانے لگی تھیں۔ 1713ء میں جے سنگھ، اور بندیلیوں نے، مالوہ میں مرہٹوں کو شکست فاش دینے کے لیے باہمی اتحاد قایم کر لیا تھا۔ مغل دربار کی سیاست میں جے سنگھ اور راجیت سنگھ دونوں کا کچھ کم اثر نہ تھا۔ مرہٹوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ شاہو کو نظر بندی سے رہا کر دیا گیا تھا۔ اور اسے شواجی کے سوراجیہ کی سرحدوں کا اختیار سونپ دیا گیا تھا 1718ء میں مرہٹوں کو باقاعدہ طور پر دکن کی چوتھ اور سردیشں مکھی ادا کی جانے لگی تھی۔ نیز اس زمانے میں مندروں کے انہدام اور زبردستی سے تبدیل مذہب کروانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی حقیقت تو یہ ہے کہ اورنگ زیب کی پالیسوں سے یکسر دست بردار ہو جانے سے بھی

اب مغل شہنشاہیت کو کوئی طاقت زوال پذیر ہونے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اس حکومت کی شکست و ریخت کے لیے متعدد عناصر ذمہ دار تھے۔ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے سماج میں شہروں اور دیہی علاقوں میں لازمی اور بنیادی اقتصادی اتحاد کی سخت کمی تھی۔ گاؤں کی خود کفیل اکائیوں میں جو ایک اقتصادی علیحدگی تھی وہ سیاسیات میں بھی علیحدگی کا سبب بنتی گئی۔ مغلوں نے متعدد سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی طریقوں سے اس علیحدگی سے پیدا شدہ خلیجوں کو پاٹنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان طریقوں اور پالیسیوں کی تفصیل میں جانا اس موقع پر ممکن نہیں ہے۔ یہ بات پوری تعمیم سے کہی جا سکتی ہے کہ مغلوں نے اس ملک کے تمدن سے خود کو وابستہ کرنے کی کوشش کی جہاں تک ممکن ہوا انھوں نے یہاں کے عوام کے مذہبی رجحانات اور رسوم میں دخل اندازی سے گریز کیا اور ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشترک ایک حکمراں جماعت کے قیام کو مستقل طور پر ترقی دیتے چلے گئے۔ اورنگ زیب کے دوران حکومت اس عمل کو کچھ صدمہ ضرور پہنچا پھر بھی پوری سترہویں صدی میں اس پالیسی کو عام طور پر اختیار کیا جاتا رہا۔ مغلوں نے کاشتکاری تجارت اور پیداوار کو متعدد اور مختلف طریقوں سے طریقہ دینے اور ان کا تحفظ کرنے کی کوشش کی۔ اقتصادی ترقی کے زیر اثر تجارتی شہر معرض وجود میں آتے گئے۔ چنانچہ آگرہ، دہلی، لاہور اور احمد آباد اس حد تک ترقی کر گئے تھے، جہاں تک اس وقت کی دنیا کے بڑے سے بڑے شہر ترقی کر چکے تھے[1] لیکن یہ تبدیلیاں دیہی اقتصاد کے بنیادی کردار پر بہت زیادہ اثر انداز نہ ہو سکیں اور دیہی اقتصادی خود کفیل کاشتکاری پر قائم رہا سوائے اس کے کہ کسی کسی علاقے میں کچھ استثنے ضرور موجود ہے اس لیے کاشتکار نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ ایک لمبی چوڑی مرکزی حکومت میں اس کا بھی کوئی اہم مقام تھا اور بدامنی اور طوائف الملوکی کے زمانے میں وہ کسی بھی اس طاقت کی طرف جھک جاتا تھا جو بھی اس کو سہارا

---

[1] ملاحظہ ہو تصنیف "جہانگیر کا ہندوستان" از پال زرٹ صفحہ 7 و 16 اور "سفر نامہ" از تھیونوٹ صفحات 44-46 وغیرہ
Jahangir's India by Palseart
Travels by Thavenot

دے سکتی تھی۔ کاشتکاروں کے علاوہ کافی تعداد اور گہری جڑوں والی زمینداروں کی جماعت تھی جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور جو کسی بھی مضبوط اور مرکزی حکومت کو استحکام دینے کے حق میں نہ تھے۔ اس کے برعکس وہ جماعتیں تعداد میں بھی قلیل اور طاقت میں بھی نسبتاً کمزور تھیں جو استحکام اور اتحاد میں دلچسپی رکھتی تھی تجار اور سوداگر جنھیں سب سے زیادہ استحکام اور پُرامن حالات کی ضرورت تھی، وہ خود جاگیردار طبقہ پر اس قدر منحصر تھے کہ وہ آزادانہ طور پر کوئی کردار ادا کرنے کی جسارت نہ رکھتے تھے۔ اس سے امراء کا کردار نہایت ہی اہم ہوگیا تھا۔ جب تک امراء حکمراں کے ساتھ امن واستحکام برقرار رکھنے میں مددگار رہتے اور حکومت کو تجارت، صنعت وحرفت اور کاشتکاری کے فروغ دینے کے نظریئے سے چلاتے رہتے تھے تب تک انھیں کاشت کاروں اور تاجروں کی حمایت حاصل رہتی تھی۔ ان عظیم جماعتوں کی حمایت علیحدگی پسند اور بغاوت آمادہ زمینداروں، راجاؤں اور دوسرے قسم کے سرگروہوں کو قابو میں رکھنے میں بہت کام آتی تھی۔ لیکن جب امراء اور حکمرانوں کے درمیان آپسی اعتماد اور مفاہمت ختم ہو جاتی تھی اور امراء حکومت کی خدمت گذاری کے ذریعہ اپنے مفاصد حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتے تھے تو مغلوں کا تعمیر کیا ہوا زبردست مرکزی امراء (امراء پر منحصر) نظام تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہونے لگتا تھا۔

ہم نے موجودہ تصنیف کے اوراق میں چند ان اسباب کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جنھوں نے مغل امراء کی جماعت کو اتحاد واستحکام کا وسیلہ بننے کی بجائے عدم استحکام اور حکومت کی شکست وریخت کا ذریعہ بنا دیا۔ حکومت کی اس شکست وریخت میں کہاں تک امراء کا حصہ ہے اور کس حد تک مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں وغیرہ جیسے عناصر اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اس سوال پر رایوں پر اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے شاید کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ امراء کا بھی اس سلسلے میں کچھ کم حصہ نہیں رہا ہے۔ عین اس تاریخ کا تو پتہ لگانا دشوار ہے جب حکومت کی خدمت گذاری میں رہ کر امراء نے اپنے مفاصد کی تکمیل کے امکان کو دشوار سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ ہم نے ضرور دیکھ ہی لیا ہے کہ جاگیرداری نظام کا بحران سترہویں صدی کے وسط سے ہی ظاہر ہونے لگا تھا

اور اورنگ زیب کی حکمرانی کے طویل عہد میں یہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یہ بحران اپنے نقطۂ عروج کو چھو چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں یا مکمل تباہی یا کسی نئے طرز کے نظام کا امکان صاف نظر آرہا تھا۔ لیکن دوبارہ منظم ہو جانے کے امکان سے آخری زوال صرف کچھ عرصہ کے لیے ٹل ہی سکتا تھا تاوقتیکہ ہم عصر ہندوستانی سماج کے اقتصادی اور صنعتی ٹھہراؤ پر قابو پا لینے کے ذرائع وضع کر لیے گئے ہوتے۔

چنانچہ مغل شہنشاہیت کے زوال کے اسباب کو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے اقتصاد میں پوشیدہ پایا جا سکتا ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت کا ٹھہراؤ اور اس اقتصاد کے حدود امکان میں سائنسی ترقی کی زوال پذیری وہ بڑھتا ہوا مالی بحران جس نے جاگیرداری کے نظام کے بحران کی شکل اختیار کر لی اور حکومت کے افعال و اعمال کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ ان حالات میں حکومت کی خدمت گزاری کے ذریعہ امرا کا اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہو جانا اور اس کے نتیجہ میں گروہوں کی کش مکش اور سرکردہ اور حریص امرا کا آزاد علاقوں کی تخلیق کے درپے ہو جانا مغل شہنشاہوں کا مرہٹوں کے مسائل سے خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ ہونے میں ناکام ہو جانا اور ان کے مطالبات کو مغل شہنشاہیت کی حدود میں رہتے ہوئے پورا نہ کر سکنا اور اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں ایک مشترک حکمراں جماعت کی تخلیق کرنے کی کوشش کا پسپا ہو جانا اور ان تمام حالات کا درباری سیاسیات اور ملک کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونا اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں شمالی مغربی دروں کے تحفظ کا کمزور ہو جانا۔ یہ وہ عوامل اور عناصر ہیں جو مغل حکومت کے زوال کا باعث ہوئے۔ انفرادی کمزوریوں اور خامیوں نے بھی اپنے اثرات دکھائے لیکن ان کا مطالعہ بھی لازمی طور پر ان زیادہ عمیق اور غیر انفرادی عوامل کے پس منظر ہی میں کیا جانا چاہیے۔

بیورو کی مطبوعات

اصول تعلیم	خواجہ غلام السیدین
اصول تعلیم اور عمل تعلیم	ڈی۔ ایس۔ گورڈن/خلیل الرحمن حسینی پریمی
تاریخ فلسفۂ اسلام (تیسرا ایڈیشن)	ٹ۔ ج۔ دی بوئر/سید عابد حسین
تاریخ ہندی فلسفہ	ایس۔ این داس گپتا/رائے شو موہن لعل ماتھر
تدریس جغرافیہ	محمد ضیاء الدین علوی
تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر	سلامت اللہ
تعلیم سماج اور کلچر	اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے/اختر انصاری
تعلیم تکمیل نو کے مسائل (دوسرا ایڈیشن)	خواجہ غلام السیدین/ایم۔ ابوبکر
تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورینسن/سلامت اللہ
تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں (دوسرا ایڈیشن)	ایس۔ ایم۔ جعفر/سعید انصاری
تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری	عبد الغنی مدہوش
تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبد اللہ ولی بخش قادری
تعلیم کا عمل	جیروم۔ ایس۔ برونر/معین الدین
جدید ہندوستان میں ذات پات	ایم۔ این سرینواس/شہباز حسین
جدید ابتدائی منطق	ایل۔ سوسن اسٹیبنگ/سلطان علی شیدا
سماج اور تعلیم	محمد عبد القادر عمادی
شریمد بھگوت گیتا (دوسرا ایڈیشن)	مترجم: حسن الدین احمد
فلسفہ کے بنیادی مسائل	اے۔ سی۔ ایونگ/پروین الہ

ملنے کا پتہ

ترقی اردو بیورو، محکمہ تعلیم (حکومت ہند)

ویسٹ بلاک آر کے پورم نئی دہلی-66